بے نام کی عقیدت

طارق اسمٰعیل ساگر

بے نام سی عقیدت

طارق اسمٰعیل ساگر

ساگر پبلشرز

7۔اے لوئر مال، داتا دربار روڈ، لاہور

URDU FICTION
BAYNAAM SI AQEEDAT
TARIQ ISMAIL SAGAR

نام کتاب

مصنف — طارق اسمٰعیل ساگر

ناشر — ساگر پبلشرز۔A-7لوئر مال، داتا دربار روڈ
لاہور۔54000۔فون:۔7230423

اشاعت — جولائی2001ء

قیمت — -/150روپے

اسٹاکسٹ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953
9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350
فیکس:۔042-7238010
14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی۔
فون:۔021-2210212-2212011-2630411
e-mail:- zquran@brain.net.pk
Website:- www.ziaulquran.com
Green Dome International Ltd.
148-164 Gregory Boulevard, Nottingham. NG7 5JE U.K.
Tel:- 0115-911 7222 Fax:- 0115-911 7220

فہرست مضامین

عرض مصنف

بے نام سے عقیدت میری منتشر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ان میں سے بیشتر کہانیاں ماہنامہ حکایت میں شائع ہوئی ہیں اور حکایت کا اپنا ایک مزاج ہے کہ اس میں صرف خالص عوامی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ وہ بھی عجب زمانہ تھا جس کا احوال کسی آنے والے وقت پر اٹھار کھتا ہوں۔

فی الوقت تو یہی عرض گزارنا تھی کہ ممکن ہے کچھ کہانیوں میں جو خصوصاً حکایت میں شائع ہوئیں آپ کو ادب عالیہ دکھائی نہ دے لیکن زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچائیاں، کمینگیاں، بے ایمانیاں، منافقتیں ضرور نظر آئیں گی۔ میں نے ایک عرصے بعد ان کہانیوں کا زبان و بیان بدلنا مناسب نہیں جانا۔اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ میں نے ابھی تک خود کو جغادری ادیب نہیں سمجھا اور کوشش کی کہ میں وہی دکھائی دوں جو میں ہوں۔

یوں بھی مجھے اپنی "عام زندگی" سے بھی اتنی محبت ہے جتنی اپنی "خاص زندگی" سے۔ میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ اپنا نام "حکومتی ادیبوں" میں شامل کرواؤں۔

میں تقاریب کا آدمی نہیں۔

لیکن---

میں خدا کی بے پایاں رحمت کے بھروسے پر نہایت عجز سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے محبت کرنے والے قارئین کی ایک فوج میسر ہے۔

"میرا حلقہ انتخاب" یہی ہے۔ میں اپنے ان ہی پیاروں کے لئے لکھتا ہوں اور سوچ کر نہیں لکھتا، محسوس کر کے لکھتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ ایمانداری سے اپنے تجربات آپ تک منتقل کر دوں۔اپنے مشاہدات میں آپ کو شریک کروں

کہ آپ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں جس کا میں ہوں۔ میرا تعلق اس کلاس سے ہے جس سے اس ملک کے کروڑوں عوام کا ہے۔ اس لئے آپ کے دکھ میرے ہیں۔ آپ کے سکھ میرے ہیں۔

آج کے انسان کا بڑا المیہ یہی ہے کہ اسے جینے کے لئے بہت خوبصورت زندگی میسر نہیں آئی۔

خدا کی ودیعت کردہ اس خوبصورت دنیا کو ہم نے اپنی منافقوں سے بہت مکروہ بنا دیا ہے۔

میرا ایمان ہے کہ زندگی میں جتنے دکھ بھی ہیں وہ سب انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔

ہم اپنی روایات، اپنی معاشرت سے، حتیٰ کہ اپنے آپ سے کٹ کر جینا چاہتے ہیں۔

بھلا کبھی درخت اپنی جڑوں سے کٹ کر جی سکا ہے؟

یہ قانون فطرت نہیں۔

قدرت کا اپنا ایک نظام ہے اور انسان کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اس نظام کے لئے چیلنج بننا چاہتا ہے۔

یہ "اپروچ" بڑی بھیانک ہے۔ جو انسان کو سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں دے گی۔

"بے نام سی عقیدت" میں آپ کو انسان کے مختلف روپ نظر آئیں گے۔ ان کہانیوں کے کردار ہمارے درمیان ہی سانس لیتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے مجھے یہ کہنے کا حق دیجئے کہ یہ دراصل ہماری اپنی کہانیاں ہیں۔

اچھی یا بری!

اس کا فیصلہ تو بہرحال آپ ہی کو کرنا ہے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

لاہور

جیت

گرداسپور جیل پر موت کا سناٹا طاری تھا سوائے گشت کرنے والے نمبرداروں کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ تمام بیرکوں میں قیدی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے صرف "پھانسی کوٹھیاں" ہی ایسی جگہ تھی جہاں ایک سزائے موت کا منتظر قیدی اپنی کوٹھری کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے چند روز پہلے ہی سیشن کورٹ سے سزائے موت کا حکم جاری ہوا تھا اور اب ہائی کورٹ میں اپیل زیر سماعت تھی۔ یہ آتما سنگھ تھا -- جالندھر کا مشہور ڈاکو جس نے پچھلے دو سال سے پولیس کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

آج ہی اسے دربارا سنگھ کا پیغام ملا تھا کہ اگلے دو چار روز ہی میں کام ہو جائے گا اس عرصے میں اسے سکون کا مظاہرہ کرنا تھا۔ دربارا سنگھ اور فضل خاں بھیس بدل کر اور دوسرے ناموں سے اس سے ملاقات کرنے آئے تھے تو اس نے ان سے ایک ہی بات کہی تھی۔

"سجنو! اگر میں گرمیت کور کا بدلہ نہ لے سکا تو جیتے جی مر جاؤں گا۔ ایک مرتبہ میں

اس براہمن کے بچے سے نمٹ لوں اس کے بعد بھلے مجھے پھانسی ہو جائے۔ میں کم از کم اپنے دل میں کوئی حسرت لے کر مرنا نہیں چاہتا۔"

ان تینوں نے اس روز منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اب مناسب موقع کا انتظار تھا دربارا سنگھ چونکہ خود بھی مفرور تھا اس لئے کھل کر کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے اسے آتما سنگھ اور فضل خاں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ فضل خاں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دربارا پولیس کی نظروں میں آ جائے۔

آتما سنگھ کا تعلق سکھوں کی ایک پسماندہ قوم "مذہبی سنگھ" سے تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد اس کا عیسائی باپ "خالصہ پنتھ" میں شامل ہو گیا تھا کیونکہ عیسائی بن کر زندگی گزارنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ ابھی بٹوارا ہوئے تین چار سال ہی گزرے تھے جب سرپنچ گریوال نے اس کی آدھی زمین زبردستی ہتھیالی۔

"تمہاری دو بیٹیاں اور ایک لڑکا پاکستان میں رہتے ہیں۔ تم خود ریٹائرڈ فوجی ہو اور پاکستان کیلئے جاسوسی کرتے ہو۔ اگر زیادہ چوں چراں کی تو یاد رکھنا"...... گریوال نے اس کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

65ء کی لڑائی لگی تو سب سے پہلے انڈین انٹیلی جنس نے آتما سنگھ کے باپ کو "نظر بند" کر دیا۔ اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس کے تین بچے ابھی تک عیسائی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پاکستان میں رہتے تھے۔ اور یہ ناقابل معافی گناہ تھا۔

"ان دنوں آتما سنگھ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، بس باپ کی ضد تھی جو اسے "پاٹھ شالا" میں لئے جا رہی تھی۔ ورنہ تو مذہبی سکھوں کے بچے سوائے سرداروں کی خدمت کرنے کے اور کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے۔ سرپنچ گریوال کو رہ رہ کر یہ بات کھاتی تھی۔ کہ ایک کمی کمین کا لڑکا تعلیم کیوں حاصل کر رہا ہے۔

"تم لوگ آستین کا سانپ پال رہے ہو۔ ایک تو حکومت نے ہریجن کہہ کر سر

چڑھا رکھا ہے اور اب شیڈول کاسٹ کے لئے نئی نئی آسامیاں بھی نکالی جا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے پرکھوں کی آن کیا مر گئی ہے؟ ایک چوڑے کا لونڈا جب کل کو لکھ پڑھ کر افسر بن گیا تو سارے گاؤں کا کیا حال کرے گا۔ کبھی سوچا ہے تم لوگوں نے؟" وہ اکثر پنچایت میں ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔

65ء کی جنگ ختم ہو گئی اور تین مہینے تک نظر بند رہنے کے بعد بالآخر آتما سنگھ کا باپ بھی رہا ہو کر آ گیا۔ سرپنچ گریوال نے نجانے کیا چکر چلایا کہ دوسرے روز ہی آتما سنگھ کو "پاٹھ شالا" سے چھٹی مل گئی۔

"یہاں سب اونچی جاتی کے بچے پڑھتے ہیں۔ ہم نے اپنا ماحول خراب نہیں کرنا۔ ہم سرپنچ سے دشمنی مول لے کر یہاں پاٹھ شالا چلانے سے تو رہے۔ تم تو جانتے ہی ہو یہ پاٹھ شالا حکومت کی گرانٹ پر چل رہا ہے اور سرپنچ کو ناراض کر کے ہم اپنی گرانٹ بند کروانے سے تو رہے۔" شام کماری نے جو پاٹھ شالا کی ہیڈ مسٹریس تھی اس کے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا-- جب اس طرح اچانک اس کے بیٹے کو سکول نکالا بھی مل گیا تو وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔ یہ روگ اس کی بیوی کو کھا گیا اور جس روز آتما سنگھ کی ماں مری اس روز پہلی مرتبہ اس نے بغاوت کی۔

"باپو! ماتا کی ارتھی جلانا نہیں۔ اس نے ہماری طرح اپنا مذہب نہیں بدلا تھا۔ وہ آخر تک عیسائی رہی اس نے کبھی گوردوارے کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ باپو! وہ ہماری طرح بزدل نہیں تھی۔"

"میرے بچے خداوند تمہیں کبھی میرے جیسا مجبور نہ کرے۔ کاش میں تمہارے بھائی بہنوں کا کہا مان کر پاکستان چلا جاتا کاش! اب تو بیٹا ہمارے لئے رسوائی ہی رسوائی ہے۔ تم کسی قابل ہو جاؤ تو ہم کہیں دور دراز چلے جائیں اور ان ظالموں سے ہماری جان چھوٹ جائے۔" اس نے بچوں کی طرح سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"باپو خداوند یسوع مسیح کی قسم میں ان سب سے گن گن کر بدلے لوں گا۔ میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔" اس نے صرف اتنی بات کہی اور واپس گاؤں چلا آیا۔

آتما سنگھ کے باپ کو اس کے دوسرے ساتھی بمشکل سہارا دے کر اس کے گھر تک لائے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا تھا وہ "وکٹوریہ کراس" یافتہ فوجی تھا۔ اور برما کے محاذ پر اس نے بڑے بڑے زبردست معرکے لڑے تھے۔ لیکن زندگی کی جنگ وہ بڑی آسانی سے ہار گیا۔

"مکھے! میری امانت تیرے حوالے تو ہی میرا واحد یار ہے اس ملک میں۔" اس نے ایک روز مکھا سانسی سے التجا کی جو اس کی خبر گیری کو آیا تھا۔ آتما سنگھ کھیتوں میں کام کرنے گیا ہوا تھا۔ وہ اب سولہ سال کا گھبرو بن چکا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑے بڑے جٹ سرداروں کے لڑکے بھی جل بھن کر رہ جاتے تھے۔ قدرت نے حسن اور جوانی تو گویا اس "چوڑے" پر لٹا دی تھی۔

پھر ایک روز آتما سنگھ بھاگا بھاگا مکھا سانسی کے پاس گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ ہزاروں میل کی مسافت پیدل طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔

"چاچا! باپو مر گیا--" اس نے بمشکل اتنا کہا اور مکھے سانسی کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

"ہوش کر پترا کوئی بات نہیں۔ ابھی تیرا باپو زندہ ہے، مجھے تو انتظار ہی اس وقت کا تھا" -اس نے آتما سنگھ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

مکھے سانسی کے متعلق کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی، وہ سمگلنگ کا بادشاہ تھا۔ اب اس نے خود تو سرحد پار کرنا چھوڑ دی تھی اور صرف "تھامو" بن کر رہ گیا تھا لیکن اس کے بیٹوں نے باپ کی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ اس کے چاروں بیٹے باری باری "پلس مقابلہ" میں جیل یاترا کر چکے تھے اور اکثر ضمانت پر ہی رہتے تھے۔ ان کا مال درجنوں بار "ڈھے"

چکا تھا۔ اور دو تین مرتبہ پاکستانی سمگلر بھی اس کے اڈے سے گرفتار ہو چکے تھے۔

اس کے باوجود انڈین پولیس اس کو سنبھل کر ہی ہاتھ ڈالا کرتی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ آتما سنگھ کے باپ کو کہا تھا کہ وہ پیچھے ہٹ جائے اور اسے خود گریوال سے نمٹنے دے لیکن آتما سنگھ کے باپ نے ہر دفعہ اسے سختی سے منع کر دیا۔ اسے علم تھا کہ ایک مرتبہ اگر سانسیوں نے گریوال پر ہاتھ اٹھا لیا وہ اسے آفیشل سیکرٹ ایکٹ کے تحت جاسوسی کے جرم میں ساری عمر کے لئے انٹروگیشن سنٹروں میں سڑنے کے لئے پھکوا دے گا۔

"مکھا سانسی" نے بڑے اطمینان سے اپنے یار کو شمشان گھاٹ تک پہنچایا اور اس کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس نے بہیترا زور لگایا کہ آتما سنگھ اس کے ساتھ ہی چلا آئے لیکن آتما سنگھ نے انکار کر دیا اس نے اپنی زمین کاشت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تیرے باپ کی اور بات تھی پترا تو اپنے چاچا کا سر نیچا نہ ہونے دینا۔ خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھنا" -جاتے جاتے مکھا سانسی نے اس سے کہا۔

بمشکل دس دن ہی گزرے تھے کہ سرپنچ گریوال کے لڑکے آ گئے۔ ٹریکٹر پر گریوال کا بڑا لڑکا اندر جیت اور نتور لال کے دونوں لڑکے اپنے دو تین مزارعوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"اوئے چوڑے کی اولاد تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ بھاگ جا تو بھی پاکستان اپنے بہن بھائیوں کے پاس" اندر جیت نے جو شراب کے نشے میں دھت تھا اسے للکارا اور ہاتھ میں پکڑی ہاکی لے کر اس پر پل پڑا۔ دو تین ضربیں تو آتما سنگھ نے برداشت کر لیں پھر دوسرے ہی لمحے ہاکی اس کے ہاتھ میں تھی اور گریوال کا لڑکا زمین چاٹ رہا تھا۔ پانسہ بدلتا دیکھ کر نتور لال کے لونڈوں کی ہنسی کو بھی بریک لگ گئے انہوں نے مزارعوں کو غیرت دلائی اور سارے آتما سنگھ کی طرف بڑھے اس اثناء میں آتما سنگھ نے اندر جیت

کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ نٹور لال کے دونوں لڑکوں نے کرپانیں نکال لی تھیں اور مزارعوں نے برچھے سنبھال رکھے تھے۔ آتما سنگھ نے عقلمندی کی اور بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ لیکن بھاگنے سے پہلے اس نے اتنی تیزی سے اندر جیت کو ضربات لگائی تھیں کہ اس کی ایک بازو کی ہڈی اور دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ سیدھا سانسیوں کے ڈیرے پر گیا تھا۔ اس وقت سورج قریباً ڈھل رہا تھا۔ جلدی جلدی اس نے مکھے سانسی کو تمام واردات بتائی۔

"شاوا پترا۔۔ مجھے امید تھی کہ تیرا خون ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا۔ حوصلہ رکھ کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔" اس نے آتما سنگھ کو اپنے لڑکوں کے حوالے کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد گاؤں کے سرکردہ لوگ پولیس کے ساتھ وہاں موجود تھے۔

"مکھے بات بہت دور تک چلی گئی ہے۔ ملزم میرے حوالے کر دے۔" تھانیدار بلکارا سنگھ نے اس سے کہا۔

مکھے کو علم تھا کہ اس سے "مہینہ" وصول کرنے والا بلکارا سنگھ یونہی اس کے ڈیرے تک نہیں آ گیا۔

"تھانیدار پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں آتما سنگھ آیا ہی نہیں اور اگر آیا بھی ہے تو یہاں نہیں ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا۔ اگر کسی مائی کے لال کی جرأت ہو تو اندر گھس کر بیٹھ کر دیکھ لے۔" مکھا سانسی کے پیچھے اس کے لڑکے قطار میں برچھے تھامے کھڑے تھے اور گریوال کو اس کے منہ لگنا ذرا مشکل ہی دکھائی دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ہمارے آدمیوں نے ڈیرے کی ناکہ بندی کی ہوئی ہے۔ تو بھی نام دار آدمی ہے اس لئے ہم عورتوں کی موجودگی میں تلاش نہیں لے رہے۔ مکھے جو بات گڑ سے ختم ہو جائے اس کے لئے زہر کا استعمال اچھی بات نہیں۔" گریوال نے جاتے جاتے مکھے سانسی کو دبے لفظوں میں دھمکی دی۔ پھر وہ بھی سانسی تھا کہ کسی طرح

وقت ٹالنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی گاؤں والے رخصت ہوئے اس نے دربارے کو بلایا۔

"بچہ! اسے آج رات ہی پار لے جا۔ بہرام خاں سے کہہ دینا ہماری عزت کا سوال ہے۔ یہ میرے جگری یار کا بیٹا ہے اور میں نے اس کو ہر حال میں گریوال اور نٹور لال سے بچانا ہے۔" اس نے دربارے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے چاچا! تو بے فکر رہ۔ میں پہلی گشت کی روانگی سے پہلے ہی نکل جاؤں گا۔"

"چنگا بچہ رب راکھا۔"

کہہ کر مکھا سانسی وہاں سے چل دیا وہ اپنے ڈیرے کے گرد کی گئی گریوال کی ناکہ بندی کا جائزہ لینے جا رہا تھا۔ جلدی ہی واپس لوٹ آیا۔ دربارا سنگھ بیلے کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

اس رات پہلی مرتبہ آتما سنگھ نے سرحد عبور کی اور اس کی ملاقات بہرام خاں کے بیٹے فضل خاں سے ہوئی تھی بہرام خاں خود بڈھا شیر بن چکا تھا اور مکھے سانسی کی طرح اب صرف ڈیرے دار ہی بن کر رہ گیا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب دونوں یار فرنگی پولیس کے لئے دہشت کی علامت بن چکے تھے۔ انہوں نے "ماجھے" اور "بار" کے شاید ہی کسی علاقے میں پولیس کو معافی دی ہو۔ ہندو بنئے تو مکھے اور بہرام کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کا پیغام ملنے پر ہی مال لے کر پہنچ جایا کرتے تھے۔

مکھے سانسی اور بہرام کی یاری اب ان کی اولادوں میں منتقل ہو چکی تھی۔ بہرام خاں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اس روز صبح کو اپنے لڑکے فضل خاں کے ساتھ ایک گھوڑی پر بٹھا کر پیچھے محفوظ علاقے میں بھیج دیا تھا۔ آتما سنگھ نے زندگی کا ہمیشہ ایک ہی روپ دیکھا تھا۔ جبر اور قہر کا روپ۔ فضل خاں کے ساتھ دو دن گزار کر ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ درندوں کے جنگل سے نکل کر انسانوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اسے اب رہ رہ کر طیش آ رہا تھا کہ وہ بزدلوں کی طرح اپنا سب کچھ گریوال کو سونپ کر

کیوں بھاگ آیا ہے وہ دن رات انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

آٹھویں روز دربارا سنگھ دوبارہ اس سے ملنے آیا جس کی زبانی اسے علم ہوا کہ ایس پی کی ذاتی نگرانی میں پولیس نے تین دفعہ ان کے گھر کی تلاشی لی ہے اور اب وہ مکھے کو یرغمال بنا کر لے گئے ہیں۔

"دربارے! بس یار بہت ہو گئی۔ میں تمہارا دینا کبھی نہ دے سکوں گا۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو، میرا اب کون ہے۔ مجھے اپنی ماں باپ اور اپنی زمین کا قرض چکا لینے دو۔"

دربارا سنگھ بڑے سیانے بدمعاش کا بیٹا تھا۔ اس نے تربیت مکھے سانسی سے حاصل کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جذبات میں کی جانے والی حرکت کا نتیجہ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بدمعاش کا بدمعاش بیٹا تھا۔ وہ لفظوں کے تول سے آدمی کی کیمیت جان لیتا تھا۔ اسے پہلے ہی روز سے آتما سنگھ سے ایک خاص خوشبو آیا کرتی تھی اور اسے تلاش بھی ایسے سنگ کی تھی۔ فضل خاں اور دربارا سنگھ اس رات کافی دیر تک جاگتے رہے پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ سو گئے۔ اس رات دربارا سنگھ واپس اپنے گاؤں آ گیا۔

اگلے روز اینٹی سمگلنگ سٹاف کو اطلاع ملی کہ مکھے سانسی کے ڈیرے پر "مال" آیا ہوا ہے۔ ایک سپیشل مجسٹریٹ کی نگرانی میں پولیس نے چھاپہ مارا اور مکھا سانسی کے ڈیرے سے آدھ کلو افیون برآمد کر کے اس کے چاروں لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔ اسی روز مقامی پولیس نے ان کا ریمانڈ حاصل کر کے ایس۔ ایچ۔ او بلکارا سنگھ کو ان کی تفتیش پر مامور کر دیا۔ بلکارا سنگھ بھی یاروں کا یار تھا۔ مکھا سانسی نے کبھی اس کے نذرانے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا تو اس نے حق نمک ادا کرنے میں کبھی بزدلی نہیں دکھائی تھی۔ اگلے ہی روز شام کے وقت اس نے دربارا سنگھ کو اپنے "رسک" پر آزاد کر دیا۔

اپنے منہ سر کو لپیٹ کر وہ تھانے کی عمارت سے باہر آ گیا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی تھی حسب وعدہ فضل خاں اور آتما سنگھ بیلے میں اس کے منتظر تھے۔

سورج ابھی مکمل غروب نہیں ہوا تھا۔ جب وہ گھوڑوں پر سوار آتما سنگھ کے کھیتوں میں پہنچ گئے جہاں گریوال اور نتھو لال کے لڑکے حویلی میں شراب پی رہے تھے۔ سب سے آگے آتما سنگھ اس کے پیچھے دربارا اور فضل خاں تھے۔ انہوں نے مزارعوں کو تو ایک ہی گھرکی پلائی اور وہ سہم کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

تین منٹ کے اندر اندر وہاں تین لاشیں پھڑک گئی تھیں۔ انہوں نے تینوں لاشیں ٹریکٹر پر لادیں اور مزارعے کو حکم دیا کہ وہ ٹریکٹر سیدھا گریوال کے ڈیرے پر لے جائے۔ آتما سنگھ اور اس کے دونوں ساتھی ٹریکٹر کے ساتھ ہی گھوڑیاں بھگاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ گریوال کی حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر آتما سنگھ نے اس مکار کو باہر بلایا۔ اس اثناء میں اس کے دونوں ساتھیوں نے ہوائی فائرنگ کر کے گاؤں میں دہشت پھیلا دی تھی۔

وقت گزر رہا تھا اور پولیس کی آمد کا خطرہ۔ فضل خاں نے للکارا مارا اور ہوائی فائرنگ کر کے انہیں متنبہ کیا۔ تینوں گھوڑیوں نے گاؤں کا چکر کاٹا اور دھواں اڑاتی غائب ہو گئیں۔ جس وقت گاؤں والے پرچہ کروانے تھانے میں پہنچے تو دربارا سنگھ پولیس کی حراست میں پہلے سے موجود تھا۔ فضل خاں اور آتما سنگھ سرحد پار کر چکے تھے۔

تھانیدار بلکارا سنگھ نے ایف آئی آر میں دربارا سنگھ کا نام درج کرنے سے انکار کر دیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔" تھانیدار بلکارا سنگھ نے معززین سے کہا۔

اس اثناء میں نتھو لال کے آدمی بھاگے اور شہر سے ایس پی صاحب کو لے آئے۔ ایس پی دوبے نے بہ نفس نفیس روزنامچہ دیکھا۔ مکھا سانسی اور اس کے بیٹوں کی گرفتاری کی تصدیق کی۔ وہ بڑا گھاگ پولیس افسر تھا تمام بات اس کی سمجھ میں آ گئی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

"مہاراج! ماتا کی قسم لے لیں۔ پرماتما کی قسم لے لیں۔ مہاراج ہم نے خود اپنی

آنکھوں سے دربارے کو دیکھا تھا۔ گاؤں والوں نے قسمیں کھا کھا کر گواہیاں دیں۔ ایس پی دوبے نٹور لال کا ذاتی دوست تھا اور اکثر اس کا مہمان رہا کرتا تھا لیکن آج وہ مجبور تھا۔

"شاجی! مجھے علم ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون مجھے بلکارا سنگھ یا دربارے کے خلاف کاروائی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ مکھے سانسی نے بہت گہری چال چلی ہے وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ میرے پتا جی انسپکٹر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ انہوں نے تیس سال اس علاقے میں نوکری کی ہے۔ لیکن مکھے سانسی جیسا مکار بدمعاش انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔ شاجی! وقت کا انتظار کیجئے۔" اس نے غم و غصہ سے نڈھال نٹور لال کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔

نٹور لال تو جیسے تیسے یہاں تک آ ہی گیا تھا۔ گریوال تو اس قابل ہی نہیں تھا دو جوان بیٹوں کی موت نے اس کی کمر توڑ ڈالی۔ صدمے اور غصے نے اسے نیم پاگل کر دیا تھا۔ آتما سنگھ نے پچھلے پچیس سال کا بدلہ صرف پانچ منٹ میں اتار دیا تھا۔

بالآخر سارے گاؤں کے جٹ منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ پولیس نے آتما سنگھ اور اس کے دو گمنام ساتھیوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا تھا۔ لیکن دربارا سنگھ کا نام اس مقدمے میں نہیں آیا تھا۔ اس روز رات ڈھلنے سے پہلے ہی فضل خاں اور آتما سنگھ پاکستانی علاقے میں واپس آ چکے تھے اور اب وہ مکمل محفوظ تھے۔ آتما سنگھ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے یہ کارنامہ انجام دے کر اپنے سر سے بوجھ اتار دیا ہو۔ اس کو اپنا وجود کافی ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس روز تک وہ فضل خاں کا مہمان رہا، اس اثناء میں اس نے سمگلنگ کے تمام اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ فضل خاں نے اس کو سرحدی محافظوں کی تمام کمزوریوں اور غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کے تمام طریقے بتا دیئے تھے۔

پھر آتما سنگھ نے ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ اس مرتبہ جب وہ انڈیا واپس گیا تو اپنے ساتھ افیون لے کر گیا تھا۔ مکھے سانسی اور اس کے بیٹوں کی اگلے ہی ہفتے ضمانت ہو گئی۔ اس سے دو تین روز بعد ہی ایس ایچ او بلکارا سنگھ کا تبادلہ ہو گیا۔ اب وہاں نٹور لال اور گریوال کا بالکل خاص آدمی تھانیدار کیدار ناتھ آ چکا تھا جس نے یہ "سونے کی کان" سنبھالنے سے پہلے نٹور لال اور گریوال کو "وچن" دیا تھا کہ وہ آتما سنگھ، دربارا سنگھ اور فضل خاں کو ہر حال موت کے گھاٹ اتار دے گا خواہ اس کے لئے اسے ملازمت سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔ آتما سنگھ کی غیر موجودگی میں کسی نے اس کے کھیتوں کی طرف منہ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ ایک رزو گاؤں والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ راتوں رات وہاں چھوٹی بمبی نصب ہو چکی تھی اور مکھے سانسی کے لڑکے ٹریکٹر چلا رہے تھے۔ گریوال کے آدمی فوراً تھانے کی طرف بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد تھانیدار کیدار ناتھ وہاں موجود تھا۔

"اوئے چھندے جا بچہ وہ رجسٹری لے آ۔" اس نے بجائے تھانیدار کو جواب دینے کے اپنے لڑکے کو آواز دی۔ اور جب وہ واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں کچھ سرکاری خرید و فروخت کے کاغذات تھے۔ کیدار ناتھ نے بڑی بے صبری کے ساتھ کاغذات کا معائنہ کیا۔ آتما سنگھ نے وقوعہ سے قریباً ایک ہفتہ قبل یہ زمین اس کے ہاتھ فروخت کر کے رقم وصول کر لی تھی۔ تھانیدار کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے حکم پر دو سپاہی بھاگے اور پٹواری کو لے آئے۔ پٹواری کے رجسٹروں نے تمام اندراج کے صحیح ہونے کی تصدیق کر دی اور تھانیدار تلملا کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مکھے کو جان سے مار ڈالے۔

جس وقت کیدار ناتھ واپس جا رہا تھا اس کا اے ایس آئی شرما اور تھانے کا محرر مکھے سانسی کی حویلی میں اس کے بڑے لڑکے دربارے کے ساتھ سانسیوں کے گھر کی نکالی

ہوئی "پہلے توڑ کی شراب" سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
ایس۔ ایچ۔ او کیدار ناتھ واپس تو آ گیا لیکن چین سے وہ بھی نہ بیٹھا۔ اس نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ تھانے کے سارے ملازمین ہی مکھے کے کانے ہیں اور وہ اس کے کام میں ہمیشہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ نہ صرف ایم ایل اے سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی بلکہ عدالت کچہری میں بھی شاید ہی کوئی افسر تھا جس سے اس کی آشنائی نہیں تھی۔ ان حالات میں کوئی بھی قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا جا سکتا تھا۔

سانسیوں کی اپنی کچھ مخصوص روایات ہوتی ہیں سب سے پہلے تو یہ کہ وہ اس وقت اپنے کسی بچے کو اپنا بچہ نہیں مانتے جب تک پولیس کچہری میں اس کا نام نہ گونجنے لگے اور دوسری بات یہ کہ وہ بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ مکھے کا چل چلاؤ ہی تھا۔ لڑکے ایک سے ایک بڑھ کر اتھرے تھے۔ ان کو پولیس کی آنکھ مچولی سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اور کسی کام کے بارے میں سوچ سکیں۔ آتما سنگھ میں مکھے نے وہ بات پائی تھی جو وہ چاہتا تھا آتما سنگھ کے پہلے کارنامے پر ہی اس نے اپنی لڑکی گرمیت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

تین چار ماہ میں فضل خاں نے اسے سارے گر بتا دیئے تھے۔ وہ اب دربارا سنگھ اور فضل خاں کی طرح سرحدی کیڑا بن چکا تھا۔ اس کو بھارتی حکومت مفرور قرار دے چکی تھی اور سرحدی پولیس کو خفیہ احکامات موصول ہو چکے تھے کہ اسے ہر صورت میں زندہ یا مردہ گرفتار کر لیا جائے۔ ایک روز مکھے نے اپنے بیٹے دربارے سے بھی مشورہ کر لیا اور اس کی منظوری ملنے پر اس نے اپنے بڑے بوڑھوں کو اکٹھا کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اپنی روایت کے مطابق تمام سانسیوں نے ایسے "گھبرو جوان" سے بیٹی بیاہنے پر اسے خراج تحسین پیش کیا اور سارے سانسی مل بیٹھ کر صلاح مشورے کرنے لگے کہ اسے کس طرح جالندھر میں آباد کیا جائے۔ بالآخر وہ سب ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔

جالندھر کے ہی گاؤں میں جہاں سانسیوں کی اکثریت آباد تھی۔ آتما سنگھ اور گرمیت کی شادی بڑی دھوم دھام سے سانسیوں کے رسم و رواج کے مطابق انجام پائی۔ فضل خاں نے آتما سنگھ کی طرف سے ایک ہندو دوست کے روپ میں شرکت کی تھی۔ اس کی شادی کی دھوم ارد گرد کے دیہات میں مچ گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ گرداسپور میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

دربارا سنگھ نے اب سارا زور اس بات پر لگا دیا تھا کہ وہ آتما سنگھ کا نام کسی نہ کسی طرح پولیس کی فائلوں سے نکلوا دے کم از کم وہ اسے گریوال والے کیس میں بے گناہ ثابت کروا دے۔ پھر ایک روز مکھا سانسی اور اس کا بیٹا یہ عزم لے کر دہلی روانہ ہو گئے وہ اب اپنے پرانے دوستوں سے حق نمک وصول کرنے جا رہے تھے...... اسے جالندھر میں شادی کرنے کے تین چار ماہ بعد یہ علم ہوا کہ گرداسپور پولیس نے اسے اشتہاری قرار دے رکھا ہے۔ اس نوجوان نے ضمانت قبل از گرفتاری کروا رکھی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ گرداسپور پولیس اسے کسی کے قتل میں خواہ مخواہ پھنسا کر پریشان کرنا چاہتی ہے۔ ایس۔ پی نے نوجوان کو اپنے دفتر میں کرسی پیش کی اور دو تین روز بعد پولیس انکوائری رپورٹ مل گئی کہ نوجوان آتما سنگھ پچھلے ایک سال سے کلکتہ میں قیام پذیر تھا۔ اور وقوعہ کے روز سے تین روز بعد تک سرکاری ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ یہ کارروائی اتنی تیزی کے ساتھ اور ایسے خفیہ طریقے سے عمل میں آئی تھی کہ گرداسپور کی پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی اور ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب آتما سنگھ نے گرداسپور کے تھانیدار بلکارا سنگھ پر استغاثہ کر دیا کہ اس نے گریوال اور نوڑ لال کی ملی بھگت سے اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کیا ہے۔

بلکارا سنگھ اس وقت کسی دوسرے تھانے میں تعینات تھا، لیکن موقع افسر ہونے کی وجہ سے وہ مقامی تھانے کی طرف سے پیش ہوا اور ایسا گول مٹول سا بیان دیا کہ عدالت

کے جج اسے عدالت میں ہی کھری کھری سنادیں اور پولیس کو حکم دیا کہ اس کے خلاف بددیانتی اور ناجائز اختیارات کے ضمن میں باقاعدہ کارروائی کر کے عدالت کو رپورٹ پیش کی جائے۔ عدالت عالیہ نے آتما سنگھ کو باعزت بری کر دیا تھا۔

تھانیدار کیدار ناتھ کو جب تمام واقعات کا علم ہوا تو وہ چکرا کر رہ گیا ایسے مکار بدمعاش سے اس کا پالا کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے ایس۔ پی دوبے اور گریوال کے سامنے حلف اٹھایا کہ وہ مکھے اور آتما سنگھ سے ایسا بدلہ لے گا کہ نہ اس سے پہلے کسی نے لیا ہو نہ اس کے بعد کوئی لے گا۔ اس نے بڑا خطرناک منصوبہ تیار کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ مکھا سانسی لاکھ چالاک ہشیار ہونے کے باوجود اس سے بچ نہیں سکتا۔ اس نے گریوال وغیرہ کی طرف سے ایک رپورٹ آتما سنگھ کے خلاف درج کی تھی کہ اس نے قاتلانہ حملہ کر کے اس کے ملازم کو زخمی کر دیا۔

کیدار ناتھ نے اندر ہی اندر زخمی کی میڈیکل رپورٹ حاصل کر لی اور روزنامچے میں دو تین مرتبہ چھاپے کی کارروائی بھی ڈال دی، جالندھر میں ایس۔ پی دوبے نے اس بات کا بندوبست کر رکھا تھا کہ جالندھر کی پولیس کی طرف سے دوسرے تیسرے روز آتما سنگھ کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارنے کی مہم کاغذی طور پر جاری رہے۔ یہ سب کچھ اتنی ہوشیاری اور خفیہ طریقے سے انجام پا رہا تھا کہ مکھے کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

قریباً تین مہینے کے بعد ایک روز جب آتما سنگھ اپنی بیوی گرمیت کے ساتھ گاؤں آیا ہوا تھا گھر میں آتما سنگھ اس کی بیوی اور مکھے کا ایک لڑکا موجود تھا۔ کیدار ناتھ نے پولیس کے مسلح دستے کے ساتھ آتما سنگھ کی گرفتاری کے لئے چھاپا مارا۔ مخبر کی اطلاع بالکل درست تھی گھر پر واقعی مکھا اور اس کے باقی لڑکے موجود نہیں تھے۔ حویلی کا دروازہ حوالدار جگن ناتھ نے کھٹکھٹایا۔

"کون ہے، کیا بات ہے؟" مکھے کی لڑکی نے ایک سوراخ میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"دروازہ کھولو۔ ہم آتما سنگھ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔" باہر سے کیدار ناتھ بولا۔

گرمیت سانسی کی لڑکی تھی ایسی باتیں اس کے خون میں رچ بس چکی تھیں۔ اس نے پہلی ہی نظر میں حالات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"کھولتی ہوں ایک منٹ" -- اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو آنکھ کے اشارے سے صورت حال سمجھائی۔ پولیس مقابلہ سانسیوں کے لئے معمول کی کارروائی تھی اور عموماً وہ تیاری کی حالت میں رہتے تھے۔ مکھے کے چھوٹے لڑکے نے اپنے بہنوئی کو افراتفری میں حالات سمجھنے سے پہلے ہی دیوار سے پرلی طرف دھکیل دیا اور بہانہ یہ رکھا کہ وہ پولیس کو باتوں میں لگاتے ہیں اس اثناء میں آتما بھاگ کر مکھے اور اس کے لڑکوں کو خبر کر دے گا۔ مکھے کے لڑکے کو علم تھا کہ اگر آتما سنگھ کو ٹھیک بات بتا دی تو وہ جانے سے انکار کر دے گا اور آج کیدار ناتھ کے ہاتھ سے اس کا بچنا ناممکن ہو جاتا --!! جب ایک دو منٹ کی تاخیر ہو گئی تو تھانیدار کیدار ناتھ کا ماتھا ٹھنکا۔

"دروازہ کھولو ورنہ ہم توڑ ڈالیں گے۔" اس نے چلا کر حکم دیا۔ اچانک پولیس کی نظریں دروازے کے اوپر چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں مکھے سانسی کا چھوٹا لڑکا چھندا اسٹین گن تھامے کھڑا تھا۔

"تھانیدار چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ -- یہ سانسیوں کا گھر ہے کسی بنئے کا نہیں۔ یہاں کوئی آتما سنگھ موجود نہیں۔ میں اپنے وکیل کے آنے سے پہلے دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

"میرے پاس مکان کی تلاشی کا وارنٹ ہے" -- دروازہ کھول دو، ورنہ میں فائرنگ کا حکم دیتا ہوں۔ کیدار ناتھ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"وارنٹ بھی میرا وکیل چیک کرے گا-- میں تو ان پڑھ ہوں۔"

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی کہ کیدار ناتھ نے چلا کر پولیس کو فائرنگ کا حکم دیا۔

مکھے کا لڑکا "فتح بلا" کر مقابلے پر ڈٹ گیا، وہ جگہ بدل بدل کر فائرنگ کر رہا تھا، گرمیت اس اثناء میں چھوی تھامے دروازے سے ہٹ کر ایک جگہ ڈٹی کھڑی تھی۔

اچانک ایک چیخ کی آواز نے اس کی جان نکال دی۔ سامنے سیڑھیوں سے خون میں لت پت چھندا لڑکھڑاتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔

"چار اکر جاویدی"--وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

اس اثناء میں پولیس دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔ گرمیت نے انہیں روایتی سانسی جٹیوں کی طرح للکارا اور چھوی لے کر آگے بڑھی اس کی چھوی اور حوالدار جگن ناتھ کی گولیاں اکٹھے ہی ایک دوسرے کے جسم میں داخل ہوئی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی کیدار ناتھ کے ریوالور نے دو تین شعلے اگل کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔ جب آتما سنگھ گاؤں سے سانسیوں کی مدد لے کر پلٹا تو بازی پلٹ چکی تھی۔ اس نے اپنی طرف سے بڑی عجلت دکھائی تھی اور مکھے کو جو کچہری کی تاریخ بھگتنے گیا تھا ایک سانسی لڑکے کے ذریعے پیغام بھجوا دیا تھا جو پیغام سنتے ہی گھوڑی لے کر ہوا ہو گیا۔ باقی سانسی حسب توفیق ہتھیار سنبھالتے ہوئے مکھے کی حویلی کو لپکے جہاں تھانیدار کیدار ناتھ خون کی ہولی کھیل چکا تھا۔ کیدار ناتھ نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس نے روانگی کے وقت ہی ایس۔ پی دوبے سے کمک مانگ لی تھی۔ اب وہ حویلی کو گھیرے میں لئے پولیس کی مدد کا منتظر تھا۔ جب اسے سانسیوں کی "دار" دکھائی پڑی۔

مکھے کا ایک بوڑھا مزارع جس نے چھپ کر یہ خون کی ہولی دیکھی تھی کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا اور سانسیوں کا ٹکراؤ راستے میں ہی ہوا تھا۔

"آتما سیاں تھانیدار نے گرمیت اور چھندے کو مار ڈالا--!!"

سانسیوں کے لئے پولیس مقابلے میں مارے جانا یا پولیس کو مار دینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے لئے مر جانے کا مقام بنتا تھا جب کیدار ناتھ گرمیت کو تھانے لے جاتا یا ان کی بہو بیٹی کی عزت کو کوئی خطرہ ہوتا۔ اس طرح ہندو تھانیدار کے ہاتھوں ان کے دو بچے مارے جائیں یہ ناقابل برداشت تھا۔

ہر دوسرا سانسی مکھا سانسی تھا--!! اس وقت ان کے پاس مکھے کی ایک ہی امانت بچی تھی اور وہ تھی آتما سنگھ۔ وہ اس کے سامنے کم از کم اس سلسلہ میں شرمندہ ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دو گھبرو سانسیوں نے آتما سنگھ کو قابو کر رکھا تھا۔ اپنے بزرگوں کے حکم پر انہوں نے اس کے گرد کچھ ایسا مضبوط گھیرا ڈالا ہوا تھا کہ اس کا بھاگنا ناممکن بنا دیا تھا۔ خود آگے بڑھ کر سانسی "فتح بلاتے" پولیس سے ٹکرا گئے، گرمیت کی موت نے سانسیوں کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی، ان کی عورتیں چھویاں سنبھالے ان کے پیچھے لپکیں اور اب کیدار ناتھ چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکا تھا۔ اس کی گارد کے سپاہی اس کے ساتھ ہی ڈٹے ہوئے تھے۔ جب کہ سانسی اپنا گھیرا اس کے گرد تنگ کرتے جا رہے تھے۔ حوالدار جگن ناتھ زخمی حالت میں بھاگتا ہوا ان کے قابو آ گیا اور چند منٹ کے اندر سانسی عورتوں نے اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔

جب تک مکھا اور اس کے بیٹے واپس آتے ایس پی دوبے پولیس پارٹی کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ پندرہ سانسی مرد اور عورتیں گرفتار تھیں۔ حوالدار جگن ناتھ مارا گیا تھا۔ ان کا ٹاکرا گرفتار شدگان اور پولیس پارٹی کے ساتھ گاؤں سے باہر سڑک پر ہوا تھا۔

مکھے نے بڑی دانشمندی سے کام لیتے اپنے بیٹوں کو دوسرے راستے سے گاؤں بھیج دیا تھا اسے اپنے خون کی گرمی کا احساس تھا اگر دربارا کیدار ناتھ سے ٹکرا جاتا تو کیدار ناتھ کو پورے بھارت کی پولیس بھی اس کے ہاتھوں سے نہ بچا سکتی۔ وہ دانشمند بدمعاش تھا۔ بہادری اور بے وقوفی کا فرق اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ سانسیوں نے

آتما سنگھ کو غائب کر دیا تھا۔ مکھے نے اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے بیٹوں کے سامنے خود کو بے بس محسوس کیا وہ اسی وقت تھانے پر حملہ کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن مکھے اور دوسرے بزرگوں کے زور دینے پر وہ منع ہو گئے۔ سب سے پہلے تو مکھے نے راتوں رات آتما سنگھ کو فضل کے پاس پہنچا دیا۔ سانسیوں نے پولیس کو اپنی لاشیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ راتوں رات لاشیں لے کر چندی گڑھ پہنچ چکے تھے اور چیف منسٹر ہاؤس کے سامنے جلوس کی شکل میں دہائی دے رہے تھے، صورتحال اتنی سنگین ہو چکی تھی کہ آئی۔ جی پنجاب کو سنٹرل گورنمنٹ کے براہ راست حکم پر تھانیدار کیدار ناتھ کو معطل کر کے لائن حاضر کرنا پڑا۔ ایس پی دوبے کا تبادلہ دوسرے ضلع میں ہو گیا اور گرداسپور کا پورا عملہ معطل ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی روز بلکارا سنگھ نے تھانے کا چارج سنبھال لیا۔

اس اثناء میں گریوال اور نتھورلال بھی چپکے نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی روپیہ پانی کی طرح بہا دیا تھا لیکن مقابلہ پوری سانسی قوم سے تھا۔ پولیس اور عوام کی "ہمدردیاں" سانسیوں کو حاصل ہو چکی تھیں۔ کرمیت اور چھندے کے "اتم سنسکار" میں کئی اعلیٰ حکام نے شرکت کی تھی اور سانسیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انکوائری کی رپورٹ موصول ہوتے ہی ملزموں کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔

ابھی اس واردات کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک روز گریوال اور نتھورلال پراسرار موت مارے گئے ان دونوں کی لاشیں سرحد کے قریب ایک گاؤں کے باہر پائی گئیں۔ انہیں ایک زہریلے سانپ نے کاٹا تھا اور افیون کی کافی مقدار ان کے قریب موجود تھی۔ دونوں کے رشتہ دار چیختے چلاتے ہی رہ گئے کہ مارنے سے پہلے انہیں شام کے وقت اغوا کیا گیا تھا۔ لیکن بلکار سنگھ نے ان کی ایک نہ سنی اور ایف آئی آر میں لکھ دیا کہ دونوں کا رابطہ سمگلروں سے تھا وہ سرحد پر مال وصول کر کے واپس آ رہے تھے راستے

میں ایک زہریلے سانپ نے انہیں ڈس لیا اور ان کی موت واقع ہو گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے اس کی بات کی تصدیق کر دی اور مقدمہ داخل دفتر ہو گیا اور اس روز سانسیوں نے ارد گرد کے دیہات میں مفت شراب تقسیم کی تھی۔

پھر ایک روز وہ آیا کہ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں دربارا سنگھ آتما سنگھ اور فضل خاں نے بھری کچہری میں تھانیدار ناتھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس نے جیپ پر ان کی گھوڑیوں کا پیچھا کیا تھا لیکن وہ کچے پکے راستوں سے نجانے کس طرف نکل گئے۔ بھری کچہری میں تھانیدار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ملزموں نے سینکڑوں لوگوں کے سامنے للکار کر کہا تھا کہ انہوں نے اپنی بہن اور بھائی کا بدلہ لے لیا ہے۔ اب ڈرامے کا ایک ہی کردار باقی تھا۔ ایس پی دوبے جس نے اپنی حفاظت کے لئے سپیشل گارڈ مقرر کروا رکھی تھی۔

ایک سال کے عرصے میں ہی جالندھر کے در و دیوار آتما سنگھ کے نام سے گونجنے لگے اس اثناء میں وہ کئی دفعہ پولیس کے ساتھ دوبدو مقابلہ کر کے فرار ہو چکا تھا۔ پولیس نے اس مرتبہ مکھے کی کوئی چال نہیں چلنے دی تھی اور موقع کے ایسے گواہ تیار کئے تھے کہ آتما سنگھ اور دربارے کا بچ نکلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایس پی دوبے نے کیس میں دل و جان سے دلچسپی لی اور مخبر کی اطلاع پر بارڈر سیکورٹی فورس کی مدد سے ایک سرحدی گاؤں پر چھاپہ مارا جہاں فضل خاں، دربارا سنگھ اور آتما سنگھ کی پکی مخبری ہوئی تھی۔ چھاپہ اتنی تنظیم اور تیزی سے مارا گیا کہ وہ لوگ بمشکل جان بچا سکے۔ فضل خاں اور دربارا تو اکٹھے رہے اور فائرنگ کرتے سرحد پار کر گئے۔ لیکن آتما سنگھ ان سے الگ ہو گیا اور بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگ میں گولی لگی وہ زخمی ہو کر گر پڑا اور قابو آ گیا۔ پولیس نے ان کی گھوڑیاں بھی قبضہ کر لی تھیں۔

قسمت اچھی تھی جو وہ بچ گیا اور ہسپتال تک پہنچ گیا جہاں آتما سنگھ کی ٹانگ کے

آپریشن کے بعد گولی نکال دی گئی۔ دو سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ پولیس نے اس پر تیرہ قتل ڈال دیئے۔ مکھے نے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہایا اپنا اثر رسوخ ہر جگہ استعمال کیا لیکن اس مرتبہ پولیس جیت گئی۔ آتما سنگھ کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ اس اثناء میں فضل خاں اور دربارا اس سے بھیس بدل کر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملاقات کرتے رہے۔

آتما سنگھ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا ڈرامے کا ایک کردار ابھی زندہ تھا اور بدلہ لئے بغیر اسے مرنا گوارا نہ تھا۔ دربارا اور فضل خاں ایس پی کی نجانے کب کی چھٹی کروا دیتے لیکن وہ آتما سنگھ کو قسم دے چکے تھے کہ وہ دوبے کو اس کے لئے چھوڑے رکھیں گے --اور آج--!!

وہ گھڑی آرہی تھی جس کا انتظار پچھلے ڈھائی سال سے آتما سنگھ کو تھا۔ اگلے روز اس کی "ملاقات" آئی۔ پھانسی کے مجرم کی ملاقات عموماً کوٹھڑی میں کروائی جاتی ہے لیکن اس کے پچھلے دو ڈھائی سال کی قید نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو اس کی "شرافت" کا یقین دلا دیا تھا اور "ثبوت" تو مکھا سانسی کب کا دیتا آرہا تھا ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے ایک "سجر سوئی" بھینس ڈپٹی کے گھر باندھی تھی۔ ملاقات ڈیوڑھی میں ہوئی اور دربارا سنگھ کے دھوئیں کے بم اور فضل خاں کی پھینکی ہوئی مرچوں نے انہیں اندھا کر دیا۔ باہر کار تیار کھڑی تھی جس نے گھوڑیوں تک کا فاصلہ بڑی عجلت میں منصوبے کے عین مطابق طے کر لیا تھا جب تک پولیس ان کے تعاقب میں روانہ ہوتی وہ محفوظ ہو چکے تھے۔

آج فضل خاں کی ان سے الوداعی ملاقات تھی انہوں نے اپنے جگری یار کو آج خود سے الگ کرنا تھا۔ "فضل خاں-- آج بچنے والی کوئی بات نہیں ہم دیندار ہو کر مرنا نہیں چاہتے۔ یار تیرا دینا واہگورو کے ہاں۔ کہا سنا معاف آخری وقت تیرا دل توڑ رہے ہیں جیوندے رہے تے میلے ہوں سے بجناں! رب راکھا"-- آتما سنگھ نے بمشکل اتنا ہی کہا۔

تینوں کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے پھر تینوں کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہو گئے۔

فضل خاں پار ہی رہ گیا اس کے یار اپنا حساب بے باک کرنے بھارت چلے آئے۔ حملے سے ایک روز قبل رات کے وقت انہوں نے باری باری اپنے سانسی بزرگوں سے معافی مانگی اجازت طلب کی۔ سانسی عورتوں نے اپنی روایت کے مطابق ان کی "آرتی" اتاری۔ دیوی کی نذر بھینٹ کی اور صبح انہیں الوداع کہہ دیا۔

ایس۔پی دوبے اس روز اپنے دفتر سے باہر نکل کر جیپ میں سوار ہو کر کہیں جانے والا تھا۔ آتما سنگھ کو فرار ہوئے ہفتہ عشرہ ہو رہا تھا اور دوبے کا خون روز بروز خشک ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ جیپ کے نزدیک آیا اچانک ایک باڑ کے پیچھے چھپے دربارے نے اسے للکارا۔ اس سے پہلے کہ دوبے اپنا پستول نکالے۔ آتما سنگھ نے للکارا مارا اور کرپان سے اس پر وار کیا۔ دربارے اور آتما سنگھ نے ایس۔پی کے جسم کو لمحوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ پولیس نے بھی اس مرتبہ انہیں گرفتار کرنے کا تکلف نہیں کیا اور دونوں کو بھون کر رکھ دیا۔

گرداسپور کے سنٹرل ہسپتال کا منظر اس روز دیدنی تھا۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا۔ پنجاب کے قریباً تمام اضلاع سے سانسی مرد عورتیں جمع تھیں۔ مکھا سنگھ کو انہوں نے پھولوں سے لاد رکھا تھا۔ لاشیں جیسے ہی باہر آئیں ڈھول کی آواز پر سانسیوں نے رقص شروع کر دیا۔ وہ جنکارے مارتے پیدل ہی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے سارا گرداسپور گھبروں کو دیکھنے کے لئے امڈ آیا تھا۔

پولیس نے سانسیوں کے جلوس کو گھیرے میں لے رکھا تھا اس کے باوجود آتما سنگھ اور دربارا سنگھ کی ارتھیاں پھولوں سے لد گئیں۔ ان کے انتم سنسکار کے وقت سانسی نعرے لگا رہے تھے۔

"براہمنو! ہم جیتے گئے۔"

امرت کور

انسپکٹر دوار کاداس کو سرحدی تھانے ڈیرہ بابانانک کا چارج سنبھالے ابھی دو ہی ماہ گزرے تھے کہ اس کی کمبختی آگئی۔ آج تیسری مرتبہ شیر و پھر پولیس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس سے پہلے والے ایس۔ ایچ۔ او کو بھی جو اس کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا اس جرم کے ہاتھوں معطل ہو کر لائن حاضر ہونا پڑا تھا اور محکمانہ انکوائری علیحدہ ہو رہی تھی-- ہربنس سنگھ نے اسے جاتے وقت کہا تھا۔

"شاجی اگر ہمارا واسطہ اس مسلے شیر و سے نہ ہو تو یہ تھانہ ہمارے لئے سورگ سے کم نہیں، دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی ادھر یا ادھر کا سمگلر قابو آجاتا ہے۔ اور چھ مہینے یہاں گزارنے کا مطلب ہے زندگی بھر کی روٹیاں"--دوار کاداس نے اس کی بات کو یوں جھٹک دیا تھا جیسے منہ پر بیٹھی مکھی کو اڑایا ہو۔

"ہربنس سیہاں میں نے اپنی آدھی سروس فیروز پور کے سرحدی علاقوں میں کی ہے اور ایسے ایسے نامی گرامی سمگلروں کو پکڑا ہے کہ تم سنو تو حیران رہ جاؤ۔ یہ شیر و بے چارہ کس گنتی میں ہے۔ میں دیکھتا ہوں شاہ پور کے جاٹ اس کو کیسے بچاتے ہیں۔"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا لیکن اندر ہی اندر سے اس کا دل کسی انجانے خوف میں جکڑا ہوا تھا۔ ہربنس سنگھ پھلوار کا مانا ہوا پولیس آفیسر تھا اور اس کو سمگلروں سے نمٹنے کی خاصی تربیت دی گئی تھی۔ لیکن اس کو بھی اس شیر و کے بچے نے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے اور اس سے پہلے والا تو کوئی پولیس کا افسر ایک مہینے سے زیادہ یہاں قیام بھی نہیں کر سکا تھا ایک دو مہینے کے بعد یا تو وہ خود چھٹی کی درخواست دے دیتا یا پھر اس کو "نااہل" جان کر تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

شیر و پاکستان کے ایک سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس کے متعلق عجیب و غریب افواہیں انڈیا کے سرحدی علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی اس کو پاکستانی انٹیلی جنس کا آلہ کار بتاتا کوئی اسے سمگلر سمجھتا اور کسی کی نظر میں وہ سرحدی لٹیرا تھا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا علم اس کے مرنے کے بعد بھی نہیں ہو سکا۔ لیکن ایک بات سے تو سبھی اتفاق کرتے تھے کہ اس نے پاکستانی افواج کی بہت خدمات سرانجام دی تھیں اور ستمبر کی جنگ میں تو خاص طور پر اس نے بڑے بڑے مشکل اور ناقابل یقین کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ جیسے جیسے اس کے کارناموں کا علم انڈین انٹیلی جنس کو ہوتا گیا وہ لوگ شدت سے اس کے پیچھے پڑتے گئے اور جنگ ستمبر کے بعد تو انڈین سرحدی علاقوں کی پولیس ایف۔ ایس۔ ایف اور فوج کے علاوہ ہوم گارڈ کو بھی اس کے متعلق خصوصی اطلاعات دی گئی تھیں۔ انڈین انٹیلی جنس کے افسروں کی دلی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ وہ اسے زندہ گرفتار کر لیں تاکہ اس کے ہاتھوں انڈین فوج کو پہنچنے والے نقصان کا غصہ اس پر اتارا جاسکے۔

شیر و چونکہ سمگلر تھا اور اس کے تعلقات بھی انڈین سمگلروں ہی سے زیادہ تھے۔ اس لئے اس کی گرفتاری کے لئے پنجاب بھر کی سی۔ آئی۔ ڈی نے اپنے آدمی سمگلروں کے روپ میں اس کے پیچھے لگا رکھے تھے اور دو تین مرتبہ وہ گھیرے میں بھی آچکا تھا

لیکن ہر مرتبہ وہ انڈین پولیس کو جل دے کر نکل جاتا۔ شیر وزیادہ تر سمگلنگ شاہ پور کے سمگلروں کے ساتھ مل کر کیا کرتا تھا۔ اس لئے حکومت کی کوشش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح شاہ پور کے سکھوں کو اس کی گرفتاری کے لئے استعمال کر سکے خود حکومت کے اپنے آدمی بھی سادہ کپڑوں میں شاہ پور کا طواف دن رات کرتے رہتے تھے۔ لیکن نہ تو شاہ پور کا کوئی سکھ شیر و سے دغا کرنے کے لئے تیار تھا اور نہ ہی پولیس کو اس کا نام و نشان ہی مل پایا تھا۔

شاہ پور سکھوں کا ایک چھوٹا سا سرحدی گاؤں تھا لیکن یہاں کے سکھ خاندان شاید پنجاب بھر کے سرحدی اضلاع کے امیر ترین سکھ تھے۔ کیونکہ شاید ہی اس گاؤں کا کوئی نوجوان ایسا تھا جس نے شیر و کے ساتھ مل کر سمگلنگ نہ کی ہو اور شیر و نے تو دنوں میں ان کی کایا پلٹ دی تھی۔ پھر وہ شیر و کا کے خلاف پولیس کی مدد کرتے بھی کیسے؟ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ شیر و کا ساتھی وریام سنگھ شیر و سے غداری کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وریام سنگھ پہلے ہی تین قتل کرنے کے بعد عدالت سے صاف بری ہو کر گھر آگیا تھا اور علاقے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ سمگلر ہے، پاکستانی سمگلروں کا اس کے گھر آنا جانا ہے لیکن کیا مجال جو کوئی پولیس کو مخبری کرے اس نے پہلا قتل ایک پولیس ٹاؤٹ ہی کا کیا تھا اور اس کا گاؤں بھر کو چیلنج تھا کہ کوئی مائی کا لال اس کے خلاف پولیس کو اطلاع دے کر تو دیکھے۔

انڈین دیہاتوں میں سکھ کاشت کاروں نے بھی اپنے مزارع رکھے ہوتے ہیں جو اکثر عیسائی ہوتے ہیں لیکن سکھ مت قبول کر لینے کے بعد ان کو "مذہبی سنگھ" کہا جاتا ہے۔ ملکھی سنگھ بھی ایک مذہبی سنگھ ہی تھا اور وہ وریام سنگھ کا مزارع تھا۔ ملکھی سنگھ کو اپنے متعلق اکثر غلط فہمی رہا کرتی تھی کہ وریام کی بہن امرت کور کو وہ جب چاہے گا (دوسرے مذہبی سنگھوں کی طرح جو جٹ سکھوں کی بہو، بیٹیوں کے ساتھ ناجائز

تعلقات استوار کر لیتے ہیں) اپنی راہ پر لے آئے گا۔ لیکن کچھ وریام سنگھ کی دہشت اور کچھ امرت کور کا رعب حسن کہ اس کو آج تک امرت کور سے کھل کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ اشاروں کنایوں میں وہ سینکڑوں دفعہ اس کو کہہ چکا تھا کہ وہ وریام کا نہیں بلکہ اس کا غلام ہے۔ امرت کور اس کی باتوں کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی لیکن وہ اس دن کی منتظر تھی جب یہ مذہبی عیسائی اس سے کھل کر کچھ کہے اور وہ اس کا دماغ ٹھیک کر دے۔ دوسری صورت میں سوائے بدنامی کے اور کچھ ہاتھ نہ آتا اول تو وریام سنگھ ہی اس کی بات پر یقین نہ کرتا اور اگر وہ اس کو یقین دلا بھی دیتی تو وریام فوراً ملکھی کو قتل کر دیتا اور ایک مرتبہ پھر جیل چلا جاتا۔ یہی وریام کے دشمن چاہتے تھے کہ وہ جیل جائے تو اس کے بوڑھے باپ، چھوٹے بھائی اور بہن سے اس کا بدلہ لے سکیں۔

ملکھی سنگھ، وریام کے گھرانے کا مزارع ہی نہیں بلکہ اس کا خاص آدمی بھی تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ شیر و سے وریام کے کیسے تعلقات ہیں اور جب کبھی اس نے شیر و سے ملاقات کرنا ہو تو وہ پاکستان چلا جاتا تھا اور جب کبھی شیر و کا دل چاہتا وہ وریام سے ملنے انڈیا آ جاتا تھا۔ دونوں میں "تجارتی تعلقات" کے علاوہ بھی دوستی کا مضبوط رشتہ قائم تھا۔ جب وریام دو سال تک جیل میں رہا تھا تو اس کے گھر کی دیکھ بھال شیر و ہی نے تو کی تھی۔ وہ بابا موہن سنگھ کو مہینے میں ایک دو بار رات کی تاریکی میں آکر مل جاتا اور اس کو وریام کے مقدمے کی پیروی کے لئے اچھی خاصی رقم بھی دے جاتا تھا۔ یہ بات سارا گاؤں جانتا تھا کہ اگر شیرو، وریام کے گھر والوں کی مدد نہ کرتا تو اس کے دشمن اسے پھانسی لگوا دیتے۔ وہ بھی کوئی معمول جاٹ نہیں تھے۔ سکھانوالی کے سرپنچ تھے اور سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک ان کے سامنے وریام کی کیا حیثیت تھی --- لیکن شیر و نے تو نوٹ بوریاں بھر بھر کے دیئے تھے اور بابا موہن سنگھ نے بھی پولیس اور عدالت کا منہ نوٹوں سے اس بری طرح بھرا تھا کہ ان کے منہ سے وریام کے

خلاف کوئی بات نکلنے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بابا موہن سنگھ خود بھی آٹھ مربع زمین کا مالک تھا وہ کوئی معمولی سکھ زمیندار نہیں تھا۔ شاہ پور کا سب سے زیادہ امیر سکھ تھا اس نے پہلی ہی پیشی پر جج کو نئی کار لے کر دی تھی اور جج نے بھی قلم کے وہ کمالات دکھائے تھے کہ فیصلہ سننے والا ہر شخص عش عش کر اٹھا تھا۔ اس نے مال تو خوب کمایا تھا لیکن حق ادا کر دیا اور جب سکھانوالی کے سردار مقدمہ ہائی کورٹ میں لے گئے تو ان کے ہزاروں روپے گھنٹے کے حساب سے فیس لینے والے وکیل گلا پھاڑتے رہ گئے کیونکہ ہائی کورٹ نے وہ رٹ ہی خارج کر دی تھی۔

امرت کور کوئی بچی نہیں تھی۔ اس نے شیرو کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ لمبا قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ اور کھلے کھلے نین نقش والے شیرو نے اس کے دل میں وہ مقام بنا لیا تھا کہ جب بھی وہ آتا امرت کور تڑپ تڑپ کر رہ جاتی اس نے پچھلے دو تین برسوں سے دل ہی دل میں شیرو کی پرستش کی تھی۔ لیکن شیرو کوئی عام سا سکھ نوجوان تو تھا نہیں کہ وہ اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتی۔ اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ یہ روگ جو اس کو اندر ہی اندر سے کاٹ کر کھاتا جا رہا ہے کسی روز اس کو دیمک خوردہ درخت کی طرح زمین بوس کر دے گا۔ لیکن وہ کرتی بھی تو کیا؟--

وہ تو اتنی مجبور تھی کہ اپنی محبت کا اظہار اپنی بچپن کی سہیلی پریتم کور کے آگے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایک مسلمان پاکستانی سمگلر سے اس کی محبت کا راز اگر کسی کے علم میں آ جاتا تو قیامت ہی آ جاتی۔ وہ اندر ہی اندر کٹ کر رہ جاتی، لیکن اب وہ لاوا جو اس کے اندر پچھلے دو تین سالوں سے کھول رہا تھا آتش فشاں کی طرح پھٹ جانا چاہتا تھا۔ آج اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ شیرو کے سامنے حقیقت بیان کر کے ہی رہے گی۔ وہ اسے بتا دے گی کہ اس نے امرت کور کو روگی بنا ڈالا ہے اور وہ گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر آخر کب تک سلگتی رہے؟

ملکھی رات کے وقت حویلی میں جانوروں کو چارہ ڈال رہا تھا جب اس کو کسی کے کودنے کی آواز سنائی دی اس نے گردن موڑ کر دیکھا سامنے شیرو کھڑا تھا۔

"ست سری اکال میاں جی"! اس نے اچانک دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"سنا بھئی ملکھی!"-- شیرو نے حسب عادت اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کا حال پوچھا۔

"مہراں بابے دیاں آپ اندر چلیں میاں جی سردار وریام سنگھ تو ابھی بٹالے سے واپس نہیں پلٹا۔ شاید آخری بس سے آئے گا۔"

شیرو حویلی میں آ گیا۔ گھر پر موہن سنگھ، امرت کور اور دیپو موجود تھے شیرو کے لئے خاص طور پر بنائے گئے کمرے میں جو حفاظتی اقدامات کے تحت مکان کے ایک کونے میں بنایا گیا تھا اس کے لئے بستر لگا دیا گیا۔ کل وریام نے بارڈر لائن پر مال کا تبادلہ کرنے آنا تھا لیکن وہ نہ آ سکا جس پر شیرو پریشان ہو کر آج خود آ گیا تھا اس کو لیٹے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ امرت کور دودھ کا گلاس لئے وہاں آ گئی۔

ملکھی نے کئی مرتبہ اس کو شیرو کے لئے دودھ لے جاتے دیکھا تھا، لیکن آج نجانے وہ کیوں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ شیرو نے حسب سابق آج بھی امرت کور کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا لیکن اس نے شیرو کا ہاتھ تھام کر پرے کر دیا۔ شیرو نے حیرانگی کے ساتھ اسے دیکھا۔ امرت کور نے دودھ کا گلاس میز پر رکھ دیا اور اب وہ نظریں نیچی کئے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے امرتی ناراض ہے مجھ سے؟" شیرو نے حیرانگی سے پوچھا۔

اور اس کے جواب میں امرت کور نے نظریں اٹھا کر اس کو دیکھا تو شیرو اس کی آنکھوں میں پھیلی ویرانیوں کا سامنا نہ کر سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں شیرو کے جسم کے آر پار چلی گئی ہوں۔

"شیرو جی میں نے آج تک صبر کیا ہے، لیکن اب بات میرے بس میں نہیں رہی"--اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک جانے کو تھے اور شیرو بات کا مطلب سمجھ کر کانپ کر رہ گیا۔ "اف میرے خدایا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر بھی اس نے جانے کیوں امرت کور سے پوچھ ہی لیا۔

"امرتی--تم کیا کہہ رہی ہو میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا"--!

"میں آپ سے پریم کرتی ہوں--!امرت کور پھٹ پڑی تھی اس کی خوبصورت آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ آنسوؤں کے تیز دھارے آہن پوش دیواروں کو روند گئے تھے۔ شیرو نے اپنی ساری جوانی پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے گزار دی تھی اس نے درجنوں بار پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔ وہ برستی گولیوں میں سے ایسے نکل جایا کرتا تھا جیسے مکھن میں سے بال، لیکن آج ایک دھان پان سی سکھ جٹی نے اس کو ڈگمگا دیا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے اس کو کھولتی آگ میں پھینک دیا ہو--!امرت کور کے حسن کی قسم کھائی جا سکتی تھی- کسی نوجوان سے اس کا اظہار محبت کائنات کی سب سے بڑی سعادت تھی۔ اگر کسی اور نوجوان سے اس نے یہ بات کہی ہوتی تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھتا۔ ارد گرد کے گاؤں کے کئی جاٹ اس کے ایک اشارے پر اپنی گردن طشتری میں رکھ کر پیش کر سکتے تھے۔ لیکن وہ شیرو تھا۔ شیر محمد جو سب سے پہلے مسلمان تھا اس کے بعد کچھ اور۔ وریام سنگھ نے اس کی یاری کی خاطر اپنے ملک کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ وریام نے گو اس کے لئے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا لیکن اسے اس بات کا علم تھا کہ شیرو سمگلنگ کے پردے میں جاسوسی کر رہا ہے۔ لیکن اس نے ہمیشہ شیرو کی یاری سے غرض رکھی تھی اور اس کو شیرو کی یاری پر فخر تھا-! قدرت نے اسے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

"امرتی بیٹھ جا"- شیرو کو اپنی آواز اپنے لئے بھی اجنبی لگ رہی تھی۔ "امرتی تو

جانتی ہے میں کون ہوں؟ میں وہ ہوں جس کی یاری پر وریام کو فخر ہے۔ میری خاطر ایک غیر مذہب کے انسان کی خاطر وہ اپنے گاؤں سے اپنے سماج سے حتیٰ کہ اپنے قانون سے بھی ٹکرا گیا ہے-- تم نے مجھے کتنی مرتبہ راکھی باندھی ہے امرتی! تمہارے جذبات کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں تم کتنی عظیم لڑکی ہو۔ امرتی ایک بات یاد رکھنا جو بات تم نے زبان سے کہی ہے وہ اگر کبھی میرے دل میں بھی آ گئی تو اسے زبان پر لانے سے پہلے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ تم ہمیشہ میرے لئے وہی رہو گی جو تم وریام سنگھ کے لئے ہو-اور تمہیں اپنے پیار کا رخ بدلنا ہو گا ورنہ دنیا ہمارے منہ پر تھوکے گی اور میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ جاؤں گا۔"

شیرو بولتا جا رہا تھا اور امرت کور کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے جسم کے دھکتے ہوئے الاؤ پر آہستہ آہستہ برف رکھتا جا رہا ہو۔ وہ جھلس تو گئی لیکن شیرو کی عظمت کا یہ روپ آج اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے تو اب رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ آج تک شیرو کو عام انسان ہی کیوں سمجھی رہی ہے اس نے شیرو کی عظمت کا یہ روپ پہلے کیوں نہ دیکھا؟

دروازہ دوبارہ کھلنے کی آواز سن کر ملکھی سنگھ تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ عین اسی لمحے وریام سنگھ بھی اپنی کرپان دوبارہ نیام میں کر لی تھی۔ وہ سرخ رو ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے مسلمانوں کی یاری کے قصے تو سن رکھے تھے لیکن ان کی غیرت اور عظمت کا امتحان آج اس کے سامنے امرت کور نے لیا تھا۔ اس نے یاری کے لئے کتنے عظیم انسان کا انتخاب کیا تھا۔

ملکھی سنگھ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ کبھی ہو نہیں سکتا ایک نہ ایک دن شیرو امرت کور کو اغوا کر کے پاکستان لے جائے گا۔ وہ آخر مسلا ہے--اسے رہ رہ کر خیال آتا تو پھر کیوں نہ شیرو کا پتہ ہی صاف کروا دوں۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا

اور ساری رات منصوبے بناتا رہا۔ بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔

اگلے روز اپنا کام ختم کرتے ہی وہ عجائب سنگھ سے ملا۔۔ عجائب سنگھ سکھانوالی کا سرپنچ تھا اور وریام سنگھ کا دشمن ہونے کے علاوہ اس علاقے کا مشہور پولیس ٹاؤٹ بھی تھا۔ وہ تو کھل کھل گیا۔ اس کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ عجائب سنگھ نے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر ملکھی کو تھما دیئے۔

"ملکھی میں تیری قسمت بدل دوں گا تو ایک مرتبہ مجھے ٹھیک اطلاع تو پہنچا دے۔"

اور تیسرے ہی روز عجائب سنگھ کو ملکھی کا پیغام مل گیا۔

"آج راکھی کا تہوار ہے اور شیرو اپنی بہن امرت کور سے ضرور ملنے آئے گا۔ کام ذرا ہوشیاری سے ہونا چاہئے۔۔!" ملکھی سنگھ انسپکٹر دوارکاداس اور عجائب سنگھ کے سامنے بیٹھا تھا۔ عجائب سنگھ نے انسپکٹر کو گھر ہی بلا لیا تھا اور ملکھی گاؤں والوں کی نظروں سے بچتا بچاتا بڑی مشکل سے وہاں پہنچا تھا۔ اس نے دوارکاداس کو امرت کور اور شیرو کے فرضی معاشقے کی داستان وہ مرچ مصالحہ لگا لگا کر سنائی تھی کہ اس نے شیرو کو قتل کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھ لیا تھا۔ دوارکاداس بڑی بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

اس نے ملکھی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو سرکار سے خصوصی انعام اور اعلیٰ شہری ہونے کی سند دلائے گا اور عجائب سنگھ سے دس ہزار روپے کے نوٹ تھامتے ہوئے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر وریام کو اس چکر میں "صاف" کر دے گا تو پولیس اس کے خلاف پرچہ بھی درج نہیں کرے گی۔"

شیرو ہر مرتبہ یہی سوچ کر بارڈر پار کیا کرتا تھا کہ آگے انڈین پولیس اس کے استقبال کے لئے موجود ہے لیکن اس نے وہ اوقات متعین کر لئے تھے جب بارڈر پار کرنا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا وہ اکثر شام ڈھلتے ہی یا علی الصبح سرحد پار کر جاتا تھا۔ یہ اوقات پہرے کی تبدیلی کے ہوا کرتے تھے اور اس دوران شاید ہی کوئی

سرحد پار کرتا تھا آج بھی وہ دن ڈھلتے ہی سرحد پار کر آیا تھا۔ اور جس وقت دوارکاداس اپنے تھانے کے علاوہ پولیس کی ہنگامی نفری کے ساتھ گاؤں کو گھیرے میں لے رہا تھا تو شیرو وریام کے گھر میں موجود تھا۔ رات بارہ بجے تک جب وہ مایوس ہو کر واپس جانے والے تھے تو اچانک ملکھی اس طرف آتا دکھائی دیا اور عجائب سنگھ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ آج جہاں وہ اپنے پرانے دشمن کو مارنے والا تھا وہاں اس کی خوبصورت بہن کا بھی بلا شرکت غیرے مالک بننے والا تھا۔ اس نے بڑی مکاری سے وریام سنگھ کو مارنے اور امرت کور کو حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔

انسپکٹر دوارکاداس اس کی باچھیں کھل گئیں۔ جب اس کو شیرو کی موجودگی کی اطلاع ملی ورنہ وہ تو ساری زندگی شرمندگی سے اپنے افسروں کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہ جاتا۔ اس نے پولیس کے دستوں کو از سر نو ترتیب دیا اور سب دبے پاؤں گاؤں کی طرف چل دیئے۔ جہاں شیرو آنے والے طوفان سے لاعلم بے فکری سے سو رہا تھا۔! ابھی اس کو لیٹے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا جب اچانک دروازہ کھلا۔ امرت کور اندر آئی تھی۔

"چارہ کرو ویرجی! پلس آ گئی ہے"۔ اس نے شیرو کی طرف سٹین پھینکی۔

بابا موہن سنگھ برچھا اٹھا کر باہر کو لپکا تھا۔ وریام سنگھ نے دروازے پر پوزیشن لے لی تھی۔ دیپو کرپان تھام کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"شیرو ویر قائم ہو جائیں گھوڑی لے کر پچھلی طرف آ رہی ہوں۔" امرتی کی آواز اس کو سنائی دی اور اس کے روکنے سے پہلے ہی وہ پچھلی دیوار پھلانگ کر اپنے ٹیوب ویل کی طرف بھاگ گئی جہاں شیرو کی گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اسے علم تھا کہ اگر شیرو کے قبضے میں ایک مرتبہ گھوڑی آ گئی تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی گرد کو چھو بھی نہیں سکے گی۔ گھوڑی حویلی سے تھوڑے فاصلے پر ٹیوب ویل پر بندھی ہوئی تھی۔ وہ کماد کے اندر

ہی اندر بھاگی چلی جارہی تھی۔

"کی گل اے اوئے جمعدارا-! بابا موہن سنگھ نے دروازے سے باہر نکل کر اپنا برچھا سیدھا کرتے ہوئے انسپکٹر دوار کاداس سے پوچھا۔

"تیرے گھر میں مسلمان جاسوس چھپا ہوا ہے۔ تونے پاکستانی جاسوس کو پناہ دے رکھی ہے۔" دوار کاداس کے جواب دینے سے پہلے عجائب سنگھ بول پڑا اور اس کی شکل دیکھتے ہی موہن سنگھ کا خون کھول اٹھا۔

"تو یہ بات ہے"--اس نے کہا۔ اور اس سے پہلے کہ حوالدار اس کو اپنی گرفت میں لے۔ بابا موہن سنگھ نے جست لگا کر پولیس پر برچھے سے حملہ کر دیا۔ ایک دفعہ تو سارے پولیس والے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن دوسرے ہی منٹ میں دوار کاداس کے ریوالور کی گولی نے اس کے بازو میں سوراخ کر دیا تھا۔ بابا موہن سنگھ تیورا کر گر پڑا اور عجائب سنگھ بھاگ کر حویلی کی طرف بڑھا۔ چوبارے میں بیٹھے شیرو کی سٹین گن نے پہلی ہی باڑھ میں عجائب سنگھ کو ٹھنڈا کر دیا۔ پولیس کے جوان زمین سے چپک گئے انہوں نے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا چاہا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وریام سنگھ نے زور سے "فتح بلائی" اور فائرنگ شروع کر دی۔ دیپو کرپان لے کر باہر کی طرف لپکا--!

اچانک باہر سے کسی سپاہی کی آواز سنائی دی۔

"وہ نکل گیا ادھر بھاگو"۔

امرت کور گھوڑی لے آئی تھی۔ جیسے ہی شیرو چھلانگ لگا کر اس پر بیٹھا پیچھے سے آنے والی گولی امرت کور کو چاٹ گئی۔ شیرو نے پلٹ کر سٹین گن سیدھی کی اور اس سپاہی کو ٹھنڈا کر دیا۔ جس نے امرت پر گولی چلائی تھی۔

"امرتی--امرتی" اس نے امرت کور کو جو گھوڑے سے لگی کھڑی تھی جھنجھوڑ ڈالا۔ پولیس بھاگتی ہوئی اسی طرف آرہی تھی۔ شیرو نے اسے ایک بازو سے پکڑ کر اوپر

کھینچا اور گھوڑی کھیتوں میں گھس گئی۔ اس نے پاگلوں کی طرح امرت کور کو جھنجھوڑا، لیکن گولی تو اس کے عین دل پر لگی تھی۔

"ویر جی--" بمشکل اس کے منہ سے نکلا اور وہ ٹھنڈی ہو گئی۔

شیرو کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے امرتی کے مقدس بدن کو اٹھایا اور حویلی کی دیوار کے قریب ڈال دیا۔

"رب راکھا میری بہن! لیکن قسم ہے پیدا کرنے والے کی تیری موت کا انتقام ضرور لوں گا"--وہ گھوڑی کو بھگاتا ہوا حویلی کے سامنے سے گزرا۔

"وریام سیہاں تجھے واہگورو کی قسم امرتی کا بدلہ میرے لئے چھوڑ دینا"--

دوار کاداس پاگلوں کی طرح سپاہیوں کو گولیاں چلانے کا حکم دے رہا تھا لیکن شیرو نکل گیا--اس نے پولیس کے تمام حربے ناکام بنا دیئے تھے وہ ہر قیمت پر کچھ دنوں تک زندہ رہنا چاہتا تھا کم از کم امرت کور کے انتقام تک--!!

بابا موہن سنگھ کے بازو میں گولی لگی تھی۔ دیپو کو بھی زخم آئے تھے۔ وریام کے کندھے میں گولی لگی تھی۔ پولیس ان کو گرفتار کر کے لے گئی۔ لیکن اگلے روز صبح ہوتے ہی سارا گاؤں ان کے پیچھے آ گیا تھا۔ وہ ضمانت پر رہا ہو کر گاؤں آ گئے۔ بابا موہن سنگھ ہسپتال میں تھا۔

وریام سنگھ نے اپنے ہاتھوں سے امرتی کی چتا پر جلتی ہوئی مشعل پھینکی تھی۔ وہ جوش انتقام سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ملکھی سنگھ کو رات ہی پولیس نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا--!

وریام سنگھ چاہتا تو اسے تھانے میں جا کر گولی مار دیتا۔ لیکن شیرو نے اس سے قسم لے رکھی تھی اور وریام نے نجانے کیوں اس کا انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔

اس بات کو بمشکل ایک ہفتہ گزرا تھا اور ملکھی سنگھ آج ہی گاؤں آیا تھا۔ اس نے

گاؤں چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا تھا اور صبح ہی واپس جانے والا تھا۔ لیکن اس روز سر شام گاؤں کے سینکڑوں باشندے اپنی حیران اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شیرو نے ملکھی کے گلے میں رسہ ڈال رکھا تھا اور وہ اس کو عین اس جگہ لے آیا تھا جہاں امرت کور نے جان دی تھی۔

"شاہ پور کے سردارو! امرتی میری بہن تھی میں مسلمان ہوں اپنی بہن کا انتقام نہ لیا تو میرا جینا کس کام کا --- ایسی زندگی پر ہزار بار لعنت۔" شیرو نے للکار کر کہا۔

شاہ پور کے سردار امرتی کے لئے سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے ہاتھوں ملکھی سنگھ کی تکا بوٹی کر ڈالیں۔ لیکن یہ حق آج انہوں نے ایک مسلمان کو سونپ دیا تھا۔ سکھوں نے نعرہ لگایا اور شیرو نے اس کے جسم سے سٹین گن کی نجانے کتنی گولیاں پار کر دیں - اس کے جسم سے خون فوارے کی طرح ابل رہا تھا۔ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے شیرو نے ملکھی کی لاش کو گھوڑے کی رسی کے ساتھ باندھا اور وہ اس کو گھسیٹتا ہوا سکھانوالی تک لے گیا۔ شاہ پور کے سردار اپنے گھوڑوں پر سوار سکھانوالی کے باہر کتنی دیر تک عجائب سنگھ کے ساتھیوں کو للکارتے رہے لیکن کسی نے باہر آنے کی جرأت نہ کی۔ وریام سنگھ اور دیپو شیرو کے ساتھ آگے آگے جا رہے تھے۔

شیرو واپس پاکستان چلا گیا۔ پھر ایک روز دوار کا داس بھی لائن حاضر ہو گیا۔ شیرو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انڈین بارڈر سیکورٹی فورس کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا ہے۔ لیکن اس کی لاش آج تک نہیں مل سکی --- !

لوگوں کو علم ہے کہ پولیس نے اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ افواہ پھیلائی ہے۔ حقیقت کیا ہے اس کا علم صرف خدا کو ہے --- !!

مہلت

نیاز علی سے زیادہ نیاز مند اور سیدھا سادا بندہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ عمر تو اس کی پچاس سے اوپر رہی ہو گی۔ مگر صحت ایسی کہ جوان دیکھ کر شرماتے تھے۔ اسے اس گاؤں میں آئے پانچ چھ سال ہی گزرے تھے لیکن اپنے اخلاق اور خدا ترس طبیعت کے سبب گاؤں کے بچے بڑے سب ہی نیاز علی کے گرویدہ تھے۔ اپنے گھر ہی کے ایک کونے میں اس نے کریانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ ہفتے میں ایک دن وہ شہر جاتا اور دکان کے لئے سامان لے آتا۔

اس کی ایمان داری تھی یا پھر ملنسار طبیعت کو دیکھتے ہی دیکھتے نزدیک و دور کے دیہاتوں میں اس کی دکان نے خاصی شہرت پالی تھی۔ لوگ قریبی دیہاتوں سے "نیاز دی ہٹی" پر سامان لینے آیا کرتے نیاز نے منافع ہی اتنا کم رکھا تھا کہ کوئی اور اتنے کم منافع پر دکان چلا ہی نہ سکتا۔

شاید اس کا سبب اس کا اکیلا ہونا رہا ہو۔

نیاز کا کوئی خاندان، گھر بار، مائی باپ، بیوی بچے کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کسی نے کبھی

جاننے کی کوشش کی تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ لوگ اس کے متعلق خود ہی اندازہ قائم کر لیتے۔ کوئی کہتا اس کی منگیتر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کی بے وفائی کا اثر نیاز نے اتنی شدت سے قبول کیا کہ دوبارہ کبھی عورت کے نزدیک نہ پھٹکا۔ کوئی اس کی بیوی کے مر جانے کی کہانی سناتا۔ حقیقت کیا تھی؟ اس کا علم نیاز علی کو تھا یا پھر خدا کی ذات کو۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے اس کی ذات میں دل چسپی لینا ہی چھوڑ دی۔ اس مرتبہ جب وہ شہر گیا تو پانچ چھ روز کے بعد واپس لوٹا۔ گاؤں بھر میں پھر چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن نیاز نے اپنے گاہکوں کو بتایا کہ وہ دراصل دمڑی شاہ کے عرس پر چلا گیا تھا۔ اس نے کوئی منت مان رکھی تھی جسے پوری کرنا چاہتا تھا۔

شہر سے واپس لوٹے اسے دوسرا دن تھا۔ جب لوگوں نے پہلی مرتبہ پولیس کا ایک ٹرک اور ایک جیپ اس طرف آتے دیکھی۔ اس سے پہلے گاؤں میں اول تو پولیس آتی ہی نہیں تھی۔ اگر تھانے والوں کو کوئی شخص مطلوب ہوتا تو نمبر دار کو اطلاع بھیج دی جاتی اور پولیس کے دو تین سپاہی اس کے ڈیرے پر آکر متعلقہ شخص کو تھانے لے جاتے۔

اتنی تعداد میں پولیس کو دیکھ کر گاؤں والے دہشت زدہ ہو گئے۔ نمبر دار جو کسی کام سے کچہری جا رہا تھا۔ سہم کر رک گیا۔ جیپ اس کے مکان کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ جب کہ ٹرک سے اترنے والے پولیس کے جوانوں نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

"کیا بات ہے انسپکٹر صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" نمبر دار نے ہمت کر کے انسپکٹر سے دریافت کیا۔

"نبی خان مجھے افسوس ہے کہ آج اس گاؤں کی پرانی ریت ٹوٹ رہی ہے لیکن میں مجبور ہوں ہمیں ایک خطرناک مفرور قاتل کو گرفتار کرنا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"نیاز علی" انسپکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟" نمبر دار کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ہاں!" انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ پولیس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش پر میرا دماغ خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

کسی اور موقعے پر اگر تھانیدار اس لہجے میں بات کرتا تو نبی خان اس کی تسلی کروا کر ہی واپس لوٹاتا وہ کوئی ایسا گرا پڑا نمبر دار نہیں تھا، سوڈیڑھ سو مربع زمین کا مالک تھا اور نمبر داری بھی پشت در پشت ان کے خاندان کو منتقل ہوتی آ رہی تھی۔ لیکن پولیس کی تعداد اور انسپکٹر کو رویئے نے اسے خاموش رہنے ہی کو مصلحت جاننے پر مجبور کر دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ ضرور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" غصے سے کھولتے ہوئے نمبر دار نے انسپکٹر سے کہا۔

دونوں پانچ مسلح سپاہیوں کے ساتھ نیاز علی کو دکان پر پہنچے۔ نیاز علی نے پولیس کو اس طرف آتے دیکھ کر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ سب لوگ دکان کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"اتنا جلوس ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی تھانیدار!" نیاز علی نے کہا۔ "میں آج شام تک خود ہی پیش ہو جاتا۔ کیونکہ میرا کام اب ختم ہو گیا ہے۔ پولیس کبھی میری گرد کو بھی نہ چھو سکتی۔ تم جانتے ہو میں پولیس کے اس جلوس سے ڈرنے والا نہیں لیکن میں اب خون خرابہ نہیں چاہتا۔"

نیاز علی کے سامنے انسپکٹر یوں سر جھکائے کھڑا تھا جیسے وہ خود مجرم تھا۔

"نمبر دار صاحب! اس گاؤں میں پولیس آنے کا مجھے افسوس ہے لیکن سب لوگ جانتے ہیں میں نے یہاں کیسی زندگی گزاری ہے۔ میں اس کھیل کو آج شام کو ختم کر

دیتا۔ لیکن یہ لوگ کارگزاری دکھانے کے شوق میں صبح ہی کو چلے آئے۔ بہر حال مجھے افسوس ہے اور میں آپ سے اور سارے گاؤں سے معافی چاہتا ہوں۔" اس نے نمبردار نبی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نیاز علی تم......" نمبردار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں نمبردار صاحب! یہ میرا آخری بہروپ تھا۔ میرا نام بہاول خان ہے۔ باقی سب کچھ آپ کو پولیس والے بتادیں گے۔"

اتنے میں گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ نیاز علی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میاں جی میرا مکان اور دکان آپ کی ملکیت ہے۔ اگر زندہ رہا تو شاید واپس آجاؤں۔"

"ہم تلاشی لیں گے۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"شوق سے" نیاز علی بولا۔

مولوی صاحب اور نمبردار ایک ٹک اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر کے اشارے پر پولیس کے ایک جوان نے نیاز علی کو ہتھکڑی پہنادی اور باقی لوگ اس کے مکان اور دکان کی تلاشی لینے لگے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ خالی ہاتھ باہر آگئے۔ وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی جو پولیس کے لئے باعث دلچسپی ہوتی۔

گاؤں کے لوگ اب وہاں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ نیاز علی دراصل مفرور بہاول خان ہے۔ وہ لوگ اسے اب بھی بے گناہ اور وہی سیدھا سادا دکاندار ہی جان رہے تھے۔

"بہاول خان میں تمہیں پیر چنن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد نیاز علی پولیس کی معیت میں گاؤں سے چلا گیا۔

میں اس واقعے کے اگلے روز گاؤں پہنچا۔

میں اس گاؤں کا رہنے والا تو نہیں تھا لیکن یہاں ہماری کچھ زمین تھی جس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کبھی کبھی یہاں آجاتا۔ میری نیاز علی سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی اور اس کا سبب وہ لوگ داستانیں تھیں جو وہ مجھے اکثر رات گئے تک سنایا کرتا۔ نیاز علی نے مجھے ہمیشہ بیٹوں کی طرح جانا ایک آدھ مرتبہ وہ ہمارے شہر والے گھر میں بھی آیا تھا۔ میرے والد صاحب جو اکثر بیمار رہتے تھے۔ اس سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ مجھے کئی دفعہ دوبارہ ملاقات کے لئے کہہ چکے تھے۔

گاؤں پہنچ کر جب مجھے علم ہوا کہ نیاز علی تو ایک مفرور قاتل تھا۔ جسے پولیس چنن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ہے تو میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ یہاں کوئی بھی اسے قاتل ماننے کے لئے تیار نہیں تھا اور ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔

میں جب بھی گاؤں آتا دو تین روز گزار کر ہی جایا کرتا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے ایک رات بھی کانٹوں کی سیج پر گزاری۔ اگلے ہی روز میں مولوی صاحب کو مل کر رخصت ہو گیا۔ دم رخصت مولوی صاحب نے پرزور تقاضا کیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس سے ملاقات کر کے اصلیت جاننے کی کوشش کروں۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ سب نیاز علی کے لئے آخری حد تک قانون کی جنگ لڑیں گے۔

مولوی صاحب سے چونکہ اس کی خاصی دوستی تھی۔ اس لئے ان کا یہ اصرار رہا کہ میں پولیس ریمانڈ کے دوران ہی اس سے ملاقات کروں۔

میرے والد ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھے اور مولوی صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنے سابقہ اثر و رسوخ سے کام لے کر میری اور نیاز علی کی ملاقات کا اہتمام کروادیں گے۔ وہ

نہ بھی کہتے تو بھی میں نیاز علی سے ضرور ملتا۔

میں انہیں مطمئن کر کے واپس لوٹ آیا۔ اتنی جلدی گاؤں سے واپس لوٹنے پر والد صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے سبب دریافت کیا تو میں نے انہیں تازہ واقعے سے آگاہ کر دیا۔

والد صاحب نے اپنے ذہن پر زور دے کر بتایا کہ بہاول خان نامی ایک شخص واقعی مفرور رہا ہے۔ اس کا نام انہوں نے کسی تھانے میں سنا تھا۔ لیکن اس کی کوئی تصویر پولیس کے ریکارڈ میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے پہچانتے نہیں ہیں۔

میں نے کہا اول تو وہ کوئی اشتہاری نہیں۔ اگر ہے تو ضرور اس کا کوئی سبب ہو گا۔ جو میں ضرور جان کر رہوں گا۔

والد صاحب نے پولیس والوں کی طرح پہلے تو مجھے ایسے اشتہاری سے دور رہنے کی نصیحت کی لیکن بالآخر میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ دوران ریمانڈ انہوں نے مجھے نیاز علی سے ملنے کی اجازت نہ دی۔ جب اس کا پولیس ریمانڈ ختم ہو گیا اور اسے جیل بھیج دیا گیا تو میں اس سے ملاقات کرنے چلا گیا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ والد صاحب کا کوئی دوست تھا۔ اس نے مجھے خصوصی ملاقات کی اجازت دے دی۔ میں جب جیل کی کوٹھڑی میں اس سے ملنے پہنچا تو اچانک مجھے وہاں دیکھ کر نیاز علی حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم یہاں؟"۔ نیاز علی نے کہا۔ "بیٹا! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا یہ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تم جیسے پڑھے لکھے نوجوان آئیں۔"

"یہ نہ کہو چاچا نیاز علی! تم جہاں بھی ہوتے میں تمہیں وہاں ضرور ملنے آتا۔"

ہم کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ واقعی وہی بہاول خان اشتہاری ہے جس کے کارناموں سے پولیس کے فائل بھرے

پڑے ہیں۔

"ہاں بیٹا! میں ہوں تو وہی بہاول خان لیکن جو کچھ پولیس کی فائلوں میں میرے متعلق لکھا ہے وہ صحیح نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ شاید وہ اپنا کھویا ہوا ماضی تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے اپنی کہانی بھی سنا دی جو میں اسی کی زبانی آپ کو سنا دیتا ہوں۔

میرا نام بہاول خان ہے۔ ایک پسماندہ علاقے سے میرا تعلق ہے۔ میرا باپ اپنے زمانے کا مانا ہوا ڈکیت تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے ہم بھارت کی طرف ایک سرحدی علاقے میں رہتے تھے اور پاکستان کے قیام پر ادھر بھی سرحد پر ہی ایک اور گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ تب میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ لیکن شاید ہوش سنبھالنے پر ہی میرے باپ نے مجھے اپنے فن میں تاک کرنا شروع کر دیا تھا۔

نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ میرا باپ بڑا اصول پرست ڈاکو تھا۔ اس نے انگریزوں کی قید کاٹی تھی۔ مجھے کہنے لگا بیٹا! ادھر لوگ پہلے ہی لٹ لٹا کر آئے ہیں۔ ان بے چاروں کو اور کیا لوٹنا۔ اب ادھر سے ہی مال لایا کریں گے۔ میں یہاں آپ کو بتا دوں کہ میرا باپ جانوروں کی چوری میں استاد مانا جاتا تھا۔ اس نے کبھی معمولی جانور کو ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس زمانے میں سینکڑوں روپے سے کم کی گھوڑی نہیں کھولتا تھا۔ میرے والد کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ کھوجی اس کا "کھرا" نہیں اٹھاتے تھے۔ اول تو وہ اپنا کھرا نہیں چھوڑتا تھا اگر ایسا ہو بھی جاتا تو کوئی کھوجی اپنے گاؤں کی حد سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ عموماً وہ لوگوں کو گمراہ کر کے "کھرا" اٹھاتے ہوئے پکے راستے تک آ جاتے پھر کہہ دیتے کہ اس سے آگے نشان نہیں ملتا۔

ہم نے سرحد پار چوریاں شروع کیں اور جلد ہی میرے باپ کا نام ادھر ادھر دونوں طرف گونجنے لگا۔ ہم باپ بیٹا چاند کی ڈھلتی راتوں میں سرحد عبور کرتے اور جو

کچھ ہاتھ لگتا ادھر لے آتے۔ ان دنوں گائے بھینسوں کی چوری عام تھی۔

پولیس والے متعدد مرتبہ میرے والد کو گرفتار کر کے لے گئے۔ لیکن اس نے جیتے جی کبھی کوئی چوری نہیں دی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری عمر بمشکل پندرہ سولہ برس تھی۔ جب پہلی مرتبہ پولیس نے مجھے گرفتار کیا۔ میرے باپ نے مجھے کہا۔

"بیٹا! تو پہلی تفتیش پر جارہا ہے۔ مرد بن کر حالات کا مقابلہ کرنا۔ پولیس کو بتا دینا کہ تو بہرام خان کا بیٹا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چاچا! میرے جیتے جی تجھے کوئی طعنہ نہیں دے گا۔"

"میرا پندرہ دن کا ریمانڈ تھا۔ پہلا ریمانڈ، پہلی تفتیش۔ تھانے میں داخل ہوتے ہی پولیس والے شکاری کتوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔ لیکن پہلی "چھینٹی" سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کا واسطہ کسی ایرے غیرے سے نہیں بہرام خان کے بیٹے بہاول خان سے ہے۔ انہوں نے مجھے پندرہ دن سولی پر لٹکائے رکھا۔ دن رات میں تین تین چار چار مرتبہ مجھے تفتیش کے لئے لے جایا جاتا۔ کوئی ایسا غیر انسانی حربہ نہیں تھا جو پولیس نے مجھ پر نہ آزمایا ہو۔

جب ریمانڈ ختم ہوا تو تھانیدار نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔ "واقعی تو بہرام خان کا بیٹا ہے!"

پولیس والوں نے ایک ریمانڈ کے خاتمے پر جب مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے دوسرا ریمانڈ مانگا تو مجسٹریٹ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور پولیس کو شرم دلانے کے انداز میں کہا۔ "پندرہ سال کی عمر کے اس بچے سے اگر تم لوگ پندرہ دن میں کچھ برآمد نہیں کر سکے تو پندرہ سال میں بھی کچھ برآمد نہیں کر سکو گے۔"

اس نے میرا مزید ریمانڈ دینے سے انکار کر دیا اور جوڈیشنل ریمانڈ پر مجھے جیل بھیج دیا۔ جیل والوں نے میرا استقبال ایسے کیا جیسے میں کوئی بہت بڑا لیڈر ہوں۔ اس جیل

کے در و دیوار کی میرے باپ سے اچھی خاصی آشنائی تھی۔ عدالت کے باہر میرا باپ میرے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تو نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ساری برادری کو تجھ پر مان ہے۔"

جیل میں پہلے ہی روز اس نے ایک وکیل کے ساتھ میری ملاقات کرائی اور اگلے روز میری ضمانت ہو گئی۔ کیونکہ پولیس مجھ سے کچھ برآمد نہیں کر سکی تھی۔ ایک رات میں نے جیل کے ہسپتال میں بھی گزاری۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

اب میرا نام بھی میرے باپ کے نام کے ساتھ گونجنے لگا تھا۔ ادھر سے زیادہ ہماری شہرت سرحد کے اس طرف تھی۔ بھارت کے سرحدی علاقے میں جہاں ہمارا قیام تھا دیہاتوں کا بچہ بچہ ہمیں جاننے لگا تھا۔

میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھی۔ بس میں تھا یا باپ ہم نے اپنے گاؤں میں اچھی خاصی زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ پیداوار کوئی خاص نہیں ہوتی تھی یعنی نام کی ہی زمین تھی۔ لیکن بظاہر ہمارا یہی ذریعہ آمدن تھا جو سرکار کے کاغذات میں درج تھا۔ زمین ہم بٹائی پر دیئے رکھتے۔ گھر میں دو تین ملازم رکھے ہوئے تھے۔ بس یہی ہماری کل کائنات تھی۔ ایک بات ضرور تھی کہ ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی بیوہ عورت نہیں تھی جس کی میرا باپ مدد نہ کرتا ہو۔ اس نے درجنوں لڑکیوں کی شادیاں اپنے ہاتھوں کی تھیں۔

عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ اس کے اقتدار کا سورج بلند ہو رہا تھا۔ میں اب بیس بائیس سال کا گھبرو جوان تھا اور ہمارے علاقے کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور سرکاری افسران ہماری مٹھی میں تھے۔ الیکشن کے زمانے میں ہمارے گھر پر لمبی لمبی کاریں اور جیپیں آکر کھڑی رہتی تھیں۔ ہمارے نزدیک دیہاتوں میں میرے والد کی مرضی کے بغیر کوئی ووٹ نہیں ڈالتا تھا۔ اس کا سبب اس کا خوف نہیں بلکہ خدا ترسی تھی۔

وقت نے پلٹا کھایا اور میرے باپ کو موجودہ کام پہلے سے بہتر نظر آنے لگا ہم نے اپنے ملک میں چوری کبھی نہیں کی تھی۔ سرحد پار سے مال لایا کرتے تھے۔ بارڈر پر سختی شروع ہو گئی۔ ہمارے تین چار مقابلے دو تین مہینوں میں ہو چکے تھے۔۔ خطرات اب بہت بڑھ گئے تھے۔

شاید قدرت نے والد کو کسی ہندو کی گولی سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا تھا کہ اچانک الیکشن آ گئے۔ یہ الیکشن طویل مارشل لاء کے بعد آئے تھے۔ ہمارے علاقے کی ایک ممتاز شخصیت نے والد سے رابطہ کر کے درخواست کی کہ ہم اس کے لئے کام کریں۔ بطور پیشگی اس نے نوٹوں کا بریف کیس ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں، کے مصداق ہمیں یہ کام زیادہ آسان لگا۔ ایک جیپ مل گئی تھی۔ میں اس جیپ پر اسلحہ بردار محافظوں کے ساتھ نوابوں کی طرح گھومتا اور اپنے امیدوار کے لئے کنویسنگ کرتا رہتا۔ دو تین روز کے وقفے سے نوٹوں کے بنڈل ہمارے پاس پہنچ جاتے۔

چنن شاہ سے میرا تعارف یہیں ہوا۔ وہ ہمارے ممبر کا خاص آدمی اور اپنے علاقے کا مانا ہوا غنڈہ تھا۔ چنن شاہ جس قسم کے جرائم کرتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ وہ دس جماعت پاس تھا اور میں نے خدا جانے پانچویں تک بھی تعلیم کیسے حاصل کر لی تھی۔ چنن شاہ کو خاص طور سے ہمارے ساتھ کر دیا گیا۔ جس امیدوار کے حق میں ہم انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ وہ پہلی بار اسمبلی کا انتخاب لڑ رہا تھا۔ بندہ دولت مند تھا اور جس کے خلاف وہ لڑ رہا تھا وہ اس علاقے کا پرانا ممبر اسمبلی اور مانا ہوا غنڈہ تھا۔

انتخابات ہوئے۔ دونوں طرف سے دھاندلیاں کی گئیں۔ ہمارا پلڑہ بھاری رہا۔ اور ہمارا امیدوار جیت گیا۔ مخالف امیدوار کی یہ پشتنی سیٹ تھی۔ اس کی ہار اس کے لئے ہی نہیں، بلکہ اس سارے علاقے کے لئے چونکا دینے والی تھی۔ ہمارے امیدوار نے جیت کی خوشی میں جلوس نکالا اور مخالف کے گھر کے سامنے فائرنگ کی گئی۔

ہارنے والے امیدوار نے فی الوقت خاموشی کو ہی مصلحت جانا لیکن وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ جس روز ہمارے ممبر اسمبلی نے حلف برداری کی تقریب میں جانا تھا۔ وہی دن مخالف نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے منتخب کر رکھا تھا فاتح ممبر اسمبلی، میرا والد اور دو باڈی گارڈ ایک جیپ میں تھے جبکہ دوسری کار میں اور لوگ بیٹھے تھے۔ جیسے ہی جیپ ان لوگوں کی گھات میں آئی۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ میرا باپ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ اسے ابھی ایک گولی ہی لگی تھی کہ اس نے جیپ سے چھلانگ لگا دی اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ حملہ آوروں کو علم تھا کہ اگر بہرام خان زندہ بچ گیا تو ایک ایک کو چن چن کر مار ڈالے گا۔

مخالف کے للکارنے پر دو مسلح آدمیوں نے میرے والد کا تعاقب کیا اور جائے وقوعہ سے تقریباً ایک فرلانگ دور میرے باپ کو گھیر لیا۔ نہتا اور زخمی ہونے کے باوجود میرے باپ نے بزدلی کی موت مرنے کے بجائے ان میں سے ایک پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی گردن والد کے قابو میں آ گئی، لیکن دوسرے نے میرے باپ کے سر میں یکے بعد دیگرے پستول کی چھ گولیاں اتار کر اپنے ساتھی کو مرنے سے بچا لیا۔

اس حملے میں ممبر اسمبلی سمیت چار آدمی مارے گئے۔ باقی شدید زخمی ہوئے حملہ چونکہ طے شدہ منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا اور مخالف امیدوار دو روز پہلے ہی پولیس کی ملی بھگت سے ایک معمولی کیس میں جیل پہنچ چکا تھا۔ اس کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ تین چار حملہ آوروں نے گرفتاری دے دی اور کیس چلنے لگا۔

میں نے اپنے باپ کی لاش قبر میں اتارتے ہوئے قسم کھائی تھی کہ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ خواہ اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ میرے باپ نے مجھے تربیت دی تھی کہ چور ہمیشہ اکیلا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ میں نے اس کی تربیت کا پہلا اصول چنن شاہ

پر اعتبار کر کے توڑا۔

چنن شاہ میرا دوست بن گیا۔ وہ بھی ہماری دنیا کا باشندہ تھا۔ لیکن کام ذرا الگ قسم کے کرتا تھا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس کا بڑا دھندہ عورتوں کو ورغلا کر اغوا کرنا اور کسی دوسرے علاقے میں لے جا کر فروخت کر دینا تھا۔ لیکن اس نے میری طبیعت کو جانتے ہوئے مجھے کبھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دی اور یہی کہا کہ وہ سمگلنگ ہی کرتا ہے۔

جس شخص نے میرے باپ کو مارا تھا اسے علم تھا کہ اس علاقے میں سوائے میرے کوئی اور اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اس نے یہ جانتے ہوئے میری طرف دو تین مرتبہ صلح کا پیغام بھیجا اور منہ مانگی قیمت بھی اس صلح کی ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن میں نے اسے دھتکار دیا۔ کچھ عرصہ بعد الیکشن ہونے والے تھے اور مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔

چنن شاہ بڑا حرامی انسان تھا۔ وقت آنے پر وہ ہر بہروپ اپنانے کو تیار ہوتا میرے ساتھ وہ صرف اس لئے لگا تھا کہ میرے علاوہ اور کوئی اسے مخالف کے انتقام سے بچا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذریعے میں نے جدید ہتھیار حاصل کئے تھے۔ چنن شاہ کی علاقہ غیر میں واقفیت تھی اور ہمارا پروگرام تھا کہ واردات کے بعد وہیں جا کر پناہ لیں گے۔

ایک روز وہ موقعہ آ ہی گیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ ضمنی انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ الیکشن مہم جاری تھی۔ ہمارا دشمن نزدیکی گاؤں میں جلسہ کر کے رات گئے واپس لوٹ رہا تھا۔ میں اور چنن شاہ اس کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی شکار ہمارے جال میں پھنسا ہم نے اس پر جہنم کا دھانہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ باڈی گارڈز سے بھری ہوئی جیپ موجود تھی۔ یوں بھی کرائے کے گوریلے ایسے موقعے پر کہاں کام آتے ہیں۔ انہوں نے جان بچانے میں ہی عافیت جانی۔ امیدوار اور اس کے دو ساتھی مارے گئے۔ جب ان کی موت کا یقین ہو گیا تو ہم نے راہ فرار اختیار کی۔

بندوبست پہلے سے کیا ہوا تھا۔ گھوڑیاں تیار تھیں۔ راستے کا انتخاب ہو چکا تھا۔ رقم اچھی خاصی میرے پاس تھی۔

دوسرے دن ہم محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہاں چنن شاہ کی واقفیت کام آئی اور ہم نے ڈیرے لگا لئے۔ تین ماہ تک ہم ان لوگوں کے مہمان رہے۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔ بالآخر ہم نے اس علاقے کو خیر باد کہا اور اپنا روپ اور نام بدل کر دوسرے صوبے کی طرف نکل گئے۔

میرے باپ نے کم عمری میں ہی میرا رشتہ پھوپھی کے گھر طے کر دیا تھا جو ایک بڑے شہر میں رہتی تھی۔ ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ ایک جگہ کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ پھر میں چنن شاہ کو بتائے بغیر ایک دن اپنی پھوپھی کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"پھوپھی گھبرانہ جانا۔" میں نے کہا۔ "میں صرف اپنا فرض پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میرے باپ کی شدید خواہش تھی کہ میری شادی صغراں سے ہو۔ میری پوزیشن تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم انکار کرو گی تو بھی میں تمہارا فیصلہ قبول کر لوں گا۔ لیکن میں روز قیامت اپنے باپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔"

"تو میرے مرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے۔" پھوپھی نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہو یا برا۔ بیٹیوں کی قسمت کے فیصلے آسمانوں پر لکھے جاتے ہیں۔ صغراں تیری امانت ہے تو اسے لے جا۔"

تیسرے روز ایک سادہ سی تقریب میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ چنن شاہ نے ہر کام میں سگے بھائیوں کی طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری شادی ہوئی اور چنن شاہ کے مشورے پر ہم کراچی چلے آئے۔ کراچی لوگوں کا سمندر ہے۔ اس سمندر نے ہمیں بھی ہڑپ کر لیا۔ میں نے اپنا نام نیاز علی رکھ لیا تھا۔ اسی نام کا شناختی کارڈ بنا لیا تھا۔ یہیں ہم

ایک مکان میں رہنے لگے۔ باہر والا کمرہ چنن شاہ کے پاس تھا۔ اندر دو کمرے ہمارے پاس تھے۔ زندگی گزرنے لگی۔

خزانوں کے تو کنوئیں بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ وہی ہوا۔ دو تین مہینوں بعد پیسے ختم ہونے لگے۔ اس دوران صغراں مجھ پر مسلسل دباؤ ڈالتی رہی کہ میں کوئی چھوٹا موٹا کام کرلوں اور پرانی زندگی کو بھول جاؤں لیکن جو چسکا مجھے لگ گیا تھا اس نے مجھے کوئی "چھوٹا موٹا" کام نہ کرنے دیا۔ میں نے تو کبھی معمولی چوری نہیں کی تھی۔

چنن شاہ بڑا کائیاں آدمی تھا۔ وہ میرے حالات کا جائزہ لیتا رہا ایک روز کہنے لگا "بھائی صاحب کب تک زندگی یوں گزاریں گے۔ کئی ہاتھ مارنا پڑے گا۔" میں نے کہا میں تیار ہوں۔ لیکن شہر کے کام ہم لوگ نہیں جانتے ہم تو مردوں والے کام ہی کر سکتے ہیں۔

چنن شاہ نے کہا اچھا میں باہر نکلتا ہوں کوئی پرانی واقفیت مل جائے پھر بات بنے گی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے اسے کہا۔

چنن شاہ چلا گیا۔ اس کی واپسی تیسرے روز ہوئی۔ لیکن اکیلے نہیں ایک نوجوان لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟"

چنن شاہ نے مجھے آنکھ سے بیہودہ سا اشارہ کیا۔ مجھے طیش آگیا۔ اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے وہ مجھے اشارہ کرتا باہر نکل گیا۔

"بہاول خان!" چنن شاہ نے کہا۔ یہ تمہارا گاؤں نہیں۔ کراچی شہر ہے۔ ہم دونوں مفرور قاتل ہیں۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو اور میری بات غور سے سنو۔ زیادہ ہوشیاری دکھائی تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔"

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ خود کو اتنا بے بس اور مجبور محسوس کیا تھا۔ خدا جانے صغراں سے شادی کے بعد میں کچھ بزدل سا کیوں ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور واپس آگیا۔ دوسرے دن چنن شاہ اس لڑکی کو لے گیا اور اگلے ہی روز

واپس لوٹ آیا میں سمجھ گیا کہ اس نے لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔

دو روز ہم ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ تیسرے دن اس نے کہا۔ "بہاول! میں نے اپنی غلطی کو محسوس کرلیا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی یہ گھٹیا کام نہیں کروں گا۔" میں خوش ہو گیا۔

اس دوران صغراں ہماری باتیں چھپ چھپ کر سنتی رہتی تھی۔ اس نے مجھے متعدد مرتبہ کہا کہ میں چنن شاہ سے جان چھڑالوں۔ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک ہی جواب دیا۔ "صغراں میں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

دو تین روز بعد چنن شاہ کہیں گیا اور واپس لوٹا تو بہت خوش تھا۔ کہنے لگا۔ "بہاول خان کام بن گیا۔ تمہاری مرضی کا کام ہے۔"

وہ اپنے کسی پرانے ساتھی کے ساتھ ڈاکے کا منصوبہ بنا آیا تھا۔ بڑی خطیر رقم ہاتھ لگنے والی تھی۔ منصوبہ کچھ یوں تھا ہمیں حیدر آباد میں ایک وین پر حملہ کر کے اس میں موجود بنک کرنسی پر قبضہ کرنا تھا۔ اس وین کا ڈرائیور ہمارا ہی ساتھ تھا جو ہماری مدد کرتا۔ منصوبے کے مطابق مجھے دو اور ساتھیوں کے ساتھ حملہ کرنا اور کرنسی والے تھیلوں پر قبضہ کرنا تھا۔ چنن شاہ کار لئے قریب موجود ہو گا۔ ہمیں اس کار میں بیٹھ کر فرار ہونا تھا۔

منصوبے کے مطابق صغراں سے دو روز بعد واپس لوٹنے کا بہانہ کر کے ہم چلے گئے۔ حیدر آباد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کروادی۔

صبح ہم نے واردات کرنی تھی۔ رات کو ہوٹل کے ایک کمرے میں جہاں میں اس کا ساتھی قیام پذیر تھے۔ پولیس نے ریڈ کر دی۔ ہم دونوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ تھانے جا کر علم ہوا کہ ان کا تیسرا ساتھی جو پولیس کو پہلے ہی مطلوب تھا کہیں دوپہر کو گرفتار ہو گیا تھا اور اس نے ڈاکہ مارنے کا اعتراف کر کے ہمیں گرفتار کروادیا ہے۔ آج

مجھے اپنے مرحوم باپ کی وہ بات شدت سے یاد آئی کہ چور ہمیشہ اکیلا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ یہ شہری لوگ تھے۔ پولیس نے دو دو چھتر مارے اور چالو ہو گئے۔ میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں انہیں نہیں جانتا اور جس شخص کو میرے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ آج ہی میرا واقف بنا ہے۔ پولیس والے مجھے تین روز تک مارتے رہے۔ لیکن مجھ سے کیا اگلواتے۔

سات دن کا ریمانڈ تھا اس دوران انہوں نے اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ میں نے پنجاب میں اپنی پھوپھی کے گھر کا پتہ لکھوا دیا۔ پھوپھی کو میرے نئے نام کا علم تھا۔ خدا جانے وہاں کوئی گیا یا نہیں۔ پولیس نے مجھے جیل بھیج دیا۔ مجھ پر ان لوگوں نے آوارہ گردی کا مقدمہ قائم کیا تھا۔ ضمانت کے لئے کسے کہتا۔ کراچی خط لکھتے ڈرتا تھا۔ ایک فکر یہ بھی کھائے جا رہی تھی کہ صغراں کا کیا بنے گا۔ پھر دل کو تسلی دے لیتا کہ چنن شاہ وہاں ہے۔

چھ ماہ بعد مجھے جیل سے رہائی ملی۔ مانگ تانگ کر کراچی پہنچا تو صغراں اور چنن شاہ کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ خدا جانے دونوں کہاں غائب ہو گئے۔ ہمسایوں نے بتایا کہ چنن شاہ انہیں پنجاب کو کہہ گیا ہے۔ گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے تالا توڑ کر اندر دیکھا۔ گھر کا مکمل صفایا ہو چکا تھا۔

"یا اللہ دونوں کہاں گئے؟"

بڑی مشکل سے کرایہ اکٹھا کیا اور میں پنجاب پہنچ گیا۔ پھوپھی کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ صغراں یہاں نہیں آئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ چنن شاہ کی کارستانی ہے۔ میں نے پھوپھی سے کچھ پیسے لئے اور وہاں سے چل دیا۔ حلیہ بالکل بدل گیا تھا۔ اور اب میں بآسانی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس دوران گلی گلی کوچے کوچے میں نے دونوں کو تلاش کیا لیکن کوئی نشان نہ ملا۔

میں درندہ بن گیا؟

اب میرے لئے جرم کی کوئی تخصیص نہیں رہ گئی تھی۔ صرف ایک کام کیا کہ ہر واردات اکیلے کی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں بھٹکتا رہا پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران ملک کے کونے کونے میں جرائم پیشہ لوگ میرے واقف بن چکے تھے۔ میرا اپنا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آج اس شہر میں ہوتا تو کل کسی دوسرے شہر میں۔

ایک مرتبہ اسی طرح میں ایک شہر کے بازار حسن سے گزر رہا تھا۔ جب ایک دلال مجھ سے ٹکرا گیا۔ میرے لئے اب یہ دنیا اجنبی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک کوٹھے پر لے گیا۔ جہاں زندگی کا سب سے زیادہ وحشت ناک منظر میرا منتظر تھا۔ میرے سامنے بہت سی لڑکیاں تھیں۔ جن میں صغراں بھی تھی۔

صغراں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ دیوانہ وار ایک طرف بھاگی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"صغراں تم یہاں؟" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

"بہاول خدا کے لئے میرا نام نہ پکارو۔ مجھے نہ چھوؤ۔ میں مر چکی ہوں۔" خدا جانے وہ کیا کیا کہتی رہی۔ ہم دونوں ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ دلال مطمئن ہو کر چلا گیا۔ میرے اصرار کرنے پر صغراں نے رو رو کر مجھے بتایا کہ چنن شاہ نے اسے میری موت کی خبر دی تھی اور بتایا کہ میں حیدر آباد کسی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوں اور اب پولیس یہاں ریڈ کرنے والی ہے وہ مجھے گھر لے جانے کے بہانے کار میں بٹھا کر لے گیا اور کراچی میں ہی اپنے ایک اڈے پر پہنچا دیا۔ جہاں مجھے علم ہوا کہ وہ تو عورتوں کا پرانا دلال ہے اور ایک عرصے سے عورتوں کو اغوا کر کے فروخت کرنے کا دھندہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد صغراں کی کہانی ان بدنصیب لڑکیوں سے ملتی جلتی تھی، جو بالآخر ظلم و

تشدد کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے ایسے اڈوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ صغراں نے یہ بھی بتایا کہ اس نے تین مرتبہ خودکشی کی ہے لیکن یہ لوگ اسے مرنے بھی نہیں دیتے۔

"صغراں میرے ساتھ چلو۔" میں نے اسے کہا۔

پہلے تو وہ نہ نہ کرتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا: "بہاول یہاں صرف بہادری سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بڑے بااثر لوگ ہیں۔ تم کل دوپہر کو فلاں جگہ پر آجانا۔ میں وہاں ایک ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے کے بہانے جاتی ہوں۔ وہاں سے ہم نکل جائیں گے۔"

میں بادل نخواستہ واپس آگیا۔

رات میں نے کانٹوں کی سیج پر گزاری۔ اگلے روز میں طے شدہ منصوبے کے مطابق اس جگہ پہنچ گیا لیکن صغراں کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ شام تک میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بیقرار ہو کر اسی اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ صغراں نے رات کو ہی خواب آور گولیوں کی ساری شیشی کھا کر خودکشی کرلی تھی۔ اس کی لاش لاوارث سمجھ کر کمیٹی والے لے گئے ہیں۔ اس خبر نے مجھ پر بجلی گرادی۔ مجھے سمجھ آگئی کہ اس حالت میں صغراں کبھی میرے ساتھ نہیں جاسکتی تھی۔ اب میری زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں ان لوگوں کو چن چن کر ماروں جنہوں نے میری صغراں کو اور مجھے جیتے جی مار ڈالا تھا۔

میں اس مشن کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہوگیا۔

ایک ہفتے کے دوران میں نے دس قتل کئے۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح صغراں کی بربادی میں حصہ لیا تھا۔ چنن شاہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ میں اسے تلاش کرتا رہا۔

پولیس میرے پیچھے پیچھے اور میں اس کے آگے آگے بھاگا پھر رہا تھا۔ میں نے اب جرائم سے توبہ کرکے دن کھول لی تھی۔ بس ایک آخری گناہ کی مہلت کے لئے خدا

سے دعا مانگتا کہ کسی طرح چنن شاہ مل جائے اور اس مردود سے دنیا کو پاک کروں۔ میں نے حلیہ بدل لیا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ دل کے سکون کے لئے کبھی کبھی اللہ والوں کے پاس بھی ہو آتا۔ آخر قدرت نے میری دعا کو قبول کیا اور حرامی چنن شاہ کو میرے ہاتھوں اس کے انجام تک پہنچانے کے اسباب پیدا کئے۔

ایک روز یونہی ایک بزرگ کی نزدیکی گاؤں میں آمد کی خبر سن کر وہاں پہنچ گیا۔ منزل مراد یہاں میرے ہاتھ لگ گئی۔

اس بزرگ کے خلیفوں میں چنن شاہ بھی موجود تھا۔ اس نے اپنا بھیس بدل لیا تھا اور فقیروں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ لوگ اسے بابا چنن شاہ کے نام سے پکارتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس حرامی نے اب یہ روپ دھار کر اپنا دھندہ شروع کیا ہے۔ میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ اس کے ٹھکانے کا علم مجھے ہوگیا تھا۔ جہاں میں نے ایک روز اس کے مریدوں کے سامنے اسے کتے کی موت مار ڈالا۔ میں نے اُسے کلہاڑی سے قتل کیا تھا اس دوران میں چلا چلا کر کہتا رہا کہ میں صغراں کا انتقام ہوں۔ میں بہاول خان ہوں میں بہرام خان کا بیٹا ہوں۔ میری غیرت سے کھیلنے والے درندے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

کسی نے مجھے نہیں روکا۔ میں وہاں سے نکل گیا۔ سیدھا اپنے گاؤں گیا۔ باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ قانونی دستاویزات مکمل کرکے اپنی ساری زمین اپنی پھوپھی کے بیٹوں کو منتقل کردی اور یہاں آگیا۔ پولیس ساری زندگی مجھے تلاش نہ کرپاتی لیکن جب زندگی کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہ گیا پھر جی کر کیا کرنا ہے۔ میں نے خدا سے ایک آخری گناہ کی مہلت مانگی تھی جو مل گئی۔ اب میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرکے سرخرو ہو کر اس کے دربار میں پہنچوں گا۔

دُلّا مینٹل

یہ کہانی ایک پاکستانی جاسوس کی ہے۔

اگر آپ مشرقی پنجاب (بھارت) کے کسی جیل خانے میں بھی جائیں جہاں جاسوسوں کو قید میں رکھا جاتا اور ان سے ان کے پورے رنگ (گروہ) کی نشاندہی کرانے کے لئے انہیں درندوں کی طرح چیرا پھاڑا جاتا ہے۔ وہاں آپ "دُلّا مینٹل" کا نام ضرور سنیں گے یہ اصل نام عبداللہ ہے جو سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کی پولیس کے ریکارڈ میں دُلّا بدمعاش بستہ الف کے نام سے درج ہے۔ اسے "دُلّا مینٹل" کا خطاب بھارتی پولیس، انٹیلی جنس اور جیل خانے کے سٹاف اور نامی گرامی جرائم پیشہ قیدیوں نے دیا تھا۔ مینٹل سے ان کی مراد مینٹل کیس یعنی پاگل تھی۔ دُلّا جاسوسی کے فن میں پاگل پن کی حد تک دلیر تھا۔

6 ستمبر 1965ء کی صبح بھارتی فوج نے سیالکوٹ سرحد پر جسٹر کے مقام پر حملہ کیا۔ یہ ایک دھوکہ تھا۔ ان کا بڑا حملہ شمال کی جانب سے سامبا کی طرف آرہا تھا۔ یہ ان کے ٹینک ڈویژن کی یلغار تھی۔ جو 8 ستمبر 1965ء کی صبح آئی۔ اس سے پہلے دشمن پاک فوج کو یہ جھانسہ دینا چاہتا تھا کہ وہ جسٹر کی طرف سے حملہ کرے گا تاکہ پاک فوج اپنا

دفاع اس طرف منتقل کر دے۔ آج کے دور میں جاسوسی یعنی انٹیلی جنس اور کمانڈو اپریشن کے بغیر جنگ جیتنا ممکن نہیں۔ کمانڈو اپریشن کے بعد لڑاکا گشتی پارٹیوں (فائٹنگ پٹرول) اور ٹینک ہنٹنگ (ٹینک شکار) پارٹیوں کا نمبر آتا ہے۔ "حکایت" میں کئی بار ان کی تشریح کی گئی ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ان پارٹیوں کے جوان کس طرح دشمن کے مورچوں کے علاقے کے اندر یا عقب میں چلے جاتے ہیں اور دل میں یہ بٹھا کر تباہی مچاتے ہیں کہ وہ زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ ذرا تصور فرمایئے کہ دو تین ہزار نفری کی فوج کے مورچوں میں دس یا بارہ جوانوں کا گھس جانا اور تباہی بپا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ صرف تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جسٹر پر حملے سے پاک فوج کی انٹیلی جنس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ جسٹر کے سامنے دشمن کا فوجی اجتماع کہاں ہے۔ جسٹر کے قریب دریا کا پل ہے۔ جس کے سامنے کھیلنا نام کا ایک بھارتی گاؤں ہے اس سے کچھ آگے سے ایک سڑک شکار پور سے بٹالہ کو جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف بھارت کے پگٹانے، روسے، پکھویں وغیرہ نام کے گاؤں آباد ہیں۔ یہ تمام گاؤں تھانہ ڈیرہ بابا نانک میں ہیں اور ان کی تحصیل بٹالہ ہے ان دیہات کے علاقے میں بھارتی فوج کا اجتماع تھا۔ جسے جسٹر کے حملے کو کمک دینی تھی یا سیالکوٹ کی سرحد پر کسی اور مقام پر حملہ کرنا تھا۔ ڈیرہ بابا نانک سے بذریعہ ریل گاڑی امرتسر جائیں تو راستے میں رتڑچھتر نام ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن آتا ہے۔ اس کے قریب دشمن نے ایمونیشن کا ذخیرہ رکھا تھا۔ دشمن کی جنگی طاقت پاک فوج کی نسبت پانچ گنا سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ صرف افرادی قوت سے کریں تو سیالکوٹ، چونڈہ اور جسٹر سیکٹروں میں دشمن کی پچاس ہزار نفری سے حملہ کیا۔ جسے روکنے کے لئے پاک فوج کی کل نفری نو ہزار تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانوں کا تناسب بھی یہی تھا ایسی صورت میں حال میں ضرورت محسوس محسوس کی گئی کہ کمانڈو اپریشن سے دشمن کو

تیاری کی حالت میں درہم برہم کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے چند جانباز دشمن کے پورے بریگیڈ (غالباً اس سے کہیں زیادہ فورس) پر حملہ کرنے کے لئے جائیں اور مطلوبہ کامیابی حاصل کریں۔

پاک فوج کی شجاعت کا یہ پہلو ڈھکا چھپا رہتا ہے۔ اس کی تفصیلات سے ہماری تاریخ ہمیشہ بے خبر رہے گی۔ کیونکہ تفصیلات جنگی راز ہیں۔ ایک کمانڈو پارٹی منتخب کی گئی۔ جس کے متعلق یہ کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس میں کون کون تھے اور وہ کہاں کہاں کے رہنے والے تھے۔ ہم یہی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان کی دیہاتی ماؤں کے جوان بیٹے تھے اور وہ صرف پانچ تھے۔ انہیں ایسے علاقے سے گزر کر دشمن کے عقب میں جانا تھا۔ جہاں دشمن کی فوج پھیلی ہوئی تھی اور جہاں مشین گنوں اور دیگر تمام ہتھیاروں نے فضا میں آگ کا جال تان رکھا تھا۔ دونوں طرف توپ خانے گولہ باری کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس علاقے سے واقفیت نہیں تھی۔ راہنمائی کے لئے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بھارت کے اس علاقے کے ایک ایک انچ سے واقف ہونے کے علاوہ جان کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو۔ اسے پارٹی کو ٹارگیٹ تک لے جانا تھا اور اگر کوئی جانباز زندہ رہ جائے تو اسے واپس لانا تھا۔

یہ ایک ایسی ضرورت تھی جو پوری نہ ہوتی تو کمانڈو پارٹی کو بھیجنے کا مطلب صرف یہ رہ جاتا کہ راستے میں بھٹک جائے اور دشمن کے ہاتھوں ختم ہو جائے۔ یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے ایک ایسا شخص سامنے آیا جو بستہ الف کا بدمعاش (غالباً اب بھی بستہ الف میں ہی ہے) اور سمگلنگ بھی کرتا تھا۔ وہ معاشرے کے بدنام ترین افراد میں سے تھا۔ یہ تھا ڈلا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسے کہاں بھیجا جا رہا ہے۔ راستے میں دریائے راوی بھی حائل تھی جو ستمبر کے پہلے ہفتے میں سیلابی کیفیت میں تھا۔ دریا کے پار دشمن تھا اور اس کے پیچھے کا علاقہ بھی دشمن کا تھا۔ ڈلے کا زندہ رہنا کسی پہلو ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ ان

پانچ کمانڈو جانبازوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو اس جوانی کے عالم میں پاکستان پر قربان ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ رات گہری ہوئی تو وہ انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔ اس نے کچھ فاصلہ دریا کے ساتھ ساتھ طے کیا اور ایک جگہ سے دریا پار کرایا۔ ان سوالوں کے جواب کہ اس جگہ کا نام کیا تھا اور دریا کس طرح پار کیا گیا۔ کبھی بھی نہیں ملیں گے میں نے جب اس سے ان سوالوں کے جواب مانگے تو اس نے کہا تم نے بھی بھارت میں جاسوسی کی ہے۔ بھارت کی جیلوں میں قید بھی کاٹ آئے ہو کیا تم راز کی یہ باتیں کسی کو بتادو گے؟

اس نے پارٹی کو دریا پار کرایا اور پارٹی کو کہیں چھپا کر خود اگلے علاقے کو دیکھنے گیا۔ اسے وہاں ایک اور خطرہ نظر آیا۔ اس تمام علاقے میں سرکنڈوں اور اونچی گھاس کا جنگل ہے۔ جسے بیلا کہتے ہیں۔ ڈلا جانبازوں کو اس جنگل میں سے گزار رہا تھا۔ جہاں دشمن کی فوج نہیں تھی۔ مگر سرکنڈوں میں خنزیر، گیدڑ اور ایسے ہی جانور رہتے تھے۔ کمانڈو جوان تو آواز پیدا کئے بغیر احتیاط سے چلنا جانتے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی چھپے ہوئے جانوروں کے ڈر کر بھاگنے کی آوازوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ روشنی راؤنڈ فائر ہوتے ہیں اور اگر قریب کوئی مشین گن پوسٹ ہو تو وہاں سے مشین گنوں کا اندھا دھند فائر شروع ہو جاتا ہے۔

کمانڈو پارٹی کو ڈلا اس خطرے سے بھی نکال کر لے گیا اور انہیں بخیر وخوبی ٹارگیٹ تک پہنچادیا۔ ڈلے کی ایک طرف کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ ایک کمانڈو جانبازوں کو اپنا کام کرنا تھا انہوں نے دشمن کے اجتماع کا اندازہ کیا۔ ٹینک دیکھے اور پہلا راؤنڈ فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن ان کی روشنی ہمارے کمانڈو جوانوں کے ہی کام آئی۔ وہ تو دشمن کو نظر نہ آئے۔ انہیں کام کے ٹارگیٹ نظر آگئے۔ انہوں نے بہت تباہی بپا کی۔ دشمن نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ نکل

آئے اور ڈُلّا انہیں قریب کے ایک گاؤں میں لے گیا۔ جہاں اس کے میل جول کے ہم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ اس نے دن بھر انہیں وہیں چھپائے رکھا اور رات کو اسی طرح واپس پاکستان میں لے آیا۔ جس طرح لے گیا تھا۔ ڈُلّے کے بغیر یہ مشن کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

جنگ ستمبر کے سترہ دنوں میں ڈُلّا ایسی متعدد پارٹیوں کے ساتھ گائیڈ بن کر گیا۔ اس کے بعض مشن کشمیر کے ہیں جہاں اس نے ایک بار انڈین آرمی کے ایک میجر کو اغوا کیا اور پاک فوج کے حوالے کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ انٹیلی جنس کے لئے کام کرتا رہا اور بھارت میں پکڑا گیا۔ جاسوسی کے الزام میں پکڑے ہوئے پاکستانیوں کے لئے امرتسر کا انٹیروگیشن سنٹر (تفتیش کا مرکز) جہنم سے کم نہیں۔ جاسوسوں کی تفتیش میں ایک ہی سوال پر زور دیا جاتا ہے کہ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں کہاں ہیں۔ یعنی پورے رنگ کی نشاندہی کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تمام ممالک جانتے ہیں کہ جاسوس اکیلا نہیں ہوتا۔ ایک منظم گروہ جس کا آپس میں رابطہ ہوتا ہے کام کرتا ہے اور یہ گروہ دشمن ملک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایک جاسوس گرفتار ہو کر سارے گروہ کی نشاندہی کر دے تو پورا رنگ گرفتار ہو کر بیکار ہو جاتا ہے۔ جاسوس کا ایک کمال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن ملک میں داخل ہوتا ہے اور عقل سے کام کر کے اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ حالانکہ وہ دشمن آبادی کے ہجوم میں گھومتا پھرتا ہے۔ اس کی بہادری اور مردانگی کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ پکڑا جاتا ہے۔ دشمن کی ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس اس کے ساتھ پیار و محبت کی صرف اتنی بات کرتی ہے کہ اپنا گروہ اور اپنا مشن بتا دو اور عیش کرو۔ اگر وہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دنے تو اسے عیش نہیں کرائی جاتی۔ اسے کسی نہ کسی بہانے قید و بند میں رکھا جاتا ہے اور اپنے ملک کے خلاف غداری

پر اکسایا جاتا ہے۔ لالچ دیئے جاتے ہیں اور ضرورت پڑے تو تشدد بھی کیا جاتا ہے۔

غرض تفتیش وہ مرحلہ ہے جو دین و ایمان کی بڑی سخت آزمائش کا مرحلہ ہے۔

ہماری انٹیلی جنس کے جو افراد بھارت کی قید سے فرار ہو کر یا کسی معاہدے کے تحت واپس آئے ہیں ان کے جسم گواہی دیتے ہیں کہ وہ بھیڑیوں کی کچھاروں سے نکل کر آئے ہیں۔ تشدد کے ایسے ایسے نشان نظر آتے ہیں جو رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض بینائی سے، طاقت گویائی سے، کانوں سے اور بعض دماغی لحاظ سے ہمیشہ کیلئے معذور ہو گئے ہیں۔ یہ ثبوت ہے ان کے جذبہ حب الوطنی اور فرض شناسی کا کہ جسموں کا یہ حشر کرا کے بھی انہوں نے دشمن کو ایسی بات نہیں بتائی جس سے ان کے رنگ کو اور ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا اور وہ جانباز جو دشمن کی غیر انسانی اذیتوں سے یا فرار کی کوشش میں فائرنگ سے مر گئے ہیں وہ ہماری تاریخ کے گمنام ہیرو ہیں۔

ڈُلّا انہیں سرفروشوں میں سے ہے۔ اس کے تمام مشن ایک تو طوالت کی وجہ سے بیان نہیں کئے جا سکتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جنگی راز کے زمرے میں آتے ہیں۔ جن سے کبھی بھی پردہ نہیں اٹھ سکے گا۔ اسے قید اور تفتیش میں وہی اذیتیں دی گئیں جو ہر جاسوس کو دی جاتی ہیں مگر اس نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا کہ جاسوس میں نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ واحد آدمی ہے، جسے امرتسر انٹیروگیشن سنٹر میں سب سے زیادہ لمبے عرصے کے لئے رکھا گیا تھا۔ ہندو افسر حیران تھے کہ گوشت پوست کا یہ انسان اتنا زیادہ تشدد اور اتنی ظالم اذیتیں کس طرح برداشت کر رہا ہے۔ اس سے راز اگلوانے کا یہ طریقہ بھی آزمایا گیا کہ اس کے منہ پر غلاظت باندھ دی جاتی۔ کچھ دیر بعد غلاظت ہٹا کر اس سے پھر وہی سوال پوچھا جاتا لیکن ڈُلّے کا جواب وہی ہوتا کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ قید میں اس کے ساتھ کچھ سکھ قیدی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک دو اس کے رنگ کے افراد تھے۔ وہ ڈُلّے کو اس وقت دیکھتے تھے جب اسے

اذیت رسانی کے بعد (اکثر غشی کی حالت میں) قید میں لا پھینکتے تھے تو اسے ہاتھ جوڑ کر کہتے تھے۔ "دُلّے! اس طرح کب تک زندہ رہو گے۔ ہمارا نام بتادو کہہ دو یہ میرے ساتھی ہیں۔ ہم سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔"

"میں پاکستانی ہوں میرے دوستو!" -- دُلّے کا ہر بار یہی جواب ہوتا تھا۔ "دھوکہ نہیں دوں گا اور اس نے کسی کو دھوکہ نہیں۔ اپنے ملک کو بھی نہیں۔ اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں۔ تفتیش کے دوران اسے دستاویزی ثبوت دکھا کر کہا جاتا کہ اتنا تسلیم کرلو کہ یہ دستاویزات صحیح ہیں۔ اس کے جواب میں اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلتے تھے۔ "میں ان پڑھ ہوں۔" یہ ہے بھی حقیقت کہ وہ ان پڑھ ہے مگر ان طالب علموں کا عالم ہے جنہوں نے عمریں کتابوں میں گال دی ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ہٹ کا انجام موت یا ہمیشہ کی قید یا عمر بھر کی جسمانی معذوری ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا جسم اور جان پاکستان ہے اور پاکستان ہی کے کام آئیں گے۔ اس کے جذبے اور قوت برداشت کو دیکھ کر بھارت کے درندہ صفت افسروں نے اسے "دُلّا مینٹل" کا خطاب دیا تھا۔

آخر بھارتی ہار گئے اور اسے تفتیش کے مرحلے سے نکال کر جیل میں ڈال دیا پھر اسے مشرقی پنجاب کی مختلف جیلوں میں تبدیل کیا گیا جن میں نابھہ جیل جیسا ظالم قید خانہ بھی شامل ہے۔ ایسے قیدیوں کو بھارتی کسی باقاعدہ مقدمے کے بغیر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ اور ان سے سزا یافتہ قیدیوں کی طرح مشقت کراتے ہیں۔ بعض قیدی مشقت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ عالمی قانون کے خلاف ہے۔ اس انکار پر انہیں اذیتیں دی جاتی ہیں اور ایسی تنگ و تاریک اور غلیظ کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں حیوان بھی نہیں رہ سکتے۔ دُلّا بھی مشقت سے انکار کرنے والوں میں سے تھا اس سے مشقت کرانے کے لئے ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جو بھارتی بربریت کی فہرست میں تھا۔ مگر دُلّے نے مشقت نہ کی اور کہا کہ میں تمہارا سزا یافتہ قیدی نہیں ہوں۔

وہ نابھہ جیل میں ہی تھا۔ جب سقوط مشرقی پاکستان کی خبر آئی۔ یہ خبر سنانے والے بھارتی اور بھارتیوں کے اخبار تھے۔ دُلّے نے جیل میں ادھم برپا کر دیا اور نعرے لگا لگا کر کہا۔ "ساری دنیا آکر کہے کہ پاکستان کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو کبھی نہیں مانوں گا۔ میری فوج ہتھیار نہیں ڈال سکتی۔" اسے جب جیل کے ہندو عملے نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ خبر صحیح ہے تو اس نے کہا۔ "تم بزدل ہندو! مجھ سے نہیں کہلوا سکے کہ میں کون ہوں۔ تم مجھ سے مشقت نہیں کرا سکے۔ تم میں اتنی ہمت کہاں کہ میری فوج سے ہتھیار ڈلوالو۔" مگر حقیقت اپنے آپ کو تسلیم کروالیا کرتی ہے۔ دُلّے کو ماننا پڑا کہ یہ خبر صحیح ہے۔ پھر بھی اس نے کہا کہ میری فوج کے ساتھ کوئی دھوکہ ہوا ہے۔ اس کے دل میں اپنی فوج کی جو عقیدت تھی وہ کم نہ ہوئی اور آج بھی کم نہیں ہوئی۔

نابھہ سے اسے امرتسر جیل میں بھیج دیا گیا۔ یہ بھی بھارت کا ایک بڑا ہی سخت جیل خانہ ہے جہاں سے فرار ناممکن نظر آتا ہے۔ کیونکہ حفاظتی انتظامات بہت مستحکم ہیں۔ کسی پاکستانی قیدی کا فرار تو اور زیادہ ناممکن ہے۔ کیونکہ پاکستانیوں کو جیل خانے کے اس حصے میں رکھا جاتا ہے جو جیل خانے کے اندر ایک اور جیل خانہ ہے۔ وہاں قیدیوں کو بیڑیاں ڈال کر رکھا جاتا ہے۔ جن سے فرار کی کوشش کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ان دنوں امرتسر جیل میں پاکستان اور بھارت کے ان مسلمان قیدیوں کو جن پر جاسوسی کا الزام ہوتا ہے) کو مشقت کرانے کے لئے جیل کے کارخانے (مشقت کے احاطے میں لے جایا جاتا تھا۔ اور ان سے قیدیوں کی بیرکوں کی صفائی بھی کرائی جاتی تھی۔

دُلّا مشقت سے جواب دے چکا تھا۔ اور جیل خانے کا سٹاف اس کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ دُلّا بیکار بیٹھنے کا بھی عادی نہیں تھا۔ اس نے جیل سے فرار کی سکیم تیار کرلی۔ یہ ایسی سکیم تھی جس میں عقل و دانش اور غیر معمولی دلیری شامل تھی۔

دُلّے نے کچھ ایسے اوصاف پیدا کر رکھے ہیں جو اس کی بہت مدد کرتے تھے۔ ایک

ہے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی، وہ ہنسوڑ طبیعت کا مالک ہے۔ قید کے دوران اتنی غیر انسانی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کے باوجود وہ ان اوصاف سے دست بردار نہیں ہوا وہ دشمن کا دل موہ لیتا تھا۔ جیل خانے کے وارڈر اور قیدی اس کے ان اوصاف کی بدولت جو محض بہانہ ہوتا تھا لیکن ڈاکٹر بھی چکرا جاتے تھے۔ اپنے آپ کو بخار بھی چڑھا لیا کرتا تھا جو فی الواقع بخار ہوتا تھا۔ اس نے یہ گر مجھے بھی سکھایا تھا جو میں نے قید کے دوران کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ وہ بلیڈ سے ٹانگ پر ذرا سا زخم کرتا اور کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتا کہ پوری ٹانگ سوج جاتی تھی۔ خون کی قے کرنے کے فن کا وہ ماہر تھا۔ وہ عام طور پر اپنے آپ کو آنکھوں کی ایک بیماری میں مبتلا رکھتا تھا جسے "اندھراتا" کہتے ہیں۔ اس سے دن کو کم نظر آتا ہے اور رات کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

امرتسر جیل سے فرار کی سکیم سمجھنے سے پہلے جیل کا نقشہ سمجھنا ضروری ہے باہر کی دیوار چودہ فٹ اونچی ہے۔ جیل کے بڑے گیٹ سے داخل ہوں تو دائیں طرف کی بڑی دیوار کے ساتھ اندر یک طرف ایک نالہ دیوار کے متوازی بہتا ہے۔ نالے سے آگے دیوار کے متوازی چونتیس کوٹھڑیاں ہیں۔ ان کے ساتھ ایک جگہ خالی ہے۔ جہاں خاصا چوڑا اور گہرا گڑھا ہے اس میں سارے جیل خانے کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بیت الخلا کے سامنے۔ کچھ دور ایک سڑک زیر تعمیر تھی جو دراصل ایک فٹ اونچی پٹڑی سی بنائی جا رہی تھی۔ اسی سڑک نے فرار کی سکیم میں بہت مدد کی۔ ڈلّے نے کوڑے کرکٹ کے گڑھے میں سرنگ کی کھدائی شروع کی۔ اسے چھپائے رکھنے کا انتظام یہ کیا کہ جیل خانے کے اس حصے میں جو سنتری ہوتے تھے۔ انہیں ڈلّے کے کچھ ساتھی تاش کھیلنے کے لئے بٹھا لیتے تھے۔ اس موقع پر ڈلّے کی بذلہ سنجی نے بہت کام کیا۔ کھدائی کے لئے اوزار مل گئے جو زیر تعمیر سڑک سے حاصل کئے گئے۔ سرنگ کا مشکل اور خطرناک پہلو وہ مٹی ہوتی ہے جو اندر سے نکلتی ہے۔ ان لوگوں نے تھوڑی تھوڑی اٹھا کر زیر تعمیر سڑک

پر پھینکنی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ جیل کے اندر تمام زمین پر لپائی ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے کچھ مٹی لپائی میں کھپا دی اور یہ خطرناک عمل جاری رکھا۔

یہ ایک دو دنوں میں ختم ہونے والا کام تو نہیں تھا، رفتار سست تھی ہر لحہ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ اور پکڑے جانے کے نتائج سے سب آگاہ تھے۔ تاہم کام جاری رہا۔ جیل کا کوئی وارڈر وغیرہ آ جاتا تھا تو پاکستانی قید دوڑ کر اس کا استقبال کرتے۔ اس کی مٹھی چاپی کرتے اور اسے اپنے پاس بٹھا کر تاش میں مگن کر لیتے۔ ڈلّا تمام کام کی نگرانی کر رہا تھا آخر وہ دن آیا کہ سرنگ جیل کی بڑی دیوار کے نیچے جا پہنچی۔ 25 دسمبر کی رات فرار کے لئے طے پائی۔ رات کو قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں بند ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوٹھڑیوں سے نکلنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ یہ انتظام پاکستان کے قیدی لوہار نے کر دیا۔ وہ جیل کے لوہار خانے میں کام کرتا تھا۔ اس نے ایک چابی تیار کی جو ہر ایک کوٹھڑی کے تالے میں لگ سکتی تھی مگر اسے خود کوٹھڑی سے باہر ہونا چاہئے تھا۔ وہ بھی تو کوٹھڑی میں ہی بند ہوتا تھا اس نے اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی سلاخیں اس طرح کاٹ لیں کہ دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کٹی ہوئی ہیں۔ فرار کی رات سے پہلے تمام تالے دن کے وقت جعلی چابی سے کھول کر دیکھ لئے گئے تھے۔ چابی کامیاب تھی۔ رات کو صرف ایک سنتری پہرے پر ہوتا تھا جو تین گھنٹوں بعد بدل جاتا تھا۔ فرار کا وقت بارہ بجے سے تین بجے تک ڈیوٹی والے سنتری کے پہرے کا مقرر کیا گیا۔ سنتری کو قابو کرنے کے لئے لاہور کے رہنے والے ایک قیدی محمد حسین اور میانوالی کے رہنے والے قیدی سپاہی حمید اللہ خان کو منتخب کیا گیا، بھاگنے والے قیدیوں کو ڈلّے نے پانچ پانچ کے گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک گروپ کا کمانڈر مقرر کیا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کون سا گروپ کس مقام سے سرحد پار کرے گا۔

25 دسمبر کا دن سکیم کے مطابق قیدیوں کے لئے قید کا آخری دن تھا۔ اس رات

انہیں اس لمبی سرنگ سے نکل جانا تھا۔ جو انہوں نے بڑی کامیابی سے کھودی اور چھپا رکھی تھی۔ یہ کرسمس کا دن تھا عیسائی قیدیوں نے کرسمس منانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ انہوں نے مسلمان قیدیوں کو اپنی خوشیوں میں شرکت کے لئے مدعو کیا۔ مسلمان ان کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خوش تھے اچانک گنتی کا حکم آگیا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام قیدی اپنی اپنی جگہوں پر چلے جائیں۔ معلوم ہوا کہ باہر سے ڈی آئی جی آیا ہے۔ اس کے ساتھ جیل کے تمام افسر سیدھے کوڑے کرکٹ کے گڑھے تک آئے۔ کوڑا کرکٹ ہٹایا گیا تو اندر سے سرنگ برآمد ہوئی۔ سرنگ میں گئے تو یہ بڑی کامیابی سے آگے یعنی باہر تک چلی گئی تھی۔ وہاں سے بند تھی۔ فرار ہونے والوں کو فرار کے وقت اسے کھولنا اور نکل جانا تھا۔ دُلّا اور اس کے ساتھی پکڑ لئے گئے۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان کا کیا حشر کیا ہوگا۔ یہ مخبری آستین کے سانپوں نے کی تھی۔ فرار ہونے والوں میں کوئی ایمان فروش بھی تھا۔ اس نے اس وقت مخبری کی جب فرار کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ بھارتی ڈی آئی جی نے سرنگ تو فرار سے پہلے ہی پکڑ لی لیکن اس نے سرنگ کھودنے اور اسے چھپائے رکھنے والوں کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔۔ ”مسلمانوں میں کوئی بدروح داخل ہو گئی ہے۔ یہ جنوں کا کام ہے۔ انسانوں کا نہیں۔“

دُلّا اذیتوں کے ایک اور دور میں داخل ہو گیا۔ اکتوبر 1973ء میں اسے رہائی کا جھانسہ دے کر امرتسر کے تھانے رام باغ میں لے گئے۔ پاکستانی قیدیوں کو رہائی کی خوشخبری سنا کر بھی ایک ذہنی جھٹکا دیا جاتا تھا۔ بھارتیوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ پاکستانی قیدیوں پر مختلف دفعات کے تحت فرد جرم عائد کی جاتی ہے۔ انہیں بغیر مقدمے کے قید میں رکھا جاتا ہے۔ پھر رہائی کا ناٹک کھیلا جاتا ہے۔ انہیں رہائی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے اور کسی تھانے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ حوالات میں بند رہتے ہیں۔ انہیں ہر روز

رہائی کا یقین دلایا جاتا ہے۔ اس طرح ذہنی اذیت دے دے کر قیدی کو سرحد کی طرف لے جاتے ہیں اور کسی جگہ اسے قتل کر کے لاش غائب کر دی جاتی ہے یا پیچھے سے کوئی اطلاع لے کے آجاتا ہے کہ قیدی کو واپس لے آؤ، کیونکہ اس کے خلاف ایک اور مقدمہ نکل آیا ہے۔ چنانچہ اسے واپس لے جا کر تشدد اور اذیت کے انہی مراحل میں جہاں سے وہ گزر کر آتا ہے ایک بار پھر گزارا جاتا ہے۔

اکتوبر 1973ء میں دُلّے کو نابھہ جیل سے رہائی کی خوشخبری سنا کر امرتسر لے گئے جہاں اسے رام باغ تھانے کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ تھانہ امرتسر کے گنجان آباد حصے میں ہے۔ میں بھی اس تھانے میں رہ چکا ہوں۔ مجھے دُلّے کے بعد وہاں لے جایا گیا تھا۔ اس تھانے کا ایک سکھ سپاہی میرا دوست بن گیا تھا۔ اس نے مجھے دُلّے کی ایک ایسی کہانی سنائی جسے میں من گھڑت سمجھتا تھا لیکن یہ بالکل سچ نکلی۔ دُلّے کو جب رام باغ تھانے کے سپرد کیا گیا اس وقت وہ برسوں کا مریض لگتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ بتایا کہ اسے اندھراتا ہو گیا ہے۔ ایک آدھ دن بعد اس نے خون کی قے شروع کر دی اور ادھ موا ہو گیا۔ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں لگتا تھا۔ رہائی کی خبر سنا کر پاؤں سے بیڑیاں اتار لی جاتی ہیں۔ تھانے میں دُلّا بیڑیوں کے بغیر تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ تھانے کا عملہ اس سے بے پروا ہو گیا۔ اس حالت میں جبکہ وہ مرنے والا تھا اس کے فرار کا کوئی خطرہ نہیں تھا وہ دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔

ایک روز تھانے میں سفیدی شروع ہو گئی۔ دُلّا تھانیدار کی میز کے قریب فرش پر لیٹا ہوا کراہ رہا تھا۔ لڑائی جھگڑے کا ایک کیس آ گیا۔ چالیس پچاس آدمی جو اس کیس میں ملوث تھے اندر چلے گئے اور تھانے دار کو گھیر لیا۔ تھانے دار نے ان کی رپورٹ سنی۔ جو کاغذی کارروائی کرنی تھی مکمل کی اور جب ان سے فارغ ہوا تو دُلّا وہاں نہیں تھا۔ اس نے اس خیال سے اسے نہ ڈھونڈا کہ یہیں کہیں پڑا ہو گا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ

تین چار روز بعد مر جائے گا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار کو پتہ چلا کہ اس کا اوور کوٹ (برانڈی) غائب ہے۔ اس کی وردی کی ایک پتلون وہاں پڑی تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ اس کے بعد انکشاف ہوا کہ محرر کی پگڑی اور ایک سپاہی کی وردی کی قمیض غائب ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل گی کہ ڈلا بھی تھانے سے غائب ہے۔

تھانے دار کو یقین آرہا تھا کہ نزاع کی حالت میں کراہتا ہوا مریض فرار ہو گیا ہے۔

ان دنوں بارڈر سیکورٹی فورس کا ایس پی ایک ظالم بھارتی بھلر تھا جو اجنالہ اور امر تسر سیکٹر کا انچارج تھا۔ اس نے فوری طور پر سرحد کی ناکہ بندی کر دی اور اپنی فورس کے ہزاروں افراد سرحد پر پھیلا دیئے۔ پولیس ہوم گارڈ اور سی آئی ڈی ڈلے کو امر تسر کے اندر ڈھونڈ رہی تھی مگر ناکہ بندی کی تلاش محض بیکار تھی۔ ڈلا پاکستان میں داخل ہو چکا تھا۔

اس کی خون کی قے، بخار اور نزع کی حالت اس کی اداکاری کا کمال تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جس رہائی کے لئے رام باغ تھانے میں لائے ہیں۔ وہ اسے کبھی نہیں ملے گی، اسے سرحد پر لے جا کر قتل کر دیا جائے گا یا پھر کسی نئے مقدمے کے بہانے جیل خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈلے جیسے پاکستانی کو بھارتی رہا کر دیتے۔ اس نے اپنی رہائی کا بندوبست خود ہی کر لیا۔ تھانے سے اس نے پولیس والوں کے جو کپڑے اڑائے تھے۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پولیس کی وردی میں فرار ہوا ہے۔

یہ کہانی اکیلے ڈلے کی نہیں، یہ ہمارے معاشرے کے بہت سے ایسے افراد کی کہانی ہے۔ جنہیں ہم جرائم پیشہ اور سمگلر کہتے ہیں۔ انہوں نے کمانڈو پارٹیوں کی رہنمائی کی۔ انٹیلی جنس کا کام آسان کیا اور پکڑے گئے تو دشمن سے کہلوا لیا کہ مسلمانوں میں کوئی بدروح داخل ہو گئی ہے، یہ کام جنوں کا ہے انسانوں کا نہیں۔ اگر ہم ان لوگوں کو استعمال میں لائیں تو یہ قوم کی بہت بڑی قوت ثابت ہو سکتے ہیں۔

شانتی اور شیطان

میں جب بھارت میں قید کاٹ رہا تھا تو امید نہیں تھی کہ قید مکمل ہونے پر وطن واپس چلا جاؤں گا۔ یہی حال باقی پاکستانیوں کا تھا۔ جو وہاں قید تھے۔ ہم کوشش کرتے تھے کہ اپنے آپ کو زیادہ تر مصروف رکھیں۔ جیل میں سارے دن کے لئے کام تو ہوتا نہیں تھا۔ ہم جب فارغ بیٹھتے تو ایک دوسرے کو جھوٹے سچے واقعات اور کہانیاں سنانے لگتے تھے۔ نابھہ جیل ان دنوں پاکستانیوں کے سنٹر کی حیثیت رکھتی تھی۔ مشرقی پنجاب میں کوئی پاکستانی جہاں بھی گرفتار ہوتا اور اسے سزا ہو جاتی تو اسے نابھہ جیل میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طرح بھارتی مسلمان بھی جب پنجاب میں گرفتار ہوتے تو انہیں بھی زیادہ تر اسی جیل میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طرح بھارتی مسلمان بھی جب پنجاب میں گرفتار ہوتے تو انہیں بھی زیادہ تر اسی جیل میں بھیجا جاتا تھا۔ خصوصاً عادی مجرموں کے لئے تو یہی جیل مخصوص تھی۔

ایک روز ہم لوگوں سے جیل کے "چکر" میں مشقت لی جا رہی تھی۔ "چکر" جیل کے عین درمیان اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں انچارج حوالدار بیٹھتا ہے اور عموماً نئے

قیدی سب سے پہلے یہیں آتے ہیں۔

نمبردار (پرانا قیدی) مکھن سنگھ جو لدھیانے کا رہنے والا تھا اور ایک ہندو بدمعاش کو قتل کر کے بیس قید کاٹ رہا تھا۔ اس جیل میں آتے ہی میرا دوست بن گیا۔ ان دنوں اس کی ڈیوٹی چکر میں تھی۔ ہمارے سامنے قیدیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

مکھن سنگھ نے مجھ کہا: "میاں! شانتی دیوی والا نذیر آ گیا ہے۔"

شانتی دیوی ایک کروڑ پتی ہندو لالے کی بیوی تھی۔ جسے کوئی مسلمان بھگا کر لے گیا تھا اور اس کی خبریں اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہو رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو شانتی دیوی کا حسن تھا اور دوسری وجہ یہ کہ اس کا کروڑ پتی خاوند بوڑھا تھا۔ اتنی زیادہ تشہیر کی وجہ ہندو اخباروں کا مسلمانوں کے خلاف تعصب تھا۔ وہ لوگ ایسی خبریں جن میں کوئی ہندو یا سکھ عورت کسی مسلمان کے ساتھ بھاگ جائے یا بیاہ کر لے، اتنی اچھالا کرتے تھے کہ اس پر مقامی ہندو آبادی میں اشتعال پیدا ہو جاتا اور وہ مسلمان آبادیوں پر حملے شروع کر دیا کرتے تھے۔

نذیر اب شانتی دیوی کے اغوا میں تین سال قید لے کر آیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے افسانے جیل میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن میں اس کی زبانی یہ سارا واقعات سننے کے لئے بے چین تھا۔ جیل کا چکر ایسی جگہ ہے۔ جہاں ہر وقت کسی نہ کسی افسر کی آمد کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس لئے قیدی ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے خاصے محتاط رہتے تھے۔ میں نے سرسری نظر سے نذیر کا جائزہ لیا اور اپنے کام میں مگن رہا۔

دوسرے ہی روز نذیر کو مشقت دے کر ہمارے ساتھ جیل کے احاطے میں بھیج دیا گیا۔ مسلمان ہونے کے ناطے ظاہر ہے ہمیں اس سے ہمدردی تھی۔ اگلے دو چار روز میں میری اس سے گاڑھی چھننے لگی اور ایک روز جب میں نے اس سے شانتی دیوی کے اغوا کی کہانی پوچھی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"طارق بھائی!" اس نے کہا۔ "اگر تم یہ کہو کہ مجھے یہ قید شانتی دیوی کے اغوا کے الزام میں ملی ہے تو میں نہیں مانتا۔ میرے بھائی! شانتی دیوی تو میرے گلے پڑ گئی تھی۔ ورنہ یہ کوئی ایسا جرم نہیں تھا۔ میری تو ساری زندگی جرم کرتے ہی گزری ہے آج تک جیل کا منہ نہیں دیکھا تھا اب یہ گھر بھی دیکھ لیا۔"

اس نے مجھے جو کہانی سنائی وہ اپنے الفاظ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ اس واقعہ کی خبریں اخباروں میں چھپ چکی تھیں۔ لیکن اصل کہانی نذیر سے معلوم ہوئی۔ ہندو اخباروں کو تو مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کا بہانہ ہاتھ آیا تھا۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔

اس کہانی کا آغاز لدھیانہ کے ایک امیر کبیر محلے سے ہوا جہاں ایک دولت مند لالہ دوار کا داس نے ایک نوجوان بیوہ شانتی دیوی سے شادی کر رکھی تھی۔ شانتی کوئی غریب یا گری پڑی عورت نہیں تھی کہ وہ دوار کا داس جیسے کے ساتھ بیاہ دی جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بیوہ ہو کر گھر آ بیٹھی تھی اور ہندو عورت اگر بیوہ ہو جائے تو اس سے کوئی بھی بیاہ نہیں کرتا نہ ہی وہ بے چاری خود شادی کر سکتی ہے۔ اس سے اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے اور معاشرے میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شانتی دیوی نے دوار کا داس کے ساتھ شادی پر صرف اس لئے ہاں کی تھی کہ اس کی نظر دوار کا داس پر نہیں بلکہ اس کے نوجوان بیٹے کیلاش پر تھی۔ اس نوجوان کے ساتھ شانتی دیوی کی ملاقات پہلے کہیں ہو چکی تھیں۔ اس کی ڈیل ڈول کچھ ایسی تھی کہ شانتی دیوی کی پہلی ملاقات میں اس پر مست ہو گئی تھی۔ دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تو تھا ہی شانتی دیوی کے حسن و جوانی کو دیکھ کر دوار کا داس نے اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی طرف سے پیغام ملنے پر شانتی نے ہاں کر دی۔ شانتی کے ماں باپ نے تو شکر کیا ہو گا کہ ان کی بیوہ بیٹی بیاہی گئی ہے۔

شانتی بیاہ کر کے دوارکاداس کے گھر آئی تو اسے کھل کر اپنی ہوس پوری کرنے کا موقعہ مل گیا۔ لالے کا بیٹا کیلاش ڈیل ڈول کا تو بڑا دلکش اور مضبوط تھا لیکن ذہنی طور پر بڑا ہی کمزور تھا۔ وہ جلد ہی شانتی دیوی کے قابو آگیا اور شانتی نے اس سے غلط تعلقات استوار کر لئے۔ دنیا کی نظروں میں وہ ماں بیٹا تھے۔

کیلاش اس بری طرح شانتی کے شکنجے میں پھنس چکا تھا کہ شانتی کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا ان کا یہ گھناؤنا کھیل جاری تھا کہ اچانک ایک بجلی لالہ دوارکاداس نے یہ کہہ کر شانتی پر گرادی کہ وہ کیلاش کی شادی کرنے والا ہے اور اس نے رشتہ پسند کر لیا ہے۔ کیلاش نے تو یہی سمجھا تھا کہ اب اس کی جان چھوٹ جائے گی لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا شانتی نے بظاہر اس خبر پر بڑی خوشی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اور "اپنے بیٹے" کی شادی کی تیاری میں مگن ہو گئی۔

کیلاش کی منگنی ہوئی اور اس کے فوراً ہی بعد شادی ہو گئی اور کامنی۔ کیلاش کی دلہن بن کر آگئی۔ کامنی کے آجانے سے کیلاش کی دلچسپی شانتی سے کم ہونے لگی اور اب وہ زیادہ تر اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ شانتی کو تنہائی میں ملنے کا موقعہ ہی نہ دے۔

اس صورت حال نے شانتی پر جھنجھلاہٹ طاری کر دی لیکن وہ تھی بڑی ہوشیار عورت۔ بجائے کوئی جذباتی قدم اٹھانے کے اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیا اور ایک منصوبہ دل میں طے کرنے کے بعد اس پر عمل پیرا ہو گئی۔ اس نے پہلے تو کامنی کو سنبھالا اور حیلے بہانوں سے اس کے کان کیلاش کے خلاف بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کئے کہ ان دونوں کو اکٹھے بیٹھنے اور میاں بیوی کے تعلقات برقرار رکھنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ وہ گھرانہ شہر کا لکھ پتی گھرانہ سمجھا جاتا تھا اور آئے روز کوئی نہ کوئی پارٹی اگر ان کے ہاں نہ ہوتی تو وہ کسی پارٹی میں چلے

جاتے۔ شانتی نے کامنی سے بڑی گہری دوستی کر لی اور اکثر اسے اپنے ساتھ رکھتی۔ اپنے ساتھ اسے مختلف پارٹیوں میں لے جاتی اور رات کو اتنی دیر گئے واپس آتی کہ کیلاش سو چکا ہوتا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو شانتی کامنی کو اپنے کمرے میں باتیں کرنے کے بہانے لے جاتی اور رات کو دونوں وہیں سو جاتیں۔

اس دوران اس نے کوشش کی کہ کامنی کے گرداگرد امیر کبیر نوجوانوں کا جمگھٹا لگا رہے۔ ان نوجوانوں کی رال یوں بھی نوجوان اور حسین عورتوں پر ٹپکتی رہتی تھی اور وہ کامنی جیسی خوبصورت اور امیر عورتوں کے متلاشی رہتے تھے۔

شانتی کو اس مقصد میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہو گئی اور اس نے کوشش کر کے کامنی کو بھی ایک نوجوان کی طرف متوجہ کر دیا۔ دوسری طرف اس نے کیلاش کے کان بھرنے شروع کئے اور اسے بتایا کہ کامنی کا ماضی ٹھیک نہیں نہ ہی وہ اس میں کچھ دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کی باتوں پر ممکن تھا کیلاش کو یقین نہ آتا کیونکہ وہ خود کوئی بہت اچھی عورت ہیں تھی لیکن ہندو معاشرے میں ایک دوسرے کی ماں بہن سے ناجائز تعلقات معمول کی بات ہے اور یہ کوئی غیر معمولی حرکت نہیں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ کیلاش اس کے کہنے میں آگیا۔ پھر شانتی نے ایک اور داؤ کھیلا۔ ایک روز کامنی اور اس نوجوان کو کسی بہانے سے ایک جگہ اکٹھا کر کے کیلاش کو وہاں لے گئی۔ اس نے دونوں کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

شانتی کی سکیم کامیاب رہی اور دونوں کو اس نے ایسے شاندار طریقے سے بے وقوف بنایا کہ ایک روز کیلاش نے شراب کے نشے میں کامنی کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ کامنی کوئی غریب گھر کی لڑکی تو تھی نہیں کہ خاموش رہتی۔ وہ بھی امیر کبیر گھرانے کی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بھائی خاصے بدمعاش قسم کے تھے۔ لیکن ایسے ویسے بدمعاش نہیں تھے جو کوئی غلط دھندہ کریں وہ صرف لڑنے والے بدمعاش

تھے اور آئے روز کسی نہ کسی کو پیٹتے رہتے تھے۔ کامنی پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس نے اپنے بھائیوں کو ساری کہانی سنا دی۔ لڑکے عقلمند تھے۔ وہ جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے کیلاش سے ملاقات کے بعد اندازہ لگا لیا کہ اصل شرارت کی جڑ شانتی ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر شانتی کے ماضی کی تحقیقات کی تو اس کے بہت سیکالے کرتوت ان کے علم میں آئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا پہلا خاوند بھی پراسرار حالات میں مرا تھا۔ جن لوگوں کے درپردہ تعلقات کبھی شانتی دیوی سے رہے تھ۔ انہوں نے بتایا کہ شانتی حیوانی جذبات سے مغلوب رہنے والی شیطان صفت عورت ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد سوائے عیش موج کرنے کے اور کچھ نہیں۔ پھر انہوں نے کیلاش کو بھی ڈرا دھمکا کر ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا پتہ لگا لیا۔ کامنی کے بھائیوں نے شانتی کے بوڑھے خاوند لالہ دوار کاداس کو شانتی دیوی کے بارے میں کچھ بتانا فضول سمجھا۔ اس سے کئی قباحتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ایک تو کیلاش کی بدنامی ہوتی جو ان کا بہر حال بہنوئی تھا اور خود لالہ دوار کاداس اس بری طرح شانتی کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ ان کی کسی بات پر یقین ہی نہ کرتا۔

کامنی کے بھائیوں نے اس صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک رات انہوں نے کسی بہانے سے شانتی دیوی کو گھر سے باہر بلایا اور اسے اغوا کر کے اپنے ایک بدمعاش دوست کے ٹھکانے پر لے گئے۔ اسے انہوں نے شانتی کو سنبھالنے کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ شانتی دیوی کی پراسرار گمشدگی پر لالہ دوار کاداس چکرا کر رہ گیا۔ پہلے تو وہ اس خوف سے پولیس کے پاس نہ گیا کہ اس طرح اس کی اپنی بدنامی ہوگی پھر جب اس نے دیکھا کہ اب شانتی کے غائب ہونے پر لوگوں نے کہانیاں تراشنی شروع کر دی ہیں۔ تو اس نے پولیس سے رجوع کرنا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے ہی کامنی کے بھائی اس تک پہنچ گئے۔

انہوں نے لالے سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی پگڑی اپنے ہاتھوں نہ اچھالے۔ اس کی بیوی کو کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ اپنے ایک سابقہ آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ جعلی ثبوت بھی اسے دکھا دیئے اور جھوٹی سچی گواہیاں بھی پیش کر دیں۔ ان گواہوں نے حلف اٹھا کر شانتی دیوی کا ماضی بڑا ہی گھناؤنا رہا ہے۔

اس دوران کامنی کے بھائیوں نے لالہ دوار کاداس کو یہ خبر بھی دی کہ انہوں نے شانتی دیوی کا پتہ لگا لیا ہے اور وہ اسے بہت جلد اس کے سامنے پیش کرنے والے ہیں۔ اگلے ہی روز وہ شانتی کو لے کر آ گئے۔ اب شانتی نے لاکھ چیخ چلا کر اپنی بے گناہی کی دہائی دی لیکن لالہ اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہ تھا۔ کیونکہ کامنی کے بھائیوں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس کے بیٹے اور بہو کی زندگی میں زہر گھولنے والی یہی شانتی دیوی ہے اور اس نے کیلاش کو بلیک میل کر کے اس سے گھناؤنے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ کامنی کو راستے کا روڑہ سمجھ کر اس نے ایک سازش کے تحت یہاں سے بھگایا ہے اور وہ صرف لالہ کی جائداد کے لالچ میں اس کی بیوی بنی ہوئی ہے۔

شانتی کی چیخ و پکار پر توجہ دیئے بغیر لالہ دوار کاداس نے اسے گھر سے نکال دیا۔ شانتی دیوی اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس کی نظر دوار کاداس کی کروڑوں کی جائداد پر تھی۔ اس نے یہ بات تو جان لی تھی کہ اس سب کچھ کے پیچھے کامنی کے بھائیوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن وہ اپنی لاکھ کوشش کے باوجود ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے ہندوؤں کی روایتی کمزوری یعنی ضعیف الاعتقادی کا سہارا لیا اور یہیں پر اس کی ملاقات نذیر سے ہوئی۔

نذیر دہلی کا بگڑا ہوا امیرزادہ تھا اور بچپن ہی میں غلط ماحول نے اسے گندی صحبت میں بٹھا دیا تھا۔ باپ نے جیسے تیسے اسے ایف۔ اے کروا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے تو چوری چکاری ہی کرتا تھا۔ اب پیشہ ور فراڈیا بن گیا۔ اس سلسلے میں اس نے محفوظ

ترین راستہ یہ اپنایا کہ پڑھے لکھے گیانی دھیانی جوگی کا روپ دھار کر امیر ہندوؤں کی آبادیوں میں ڈیرہ جمانا شروع کر دیا۔ اس کا یہ بزنس خوب چمک اٹھا اس سلسلے میں نذیر نے باقاعدہ ایک گروپ ترتیب دے رکھا تھا جو اس کے نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہی اس کے کشف و کمالات کے چرچے وہاں کر دیتا جن سے متاثر ہو کر امیر گھرانوں کی ہندو عورتیں اس کے گرد جمع ہونے لگتیں۔

شانتی دیوی کے محلے میں اسُ کی آمد حال ہی میں ہوئی تھی اور اس کی شہرت کے افسانے شانتی کے کانوں تک بھی پہنچ چکے تھے۔ ایک روز وہ نذیر کے پاس اپنا دکھڑا سنانے آ گئی۔ اس کی جسمانی ساخت کو اور اسے زیورات سے لدا پھندا دیکھ کر نہ صرف نذیر بلکہ اس کے چیلے چانٹوں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ وہ سب اس پر ڈورے ڈالنے کی فکر کرنے لگے۔ نذیر نے شانتی کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ شانتی ہی اس جال میں آنے کو تیار ہے۔ شانتی اس کے پاس زیادہ جانے لگی۔

نذیر نے دیکھ لیا تھا کہ موٹی آسامی دیکھ کر اس کے ساتھی بے ایمان ہونے لگے ہیں۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا اور اپنی لچھے دار گفتگو کے ذریعے اسے اپنے قبضے میں کرنے کی فکر کرنے لگا۔ نذیر جانتا تھا کہ شانتی دیوی قابو میں آ گئی۔ تو وہ دو تین سال بڑے عیش آرام کی زندگی بسر کر سکے گا۔ ابھی اس نے کھل کر شانتی دیوی پر اپنے عزائم ظاہر نہیں کئے تھے۔ لیکن اپنی گفتگو اور دیگر چکر بازیوں سے اس کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔

نذیر ابھی اپنا چکر چلا ہی رہا تھا کہ ایک روز اس کا ایک ساتھی اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شانتی دیوی کو لے اڑا۔ نذیر ابھی سنبھلنے کی فکر ہی کر رہا تھا کہ پولیس شانتی گمشدگی کی تفتیش کرتی۔ وہاں تک آ گئی۔ لیکن نذیر پولیس کی آمد سے پہلے ہی وہاں سے نکل گیا۔

اسے اپنے ساتھی پر غصہ بھی تھا اور جھنجلاہٹ بھی سوار تھی کہ اس کا بنا بنایا کھیل ختم ہو گیا۔ نیا اڈہ جمانے کے لئے نجانے ابھی کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں۔ نذیر کو اپنے اس ساتھی کے ٹھکانوں کا علم تھا۔ وہ یہاں سے بھاگا اور اس کے ایک ٹھکانے پر اس سے جا ملا۔ جہاں شانتی اور وہ رنگ رلیاں منا رہے تھے۔

نذیر نے بجائے اپنے ساتھی پر غصہ کرنے کے اسے اس "کارنامے" پر مبارکباد دی اور بتایا کہ وہ تو پولیس سے بچنے کے لئے یہاں آ گیا ہے کیونکہ شانتی دیوی کے فرار کے بعد پولیس اس کے ڈیرے تک آ پہنچی تھی۔ اس کا ساتھی نذیر کے جھانسے میں آ گیا یوں بھی نذیر اس کا استاد تھا اور شانتی وقتی طور پر اس کے لئے کارآمد تھی جب کہ استاد اس کا زندگی بھر کا ساتھی تھا۔ اس نے مزید وفاداری کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے استاد نذیر کو "مال" میں حصہ دار بننے کی بھی دعوت دے دی، لیکن نذیر کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس نے اپنے شاگرد کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہا کہ وہ دوسروں کا مارا ہوا شکار کھانے کا عادی نہیں۔

شانتی دیوی کو ورغلا کر اپنے شاگرد سے بدظن کرنا استاد نذیر کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ شانتی تو پہلے ہی اس کی گرویدہ تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ شانتی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے یقین دلا دیا کہ جیسے ہی اس کی دولت اور زیور جو وہ فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لائی ہے ختم ہوئے یہ شخص اسے کسی کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔ آٹھ دس روز بعد ہی اس نے شانتی پر قابو پا لیا اور ایک روز شاگرد کی غیر حاضری میں و شانتی کو لے اڑا۔

نذیر نے فرار کے لئے بڑا شاندار منصوبہ بنا رکھا تھا۔ لیکن یہاں قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ دونوں جب ایک جگہ لاری پر سوار ہوئے تو اس لاری میں شانتی دیوی کا ایک رشتہ دار بھی سفر کر رہا تھا۔ ہندو عورتیں پردہ وغیرہ تو کرتی نہیں، اس لئے اس

نے شانتی کو فوراً پہچان لیا۔ اسے علم تھا کہ شانتی اغوا ہو چکی ہے۔ جونہی بس اگلے اڈے پر پہنچی تو اس نے چپکے سے پولیس کو خبر دی اور یوں نذیر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس کا جرم بھارتی معاشرے کے حساب سے کوئی بہت بڑا جرم نہیں تھا۔ لیکن اس کی گرفتاری پر جب پتہ چلا کہ وہ کوئی گیانی یا جوگی نہیں بلکہ مسلمان ہے تو اخباروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ انہوں نے شانتی دیوی کو بالکل بے گناہ بتایا اور سارا الزام نذیر کے سر تھوپ دیا۔ اس صحافتی دباؤ میں آکر ہی جج نے اسے تین سال قید کا حکم سنایا اور شانتی دیوی کو "باعزت" بری کر دیا تھا۔

حمیت نام ہے جس کا

ہر ملک کے لئے دوسرے ملکوں کی جاسوسی اتنی ہی ضروری ہے جتنا اسلحہ اور بارود۔ خصوصاً ان ملکوں کے لئے جن کی آپس میں دشمنی کی فضا قائم رہتی ہے۔ مثلاً روس اور امریکہ، پاکستان اور بھارت وغیرہ۔ ایسے ملکوں کو ایک دوسرے کے ملک میں جاسوس بھیجنے ہی پڑتے ہیں۔ کیونکہ آدھی جنگ کامیاب جاسوسی جیت لیتی ہیاگر پاکستان میں بھارت کے جاسوس موجود ہیں یا بھارت میں پاکستان جاسوس سرگرم ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اگر آپ جاسوسوں کی دنیا میں جائیں تو عجیب و غریب اور جذبات کو ہلا دینے والے اور ناقابل یقین واقعات رونما ہوتے نظر آئیں گے۔ ایسی کہانیاں بظاہر افسانے لگتی ہیں لیکن یہ افسانے نہیں ایسی حقیقتیں ہیں جو افسانے سے زیادہ چونکا دینے والی ہوتی ہیں۔

پاکستان اور بھارت کی سرحد پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ دونوں ملکوں کی جاسوسی کا نظام غیر معمولی طور پر سرگرم تھا۔ پاکستان کی انٹیلی جنس کا ایک ایجنٹ جسے میں کہانی سنانے کے لئے احمد خان کہوں گا، سرحد پار جا رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مشن کامیابی سے انجام دے چکا تھا۔ ان دنوں سرحد پار کرنا ایسے ہی تھا جیسے کوئی آگ میں سے گزر جائے۔ کیونکہ دونوں طرف سرحدوں پر ایسی فوج موجود تھی جو عام

شہری کو نظر نہیں آتی۔ لیکن اس فوج کی نظر درختوں کے پتے پتے پر اور گھاس کی پتی پر ہوتی ہے۔ احمد خان ان تمام خطرات سے آگاہ تھا۔ لیکن تنخواہ کے علاوہ وہ جذبہ اس کے اندر پیدا ہو چکا تھا وہ اسے ان خطروں سے دھکیل رہا تھا۔

اس طرح جانے والے جاسوسوں کے استقبال اور رہنمائی کے لئے آگے آدمی ہوتا ہے جسے "کوریئر" کہتے ہیں۔ سرحد پار کروانے کے لئے جو کوریئر موجود تھا اس کا نام غلام محمد تھا وہ پچھلے پانچ چھ سال سے پاکستانی انٹیلی جنس کے لئے کام کر رہا تھا اس کے فرائض میں پاکستانی جاسوسوں کو بحفاظت سرحد پار پہنچانا اور واپس لانا تھا۔ غلام محمد کو سرحد پار کا علاقہ اور اس کے لوگ بخوبی جانتے تھے اور یہی اس کی کامیابی تھی کہ اس نے اپنے اوپر سمگلنگ کا خول چڑھا کر اپنی اصلیت کو چھپا رکھا تھا اور وہاں کے لوگوں میں مقبول تھا۔

غلام محمد اور احمد خاں کو جہاں اکٹھے ہونا تھا ہوئے اور وہاں انٹیلی جنس کے آفیسر نے انہیں آخری ہدایات دیں اور خدا حافظ کہہ کر انہیں ان رینجرز کے حوالے کر دیا جو اسی کام کے لئے وہاں موجود تھے۔

"میرے دوستو!" انٹیلی جنس کے آفیسر نے کہا: "تم میرے حکم سے نہیں جا رہے اس وقت یہ بھول جاؤ کہ تمہیں ایک افسر حکم دے رہا ہے تم خدا کے حکم سے جا رہے ہو۔ اپنے ملک کی روح تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جانتے کہ دشمن کے مقابلے میں ہمارے پاس اسلحہ بارود کتنا کم ہے اس کمی کو صرف تم پورا کر سکتے ہو تمہارے پاس ایمان کی قوت موجود ہے اور یہی قوت تمہیں فتح دے گی جاؤ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

سورج غروب ہونے کے بعد جب شام تاریک ہونے لگی تھی گوشت پوست کے چار انسان دشمن کی سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر قدم انہیں موت کے قریب لئے جا رہا تھا۔ ان پر خاموشی طاری تھی اور ایسی خاموشی جس میں طوفان پنہاں ہوتے

ہیں۔ چلتے چلتے دونوں رینجرز رک گئے۔ انہوں نے کہا۔ دوستو ہمارا سفر تمہارے ساتھ یہیں تک تھا۔ ممکن ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ جاتے مگر کام کام میں فرق ہوتا ہے۔ یہ سفر تمہیں اکیلے ہی طے کرنا ہوگا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا غلام محمد اور احمد خان چل پڑے۔ رینجرز کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر شام کی تاریکی نے انہیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

غلام محمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ خطرہ کہاں کہاں ہے۔ ایک تو بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس تھی اور انٹیلی جنس یونٹیں بھی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ کھیتوں میں کوئی بظاہر بے ضرر سا کسان گھومتا پھرتا کسان نہیں ہو سکتا وہ انٹیلی جنس کا ہی آدمی ہوگا۔ اگر آپ دشمن کے ملک میں چلے جائیں تو وہاں کے پتھر اور مٹی بھی آپ کے دشمن ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتے اس مقام تک پہنچ گئے۔ جہاں غلام محمد نے احمد خان کو چھپا کر آگے کے حالات معلوم کرنے تھے۔

غلام محمد نے احمد خان کو ایک جگہ بٹھا دیا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ غلام محمد جانتا تھا کہ یہ جگہ محفوظ ہے۔ اس نے احمد خان سے کہا کہ جنگ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ اس لئے تمہارا کام ناممکن کی حد تک دشوار ہو گیا ہے۔ یہاں کسی جانور پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تم بیٹھو، چوکنے رہنا۔ میں آگے کے حالات اور ماحول دیکھ آؤں۔ احمد خان کے لئے اس کی باتیں نئی نہیں تھیں۔ وہ دو بار پہلے بھی ان خطروں سے گزر چکا تھا۔ گیا بھی تھا واپس بھی آیا تھا۔ اس نے ہنس کر غلام محمد سے کہا کہ تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے تمہاری فکر رہے گی لیکن یہاں احمد خان کا تجربہ اسے دھوکہ دے رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کچھ عرصے سے غلام محمد وہ غلام محمد نہیں رہا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ اب وہ اپنا ایمان اور ضمیر فروخت کر چکا ہے اور اب اس کے چہرے پر ایک نہیں دو نقاب ہیں ایک بھارت کا ایک پاکستان کا۔

اس کہانی کا یہ حصہ مجھے کچھ عرصہ بعد پتہ چلا تھا۔ یہ میں آپ کو اس کے ساتھ ہی سنا دیتا ہوں۔ غلام محمد حالات دیکھنے نہیں جا رہا تھا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کی خفیہ چوکی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں اسے احمد خان کا سودا کرنا تھا غلام محمد ڈبل کراس (دوغلی جاسوسی) کر رہا تھا۔ اس طرح وہ دونوں ملکوں کی انٹیلی جنس سے پیسے کما رہا تھا۔

غلام محمد ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اسے کسی کی کھانسی کی آواز سنائی دی جو کھانسی نہیں تھی۔ ایک اشارہ تھا۔ ایسے اشارے عموماً سمگلر اور جاسوس ہی سمجھ سکتے ہیں۔ غلام محمد رک گیا ایک آدمی اس کے قریب پہنچا۔ غلام محمد نے اسے پہچان لیا۔ وہ چونی لال تھا۔

"اوہ یہ تم ہو گامے" چونی لال نے کہا۔ بھارتی علاقے میں غلام محمد گامے کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

چونی لال نے کہا۔ "کوئی شکار لائے ہو؟"

"نہ یار! شکار کہاں!" غلام محمد نے جواب دیا۔ "آج تو ویسے ہی آ گیا ہوں۔"

"اوہ گامے۔" چونی لال نے اسے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "ہمارے ساتھ بھی چکر بازی!"

اب غلام محمد اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے ساتھ کوئی شکار نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی آیا ہے۔ لیکن چونی لال نے اسے احمد خان کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ چونی لال کوئی عام قسم کا آدمی تو نہیں تھا جو غلام محمد پر فوراً یقین کر لیتا وہ بھارتی انٹیلی جنس کا "ٹاؤٹ" تھا۔ جس کا یہی کام تھا کہ آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھے اور اپنے مطلب کے آدمی ان میں سے تلاش کرتا رہے۔ غلام محمد کو تو وہ جانتا ہی تھا اور اس کی اب کوشش یہ تھی کہ غلام محمد جس پاکستانی جاسوس کو ساتھ لایا ہے وہ اس کے حوالے کر دے تاکہ اسے وہ خود اپنی انٹیلی جنس کے حوالے کرے اور انعام و اکرام حاصل کرے۔

غلام محمد کو خیال آ گیا کہ جو کام وہ خود کر سکتا ہے، وہ چونی لال کے حوالے کیوں کرے۔ لیکن چونی لال اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ چونی لال نے اسے کہا کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے شکار کسی جھاڑی کے پیچھے بٹھایا ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اکیلا نہیں میرے ساتھ جو کوئی بھی ہیں وہ خالی ہاتھ نہیں اور تم یہ بھی نہ بھولو کہ تم میرے ملک میں ہو شکار تم نہیں دو گے میں خود جا کر لے لوں گا۔

غلام محمد وہاں لڑائی جھگڑے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے چونی لال سے کچھ بے بسی کے سے عالم میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ جو کوئی بھی تھا وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو جا کر خود پکڑ لو۔ میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔

چونی لال نے بلند آواز سے کہا۔ "چلو وائے!" اور وہ چل پڑا۔ غلام محمد کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ دو تین آدمی تو ضرور ہوں گے۔ غلام محمد جلدی ہارنے والا نہیں تھا، اگر جاسوس اتنی جلدی ہار جائے تو وہ اپنا کام کبھی بھی نہ کر سکے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہار کا مطلب گرفتاری، غیر انسانی اذیتیں اور موت ہے۔ جونہی چونی لال اس کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ وہ دوسری طرف بڑی تیزی سے چل پڑا وہ راستہ چھوٹا کر کے احمد خان تک پہنچنے کی کوشش میں تھا۔

احمد خان غلام محمد پر بھروسہ کئے اطمینان سے وہیں بیٹھا تھا۔ جہاں وہ اسے بٹھا گیا تھا۔ اسے جب قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا کہ اس کی طرف آنے والا ایک نہیں تین چار آدمی ہیں جو سایوں کی طرح اسے نظر آ رہے تھے۔ احمد خان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کے قابل تھیں۔ اسے شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ وہاں سے سرک کر ایک طرف ہوا آنے والے بڑی تیزی سے اس طرف آ رہے تھے۔ اسے ایک للکار سنائی دی۔ "جو کوئی بھی ہو اٹھ کر ہمارے سامنے آ جاؤ۔" اب احمد خان کو یقین ہو گیا کہ غلام محمد دھوکے میں آ گیا ہے وہ اٹھا اور اس نے بھاگنے کی

کوشش کی۔ بیک وقت دو تین گولیاں فائر ہوئیں احمد خان نے محسوس کر لیا کہ ایک یا دو گولیاں اس کی ٹانگ میں سے گزر گئی ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی جھکتا ہوا ان سرکنڈوں میں سے نکل کر اس طرف ہو گیا۔ جدھر چونی لال اور اس کے آدمیوں کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ اب چونی لال اور اس کے آدمی اسے سرکنڈوں میں تلاش کرتے رہے اور احمد خان رینگتا سرکتا کچھ دور نکل گیا۔

غلام محمد نے گولیوں کے دھماکے سنے تو اسے افسوس ہوا کہ اس کا انعام واکرام ہاتھ سے نکل گیا ہے اس کا دوسرا نقصان یہ تھا کہ چونی لال اس کے خلاف رپورٹ کرے گا کہ غلام محمد بھارتی انٹیلی جنس کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسے گرفتاری بھی کیا جاسکتا تھا اور اسے ہمیشہ کے لئے بلیک لسٹ بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے دم رکنے لگے۔ وہ سرحد کی طرف چل پڑا کہ کہیں وہ بھی نہ مارا جائے اندھیرے میں اس نے اچانک دیکھا کہ کوئی لنگڑاتا ہوا اس طرف آرہا ہے وہ آگے بڑھا دیکھا تو وہ احمد خان تھا۔

احمد خان نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ غلام محمد نے کہا کہ میں خود حیران ہوں کہ کیا ہوا ہے۔ اب غلام محمد نے سوچا کہ احمد خان کو وہ خود انٹیلی جنس کے حوالے کرے لیکن چونی لال اس کے آدمیوں کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں۔ اس کے دماغ میں ایک سکیم آگئی، اس نے احمد خان کو ساتھ لیا۔ لیکن احمد خان چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا احمد خان نے پوچھا اب کہاں کا ارادہ ہے؟ غلام محمد نے جواب دیا کہ میرا فرض ہے کہ تمہیں واپس پہنچاؤں لیکن غلام محمد کی نیت کچھ اور تھی۔ وہ اس علاقے سے واقف تھا۔ میل ڈیڑھ میل دور ایک خانقاہ تھی، جو چرسیلوں، بھنگیوں کا اڈہ تھا۔ غلام محمد کبھی کبھی یہاں کش لگانے آجاتا تھا۔

یہ ایک معمولی سی خانقاہ تھی جو اب اڈہ ہی بن کے رہ گئی تھی۔ قریب کے گاؤں میں دو تین گھر ہی مسلمانوں کے رہ گئے تھے جو بے چارے صرف نام کے مسلمان تھے۔

ان کے بچوں کے نام بھی ہندوؤں سکھوں جیسے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ تو اب مسجد کو بھی بھول گئے تھے۔ خانقاہ پر وہ کیا جاتے۔

احمد خان کو اس خانقاہ تک پہنچا کر اس نے قبر کے قریب بٹھا دیا۔ اپنی چادر پھاڑ کر اس کے ٹانگ کے زخم پر باندھ دی۔ خانقاہ کا متولی ان کی آواز سن کر وہاں آگیا۔ متولی غلام محمد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن وہ اسے ہندو سمجھتا تھا اور متولی یہ بھی جانتا تھا کہ گاما سمگلر ہے جو کبھی کبھار متولی کو چرس کی دو چار گولیاں دے جاتا تھا۔ غلام محمد نے متولی سے کہا کہ یہ میرا ساتھی ہے زخمی ہو گیا ہے۔ متولی نے کوئی سوال نہ کیا وہ جانتا تھا کہ یہ سمگلر ہیں۔ ان پر کبھی کبھار گولی چل جاتی ہے۔ اس نے احمد خان کو اٹھایا اور خانقاہ کے ساتھ اپنے کوٹھے میں لے گیا اور اپنے بستر پر لٹا دیا۔

غلام محمد متولی اور احمد خان سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ واپسی کا بندوبست کرتا ہے۔ "دیکھتا ہوں کہیں سے کوئی گدھا گھوڑا مل جائے۔" لیکن وہ انٹیلی جنس کی ایک چوکی کی طرف جا رہا تھا۔

چوکی پر پہنچا تو اس نے ہندو کیپٹن کو اپنا منتظر پایا۔ جسے رات والے فائرنگ کے واقعہ کی اطلاع مل چکی تھی۔ اب ہندو کیپٹن اس پر برس پڑا کہ تم آگ کے ساتھ کھیل رہے ہو مجھے رپورٹ مل چکی ہے کہ رات تم نے ہمیں کیا دھوکہ دیا ہے۔

غلام محمد نے جھوٹ کی تلوار کو جھوٹ سے کاٹنا چاہا۔ اس نے کہا کہ میں نے نہیں بلکہ چونی لال نے رات کو چند روپوں کے انعام کے لالچ میں ایک پاکستانی کو بھگا دیا ہے اور ایک زخمی پڑا ہے۔ کام کا آدمی وہ تھا جو بھاگ گیا ہے۔ چونی لال نے میرے ساتھ رات کو زیادتی کی کہ میں دونوں پاکستانیوں کو آپ کے پاس لا رہا تھا۔ میں ان پاکستانیوں کے ساتھ نکل آیا تو چونی لال کے آدمیوں نے ہم پر فائرنگ کی۔ دونوں پاکستانی بھاگ نکلے۔ چونی لال الگ غائب ہو گیا۔ میں ساری رات پاکستانیوں کو ڈھونڈتا رہا۔ ان میں

سے ایک زخمی حالت میں پڑا ملا۔ دوسرا نہ ملا۔ وہ یقیناً بھاگ گیا ہے۔ زخمی کو میں ایک جگہ چھپا آیا ہوں میں اسے اپنے ساتھ اس لئے نہیں لایا کہ پھر کہیں چونی لال راستے میں نہ حائل ہو جائے۔ میں اتنی مشکل سے جو اپنا شکار لایا ہوں وہ چونی لال کے کھاتے میں کیوں ڈالوں۔

ہندو کیپٹن غلام محمد کی بات مان گیا۔ اس نے چونی لال کو دو چار گالیاں بھی دیں اور کہنے لگا کہ میں تمہارے سامنے چونی لال کو جوتے مار دوں گا۔ تم اس آدمی کو لے آؤ۔

غلام محمد خانقاہ کی طرف چل پڑا جو وہاں سے کم و بیش تین چار میل دور تھی۔ جب وہ خانقاہ پر پہنچا تو صبح کی سفیدی صاف ہو چکی تھی۔ وہ متولی کے کوٹھے میں داخل ہوا تو وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی اور احمد خان چائے پی رہا تھا۔ اس کے آگے مکئی کی روٹی بھی رکھی تھی۔ یہ متولی کا انتظام تھا۔ اس نے احمد خان کے لئے ناشتہ اپنے گھر سے منگوایا تھا۔

غلام محمد اس بڑھیا کے جانے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے کہا کہ یہ لڑکا بتاتا نہیں کہ یہ کس طرح زخمی ہوا ہے۔

"اماں جی! کیا بتائیں" غلام محمد نے مایوسی کے عالم میں کہا اور ایک گاؤں کا نام لے کر بولا۔ "ہم دونوں بھائی رات کو ایک ماتم پر کسی گاؤں جا رہے تھے راستے میں سکھوں نے جو شراب پیے ہوئے تھے ہم سے پوچھا کون ہو؟ ہم نے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں تو ایک سکھ نے قہقہہ لگایا اور پستول نکال کر گولی فائر کر دی اور اسے زخمی کر کے ہنستے ہوئے چلے گئے۔"

بڑھیا نے لمبی آہ بھری اور کہنے لگی یہاں ہماری زندگی ہے ہی کیا۔ جیسے مکھی ماری ایسے یہاں مسلمان کو مار دیتے ہیں تمہیں وہ وقت یاد ہو گا جب ملک تقسیم ہو رہا تھا۔

بڑھیا کی زبان رواں ہو گئی جیسے اس کا رکا ہوا غبار بے قابو ہو کر نکل رہا ہو۔ وہ کہنے لگی۔

"میں وہ وقت ساری عمر نہیں بھول سکوں گی۔ میں اس گاؤں کی رہنے والی نہیں۔ یہاں سے گیارہ بارہ میل دور گوبند پورہ کی رہنے والی ہوں۔"

غلام محمد یا نام سن کر ذرا سا چونکا جیسے اسے کوئی بڑی پرانی بات یاد آ گئی ہو۔ کہنے لگا گوبند پورہ کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ لیکن بڑھیا نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور اپنی سناتی چلی گئی۔

"رات کا وقت تھا کہ میرے گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سکھوں نے حملہ کر دیا تھا مسلمان ایک تو سوئے ہوئے دوسرے نہتے اور تیسرے تعداد تھوڑی، کر ہی کیا سکتے تھے۔ جس کا جدھر منہ آیا بھاگ اٹھا سکھوں نے کسی کو بھاگنے نہ دیا۔ برچھیوں اور کرپانوں سے کاٹتے چلے گئے۔ بچوں تک کو انہوں نے بخشا۔ دودھ پیتے بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے چھینا اور برچھیوں کی انیوں میں اڑس کر قہقہے لگائے۔ جوان لڑکیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے گئے۔ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ میں نے بعد میں سنا تھا کہ کچھ مسلمان لڑکیاں اپنی عصمتیں بچانے کے لئے کنوؤں میں کود گئی تھیں۔ بعض نے اپنے آپ کو اپنے جلے ہوئے مکانوں کے شعلوں کے نذر کر دیا تھا۔ لیکن ایسی خوش قسمت کم ہی تھیں زیادہ تر کو سکھ اٹھا لے گئے تھے۔

"یہ تو سینکڑوں سکھوں کا حملہ تھا۔ جو رات کو ہوا۔ دن کے وقت میرے پڑوس کی ایک نوجوان لڑکی جس کا نام رضیہ تھا گاؤں سے نکلی تو دن دہاڑے سکھوں نے اٹھا لی، مسلمان چیختے چلاتے رہ گئے سکھ لڑکی کو لے گئے۔

غلام محمد یوں چونکا جیسے اسے کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ لیا ہو۔ گھبرائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ اماں جی! آپ نے کیا نام بتایا ہے۔ رضیہ"

"ہاں بیٹے! میں اس کا نام کبھی نہیں بھول سکتی۔" بڑھیا نے کہا۔ "بے چاری کا کوئی بڑا بھائی گھر نہیں تھا کہ اسے آگے بڑھ کر چھڑاتا۔ چھوٹا سا ایک ہی بھائی تھا مجھے اس کا

بھی نام یاد ہے غلام محمد نام تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ اپنے دروازے میں کھڑا اپنی بہن کے لئے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس پر ترس کھانے والا کوئی نہ تھا۔ بے چاروں کا باپ اندر بیمار پڑا تھا اور ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جا کر دیکھا وہ مرا ہوا تھا۔ بیٹی کے صدمے سے مر گیا تھا۔ اس رات حملہ ہوا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میری قسمت اچھی یا بری۔ میں انہی شعلوں میں سے اس چیخ و پکار میں سے اور ان سکھ وحشی درندوں میں سے زندہ سلامت نکل آئی۔

"میں اندھیرے میں دوڑتی چلی گئی۔ گری اٹھی پھر دوڑی اور پھر اس خانقاہ کے دروازے پر ایسی گری کہ اٹھ نہ سکی۔ صبح ان ملنگوں نے مجھے اٹھایا۔ مجھ پر نیم بے ہوشی طاری تھی اور اسی کوٹھے میں چارپائی کے نیچے انہوں نے مجھے پھینک دیا۔

صبح ہوئی تو باہر سے مجھے آوازیں سنائی دیں۔ "او ملنگو! یہاں کوئی مسلمان تو آ کر نہیں چھپا۔ ایک ملنگ نے کہا۔ "خالصہ جی ہم کہاں کے مسلمان ہیں کہ ہمارے پاس کوئی چھپنے آئے گا۔ ہمارا دین مذہب تو چرس اور بھنگ ہے۔ سکھ چلے گئے......

"مجھے معلوم نہیں وہ قیامت کس طرح آئی اور کس طرح چلی گئی اور کتنے دن بیت گئے۔ میں حیران ہوں ان ملنگوں پر جو کہتے تھے کہ چرس اور بھنگ ہمارا مذہب ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی لڑکی سمجھ کر چھپائے رکھا۔ کھانے کو دیتے رہے اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے میری رضامندی سے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ میں پاگلوں کی طرح اٹھ کر بھاگتی تھی کہ میں اپنا گوبند پورہ دیکھوں گی اور یہ لوگ مجھے بتے تھے کہ وہاں اب راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہ گیا اور اس راکھ کے نیچے تمہارے خاندان کی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن میرے پاگل پن میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک دن ایک بوڑھے ملنگ نے مجھے حقے کا کش لگوا دیا تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دکھ اور غم نہیں رہا۔ لمبی باتوں کو چھوڑو۔ سیدھی بات ہے کہ انہوں نے مجھے چرس پلا دی تھی۔ اس کے سوا

علاج ہی کیا تھا......

"ایک سال گزرا تو میں نے یہ قبول کیا کہ اب میری یہی زندگی ہے۔ میرا ایک بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے چرس چھوڑ دی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا خاوند ملنگ ہی ہے۔ لیکن مسلمان تو ہے سکھ نہیں ہے۔ مگر بیٹے! گوبند پورہ میرے دل سے اترا نہیں۔ رضیہ کو میں بھول نہیں سکتی۔ میں اس رات کو نہیں بھلا سکتی۔ ویسے دل ہر طرح مطمئن رہتا ہے۔ لیکن ایک کانٹا سا دل میں چبھا رہتا ہے کہ مسلمان اپنی عزت، غیرت کو کیوں بھول گئے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ پاکستانیوں کو کیا ہو گیا ہے میں نے ان پڑھ چرسیوں، بھنگیوں میں عمر گزار دی ہے حکومتوں کے معاملے حکومت کرنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ میں اتنا کہتی ہوں کہ مسلمان کو اپنی عزت اپنی حیرت بیچنی نہیں چاہیئے۔ ان سے تو وہ غیرت والی تھیں جو کنوؤں اور شعلوں میں کود گئیں۔ میں بھی کنوئیں میں ہی کود گئی تھی سمجھو کہ ایک ملنگ کو اپنا خاوند بنا لیا اور خوش ہو گئی کہ چلو مسلمان ہے سکھ نہیں۔"

بڑھیا نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ غلام محمد نے اچانک کہا۔ "اٹھو احمد خان! ہمیں فوراً جانا ہے۔"

اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ دن دھاڑے دشمن کے علاقے سے نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ موت اور صرف موت۔ اس نے احمد خان کو کندھے پر ڈالا اور باہر نکلا اور اندھا دھند سرحد کی طرف چل پڑا۔ سب سے بڑا خطرہ جو اس کی طرف آ رہا تھا وہ دو آدمیوں کی صورت میں تھا جو ہندو کیپٹن نے اس طرف بھیجے تھے کہ جا کر دیکھو گاما آیا کیوں نہیں؟ وہ ایک زخمی کو لا رہا ہے۔ آخر مسلمان ہے دھوکہ نہ دے جائے۔

سرحد میل ڈیڑھ میل دور رہ گئی تھی۔ غلام محمد ایک جوان آدمی کے بوجھ تلے

دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دور پیچھے سے اسے للکار سنائی دی۔ کوئی اسے رکنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ وہ اور تیز دوڑنے لگا احمد خان نے اسے کہا کہ اتنا تیز نہ دوڑو گر پڑو گے۔ احمد خان نے یہ بھی کہا کہ رک جاؤ میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔

غلام محمد نے غصے سے کہا۔ ”نہیں خاموش رہو احمد خان! مجھے چلنے دو۔“

انہیں اب اپنی ایک سرحدی چوکی نظر آنے لگی تھی۔ پیچھے سے پھر للکار سنائی دی۔ رک جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے۔“ وہاں کچھ کھڈ نالے بھی تھے زمین اونچی نیچی تھی۔ جس نے غلام محمد کی خاصی مدد کی۔ یوں لگتا تھا جیسے غلام محمد میں کوئی مافوق الفطرت قوت عود کر آئی ہو یا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو۔ وہ تو دوغلا ایجنٹ تھا لیکن وہ پاکستان کے راستے پر دوڑا آ رہا تھا۔

ایک خشک برساتی نالے سے اوپر چڑھا تو اسے اپنے ہاتھ زمین پر ٹیکنے پڑے اوپر جا کر جب اس نے سامنے دیکھا تو اپنی سرحدی چوکی دو ہاتھ ہی پر نظر آ رہی تھی لیکن پیچھے سے تین چار گولیاں اکٹھی فائر ہوئیں۔

احمد خان نے اس سے پوچھا۔ ”غلام محمد! تم ٹھیک تو ہو۔ گولی تو نہیں لگی؟“

”نہیں۔ نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ گولی تمہیں تو نہیں لگی۔“ غلام محمد بولا۔

پیچھے سے شاید اور گولیاں بھی آئیں۔ کسی جذباتی رینجر نے جس نے انہیں پہچان لیا تھا۔ احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس طرف ایک دو راؤنڈ فائر کر دیئے اس سے غلام محمد اپنے عقب کے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔ غلام محمد جب چوکی کے قریب پہنچا تو اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ پھر بھی چلتا گیا اور چوکی سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر منہ کے بل گرا۔

احمد خان ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ اپنی سرحد میں داخل ہو چکے تھے۔ تین چار پاکستانی رینجرز دوڑے آئے ایک حوالدار نے غلام محمد کو پہچان لیا۔ دیکھا گیا تو اس کے

تمام کپڑے خون میں بھیگ رہے تھے۔ دو تین گولیاں اس کے کولہوں میں سے گزر گئی تھیں۔ اسے اٹھانے لگے تو اس نے کہا۔ ”نہیں، میں اب ہمیشہ کے لئے گر پڑا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں پاک مٹی میں آ کر گرا ہوں۔“

اس نے احمد خان کی طرف دیکھا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے احمد خان سے کہا۔ ”تم نے اس بڑھیا کی کہانی سنی تھی نا اس نے جس رضیہ کا نام لیا تھا وہ میری بہن تھی اور جو چھوٹا سا غلام محمد دروازے میں کھڑا اپنی بہن کے لئے بلک بلک کر رو رہا تھا وہ میں تھا۔ مجھے اس بڑھیا کی جوانی یاد ہے۔ اس نے میری غیرت کو بیدار کر دیا ہے میں تو اپنا ایمان بیچ چکا تھا۔ تمہیں میں بھارتی انٹیلی جنس کے حوالے کرنے جا رہے تھا اچھا ہوا خدا نے بڑھیا کو بھیج دیا اور اچھا ہوا کہ میں مر رہا ہوں۔ ایمان بیچنے والوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں لیکن میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اب شاید خدا میرے گناہ معاف کر دے اور میری جان کا نذرانہ قبول کر لے۔ بڑھیا نے پوچھا تھا کہ مسلمانوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔

احمد خان! غیرت مرا نہیں کرتی غیرت کو کوئی جگانے والا تو ہو۔“ اور اسکی آنکھیں پتھرا گئیں۔

دھندہ

کرموواردا تیے سے میری پہلی ملاقات بڑی ہنگامہ خیز تھی!

میں موٹر سائیکل پر کسی کام سے جارہا تھا لاہور کی ایک ماڈرن آبادی کی کشادہ اور مضبوط لیکن ویران سڑکوں پر میں بظاہر سامنے سے آنے والی ٹریفک سے لاپرواہ موٹر سائیکل اڑائے چلا جارہا تھا۔

گرمیوں کی جان لیوا دھوپ اور اس پر گرم لو۔ مجھے علم تھا کہ اس قیامت کی گرمی میں ان شاندار اور ٹھنڈے بنگلوں سے کوئی باہر جھانکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرے گا۔ سڑکوں پر انسان تو کیا کوئی گاڑی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن اچانک ہی میں گڑبڑا کر رہ گیا اگر چند سیکنڈ کی غفلت ہو جاتی تو میں کسی پولیس سٹیشن میں اور سڑک کے درمیان موجود راہگیر ہسپتال میں ہوتا۔

وہ اچانک میرے سامنے آگیا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے اس کی سائیکل گری پڑی تھی اور قریباً درمیان تپتی ہوئی سڑک پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر موٹر سائیکل روک لی۔ پہلے تو جی چاہا کہ جہنم میں جائے سب کچھ میری بلا سے۔ چپ چاپ نکل جاؤں۔ اگر یہ زخمی ہے تو میں نے نہیں کیا۔ اگر کوئی مریض ہے تو بھی میں اس کی

مسیحائی کرنے سے رہا۔ لیکن انسانی ہمدردی کا جذبہ آڑے آیا اور میں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے پیدل چلتا اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ شاید مرگی کا دورہ تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کروں کیا نہ کروں؟ پھر اچانک جیسے ایک کوندا سا میرے ذہن میں لپکا۔ مجھے یاد آگیا بچپن میں سنا تھا کہ مرگی کے مریض کو اگر چمڑے کا جوتا سونگھایا جائے تو وہ نارمل ہو جاتا ہے۔

اسی خیال کے تحت اپنے پاؤں پر نظر ڈالی تو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کہ میرے پاؤں میں ربڑ کے بجائے کینوس کے جوتے تھے۔ یہ مشکل بھی اسی نے حل کر دی کیونکہ مرگی زدہ نے پاؤں میں دیہاتی گرگابی پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کے پاؤں سے جوتی کھینچ کر الگ کی اور اسے سونگھائی چند ہی منٹ بعد وہ نارمل ہو گیا۔

پسینے میں وہ بری طرح نہا رہا تھا میری اپنی حالت بھی اس سے کوئی مختلف نہیں تھی کسی نہ کسی طرح اسے سہارا دے کر میں قدرے سایہ دار جگہ پر لے آیا۔ اب ایک نئی بپتا آن پڑی۔ اس نے اوسان بحال ہوتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا میرا جی چاہا کہ فوراً بھاگ جاؤں لیکن اب تو بھاگنے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں رکا رہا اور اسے حوصلہ دے کر چپ کروایا۔

"بابو جی! مزدور آدمی ہوں۔ صبح سے مزدوری ڈھونڈ رہا تھا گھر بچہ بیمار ہے لیکن میری قسمت! یہ کہہ کر اس نے دوبارہ رونے کا اسٹارٹ لینا چاہا۔ لیکن اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں تھا۔

میں نے اپنی جیب سے دل کڑا کر کے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کی مٹھی میں "زبردستی" تھما دیا کیونکہ موصوف خیرات لینے سے انکاری تھی۔ اسے حوصلہ دیا اور خدا خدا کر کے گھر پہنچا۔

اس واقعے کے تقریباً تین چار ماہ بعد کا ذکر ہے کہ اپنے ایک عزیز کی دکان پر کسی کام سے بیٹھا تھا۔ یہ دکان خاصی آباد اور کاروباری لحاظ سے مصروف مارکیٹ میں تھی۔ دکان کے نزدیک دھڑام سے کسی شے کے گرنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دیکھا تو ایک بیچارہ گول گپے بیچنے والا اپنے خوانچے سمیت جو اس نے سر پر اٹھا رکھا تھا زمین بوس تھا۔ اس کے گول گپے کھٹائی والے مٹکے اور لوہے کی تاروں کا خوانچہ ٹوٹ چکا تھا۔

میرا عزیز دکاندار بھاگ کر میرے ساتھ اس کی مدد کو لپکا ہم نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ میرے عزیز دکاندار کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ مقامی کارندوں کے تعاون سے چندہ کر کے اس کا نقصان پورا کرنے کی مہم شروع کرنے لگے۔ ابھی انہوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار وہاں اکٹھے ہو جانے والے دکانداروں کے سامنے کیا ہی تھا کہ ایک نوجوان مجھے پیچھے ہٹا کر سامنے آ گیا۔

"میاں جی! کیا کر رہے ہو۔" اس نے میرے عزیز کی طرف دیکھنے کے بجائے مظلوم گول گپے والے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ تو فراڈیا ہے۔"

اب جو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو یاد آ گیا کہ یہی وہ موصوف ہیں جو اس سے پہلے مرگی کا ڈرامہ رچا کر مجھے بے وقوف بنا چکے ہیں۔

یہ میری اور کرمو وارداتیے کی پہلی "باقاعدہ ملاقات" تھی۔ اپنی شخصیت کے انکشاف پر اس نے نہ تو برا منایا نہ کسی گھبراہٹ کا اظہار کیا، بلکہ اس نوجوان کو برا بھلا کہنے لگا۔ جس نے اس کی اصلیت ظاہر کر دی تھی۔ وہ گلہ کر رہا تھا کہ انکشاف کرنے والے نے اس کی دیہاڑی مروا دی ہے۔

اسی نوجوان نے جب یہ بتایا کہ اس فراڈیے کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ تو میں متجسس ہوا۔ یہ جاننے کے لئے کہ آخر وہ ایک معزز گھرانے کا فرد ہوتے ہوئے فراڈیا کیوں بن گیا۔ اس نوجوان سے جب میں نے کرمو کا پتہ دریافت کیا تو وہ قہقہہ لگا

کر ہنس پڑا۔ اور بولا۔ "جناب آپ شریف آدمی ہیں کس چکر میں پڑنے لگے ہیں۔"

نوجوان نے نصیحت اچھی کی تھی۔ لیکن میں اپنی متجسس طبیعت کے ہاتھوں مجبوراً اس چکر میں پڑ گیا۔ کرمو کی شکل سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی غلط آدمی ہے عام حالات میں وہ ایک معزز نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ جتنا کامیاب فراڈیا تھا اس سے مجھے یہ حیرت ضرور ہوئی کہ وہ ایسے گھٹیا فراڈ کیوں کرتا ہے؟ کوئی لمبا ہاتھ کیوں نہیں مارتا؟

یہی سوال لے کر ایک روز میں اس کے گھر پہنچا۔

اندرون شہر کی پر پیچ اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں دھکے کھانے کے بعد جب میں ایک بوسیدہ مکان تک پہنچا تو دروازہ کھٹکھٹانے پر جس شخصیت نے میرا استقبال کیا اسے دیکھنے کے بعد یقین نہیں آتا تھا کہ کرمو اس بزرگ عورت کا بیٹا ہو گا۔ میرے منہ سے کرمو کا نام سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بے چاری نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں اس کا کوئی "شکار" ہوں، لیکن میرے یہ تسلی دلانے پر کہ "ایسی کوئی بات نہیں" اس بے چاری نے سکھ کا سانس لیا۔

کرمو، جب اس اطلاع پر باہر آیا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے تو اسے یہی امید تھی کہ آنے والا یا تو تھانے کا کوئی پیامبر ہو گا یا پھر اس کا کوئی "شکار"، جس نے کرمو کا سراغ لگا لیا ہے۔ لیکن اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گیا۔

"کیا بات ہے جناب؟" اس نے بڑے شریفانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کچھ بات نہیں بھائی صاحب بس آپ سے ملنے کا شوق ہے۔"

یہ میرا اور کرمو وارداتیے کا پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ اس کی حیرانگی اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ آخر میٹرک پاس فراڈیا تھا اور انسانی نفسیات پر خاصی دسترس بھی اسے حاصل تھی۔ جلدی سمجھ گیا کہ میں نہ تو کوئی مخبر ہوں نہ خفیہ پولیس کا آدمی بلکہ اس کا ایک طرح سے "مداح" ہوں۔

میں اسے چائے کے ایک معمولی سے ہوٹل پر لے آیا۔ جہاں پہلے سے موجود لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ شکل سے تو میں بہر حال شریف آدمی نظر آ رہا تھا اور کسی شریف آدمی کا کرمو وارداتیے کے ساتھ کیا کام؟ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے مجھے صاف صاف بتادیا کہ وہ اپنے متعلق کوئی بات مجھے نہیں بتائے گا۔

بڑا گہرا آدمی تھا۔ میرے لاکھ کریدنے اور گھما پھرا کر بات کرنے کے باوجود میرے قابو نہ آیا۔ ہم کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ وہ میٹرک پاس ہے۔ میں نے کہا اچھا صرف یہی بتا دو کہ اتنے کامیاب اداکار ہونے کے باوجود تم صرف معمولی اور گھٹیا قسم کے فراڈ ہی کیوں کرتے ہو۔

میری بات سن کر اس نے دانشوروں کی طرح سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ "سر! چھوٹی کشتیوں کو کنارے کے نزدیک ہی رہنا چاہئے۔ یہ بڑا گہرا سمندر ہے۔ بڑے بڑے مگرمچھ موجود ہیں اس میں۔ میرے جیسی چھوٹی مچھلی کی ان کے نزدیک اہمیت ہی کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یار اتنی سمجھ داری کی باتیں کرتے ہو تمہارا تعلق بھی شریف گھرانے سے ہے۔ پھر کیوں ایسے گھٹیا کام کرتے ہو، لعنت بھیجو۔ میں تمہیں نوکری دلا دیتا ہوں۔"

میری بات سن کر اس نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "سر! اب میں اس کمبل کو چھوڑنا بھی چاہوں تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ ایک مرتبہ پولیس کے کاغذوں میں آنے کے بعد کوئی لاکھ شریف بنتا رہے یہ لوگ کبھی تسلیم نہیں کرتے کبھی معاف نہیں کرتے اسے۔"

یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک جہان کی یاسیت سمٹ آئی۔ میں نے اسے

مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔ کئی دن تک کرمو میرے ذہن پر سوار رہا۔ پھر میں کاروبار حیات میں ایسا الجھا کہ کرمو حرف غلط کی طرح ذہن کی تختی سے مٹنے لگا۔

ایک روز وہ پھر میرے لاشعور سے نکل کر اخبار کے صفحات پر میرا منہ چڑانے لگا۔ اس مرتبہ وہ کسی کے "نوٹ دوگنے کرتے ہوئے۔" پکڑا گیا تھا۔ میں نے سرسری انداز سے خبر پڑھی اور کرمو کو یاد کر کے بھول گیا۔

اس واقعے کے تقریباً تین چار ماہ بعد میں ایک بس سٹینڈ کے نزدیک کھڑا تھا کہ ایک شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف مخاطب کیا میں گھوما اور جس شکل سے واسطہ پڑا وہ میرے اوسان خطا کر دینے کے لئے کافی تھا۔

پولیس کا سپاہی مجھ سے مخاطب تھا۔ وہ آپ کو بلا رہا ہے۔ اس نے سڑک کے ایک سائیڈ پر کھڑے تانگے کی طرف اشارہ کر کے مخاطب کیا۔

تانگے کی طرف نظر اٹھائی تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، پچھلی سیٹ پر دو سپاہی بیٹھے مجھے گھور رہے تھے میں ڈرتا ڈرتا وہاں تک پہنچا۔

تانگے کی اگلی سیٹ پر کرمو ایک سپاہی کے ساتھ منہ سر چادر میں چھپائے بیٹھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے پہچان کر تانگہ رکوایا ہو گا اور یہ بھی کہ اس کی ضروریات کیا ہیں؟

"باؤ جی اب میں یہ سارا دھندہ چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے نادانستگی میں بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا کہ کرمو جرم جس کی فطرت بن چکا تھا مجھے کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے سوچا اور پولیس کے سامنے بات کرنا مناسب نہ سمجھا، میں نے اسے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ میں کچہری اس سے ملنے آؤں گا، اس کی عدالت پوچھ کر میں چلا گیا۔

دوپہر کو جب کچہری پہنچا تو کرمو دوسرے ملزموں کے ساتھ ایک باغیچے میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ سردی اس روز کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں نے یہاں کے دستور کے مطابق چائے منگوائی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ گارد کے سپاہی چائے پینے میں مگن تھے اور کرمو آج کچھ کہے سنے بغیر ہی مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

"باؤجی!" اس نے کہا۔ "پچھلے دو مہینے سے ہاتھ بہت تنگ تھا اور نیا تھانیدار جان کو آ رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک مرتبہ جوان لوگوں کے کاغذات میں آ گیا، اس کی جان چھٹتی ہی نہیں۔ میں نے لاری اڈے پر ایک اسامی تاڑی ایک دیہاتی سا آدمی تھا۔ خدا کی قسم مجھے علم نہیں تھا کہ یہ اپنی بیٹی کا جہیز خریدنے آیا ہے۔

لالچ بری چیز ہے باؤجی! وہ بھی میری طرح لالچی نکلا اور پیسے دوگنے کروانے کے چکر میں میرے ہاتھوں لٹ گیا۔ میں نے واردات دوسرے علاقے میں کی تھی۔

خدا جانے ایک پولیس ٹاؤن نے کیسے مجھے پہچان لیا اور اگلے روز میں پکڑا گیا لیکن اس دوران ساری رقم میں نے بانٹ دی تھی۔"

اتنا کہہ کر اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے آنکھوں میں آئے آنسو ضبط کرتے ہوئے مجھے کہا۔ "باؤجی وہ بے چارہ جو میرے ہاتھ لٹا تھا دل کا مریض تھا اس غم نے اس کی جان لے لی کہ اب وہ گاؤں واپس جا کر کیا منہ دکھائے گا۔

وہ روتے ہوئے میرے سامنے قسمیں کھانے لگا کہ اسے علم نہیں تھا کہ وہ بدنصیب بوڑھا اپنی بیٹی کا جہیز خریدنے آیا ہے۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور تلقین کی کہ اگر سچے دل سے تائب ہو گیا تو اللہ اس کے گناہ ضرور بخش دے گا ضرورت اس بات کی ہے کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرے۔

باؤجی! اس نے بڑے پرعزم لہجے میں کہا۔ "کرمو وارداتیا مر گیا ہے۔ اب میں صرف کرم دین ہوں۔ صرف کرم دین۔"

میں اسے حوصلہ دے کر آ گیا۔ اس بات کی مجھے بے حد خوشی تھی کہ اللہ نے بالآخر اسے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے دی۔ وہ پہلے بھی برا انسان نہیں تھا زبردستی سے اس نے خود پر ایک خول چڑھا رکھا تھا جو بالآخر اتر گیا اور اس کی صحیح شخصیت نکھر کر سامنے آ گئی۔

اس واقعے کے بعد میں اس کی خیریت کے لئے فکرمند رہنے لگا۔ کبھی اس کی تاریخ پر بھی چلا جاتا۔ دو تین مرتبہ جیل میں بھی اس سے ملاقات کی۔ کرمو نے اب ڈاڑھی رکھ لی تھی اور باقاعدہ نمازی بن گیا تھا جو لوگ اسے جانتے تھے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کرمو بھی سدھر بھی سکتا ہے۔ وہ یہی کہتے تھے کہ یہ بھی کرمو کا کوئی نیا چکر ہے اس کے ایک واقف کار نے ایک روز مجھے بڑی رازداری سے بتایا۔

"میاں جی اس مرتبہ کوئی لمبا ہاتھ مارنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ یہ سارا چکر ہے۔ کسی بھی گاؤں میں پیر فقیر کا روپ دھار کر بیٹھ جائے گا اور دو تین مہینے ہی میں ساری عمر کی روٹیاں بنا لے گا۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ لوگ اپنی جگہ تھے بھی سچے۔ لیکن یہ میں ہی جانتا تھا کہ کرمو اب واقعی وہ نہیں رہا۔ اس حادثے نے اس پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔

دو تین سال بعد وہ ضمانت پر رہا ہو کر آ گیا۔ میں نے اس کی رہائی کے دوسرے ہی روز اس سے ملاقات کے بعد اسے اپنی توبہ پر قائم رہنے کی تلقین کر کے چلا آیا۔

گاؤں سے میری واپسی عموماً چار پانچ روز بعد ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ میں پندرہ دن تک واپس نہ آ سکا۔ واپس آتے ہی میں اس کی خیریت دریافت کرنے گیا دروازے پر حسب سابق اس کی والدہ سے ملاقات ہوئی میری شکل پر نظر پڑتے ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ میں نے انہیں دلاسہ دینا چاہا اور گھبرا گیا کہ خدا خیر کرے۔

"مار ڈالا، مار ڈالا اسے ظالموں نے مار ڈالا۔"

وہ بین کرنے لگی۔ میرا دل بھی بھر آیا کرمو اتنی جلدی مر جائے گا۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

محلے کی عورتیں بھی وہاں جمع ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر اب میری واقف بن چکی تھیں کہ میں کرمو کا واحد "شریف دوست" ہوں۔

باؤ جی! رہائی کے تیسرے ہی دن اسے پولیس شبہے میں پکڑ کر لے گئی تھی۔ ان میں سے ایک نے روتے ہوئے کہا.......... چار پانچ روز بعد جب گھر واپس آیا تو حالت بہت بری تھی۔ پہلے تو محلے کے ڈاکٹر صاحب سے دوا لاتے رہے۔ پھر ایک روز زیادہ حالت بگڑی تو ہسپتال لے گئے۔ تیسر روز کرمو مر گیا۔" وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"باؤ جی! بڑا نور آ گیا تھا اس کے چہرے پر، اللہ کی قسم باؤ جی! کرمو تو وہ رہا ہی نہ تھا

ایک اور عورت بولی اور رونے لگی۔

مجھے یاد آ گیا کرمو نے ایک روز کہا تھا -- "باؤ جی! آپ تو جانتے ہیں نا۔ ایک مرتبہ کوئی پولیس کے کاغذات میں آ جائے تو کبھی نہیں نکل سکتا۔"

مطلب کی بات

اللہ وسایا کا گھر کبھی نہ بس سکا۔ شاید یہی اس کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اس مرتبہ تو اس نے جی جان سے یہی کوشش کی تھی کہ وہ اس دنیا سے نکل جائے اور پر سکون گوشہ اپنے لئے ڈھونڈ لے جہاں اسے امان میسر آ سکے۔ اب یہ اس کا مقدر کے اس عالم بے کراں میں کوئی ایک جائے پناہ بھی اسے میسر نہ آ سکی۔ اس بھرپور زندگی کے لئے اس نے جتنی مسلسل دوڑ دھوپ کی تھی اس نے اللہ وسایا کو اب نڈھال کر دیا تھا۔

جرم اس کمبل کی طرح اللہ وسایا کے بدن سے چمٹ گیا تھا جو اتارے نہ اتر سکے۔ اس کا بچپن اور جوانی وقت کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ کوئی ماضی نہیں تھا اس کا۔ کوئی مستقبل اسے اپنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ حال کو سدھارنے کے لئے وہ اندھوں کی طرح چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن وقت نے سوائے پچھتاوے کے اس کی جھولی میں کبھی کچھ نہ ڈالا۔

اس روز جب وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک ولولہ تازہ کیلئے بیجوال پہنچا تو اسے یقین تھا کہ شاہدہ ضرور اس کی منتظر ہو گی۔ لیکن وہاں ریلوے سٹیشن پر اس کے مقدر کی

طرح بر ستی وحشت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

پاکستان کے ایک بڑے شہر کے تھانے سے ایک چھوٹے شہر کے ریلوے سٹیشن تک کا سفر اس نے یوں ہی طے نہیں کر لیا تھا۔ اس مختصر سفر میں اس کی ساری زندگی کی جدوجہد سمٹ آئی تھی۔ اس کے لاشعور میں ابھی اس کا بچپن زندہ تھا۔ وہ شام اس نے بھلائی نہیں کی تھی۔ جب مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں سے وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان پہنچنے کے لئے نکلا تھا۔

ان کے ساتھ گاؤں کے اور بہت سے لوگ تھے یہ الگ بات کہ پاکستانی سرحد تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

اس کو صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ آخری حملے کے بعد جب اس کا باپ ایک سکھ کی کرپان سے کٹ کر گرا تو وہ دیوانہ وار چیختا ہوا خوفزدہ ہو کر ایک طرف بھاگ نکلا تھا۔ پھر وہ بھاگتا ہی چلا گیا۔ زندگی کی شاہراہ پر اس کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ کھیتوں سے ایک مہاجر کیمپ تک کا سفر کتنا جان لیوا تھا۔ اس کا تصور کر کے وہ آج بھی کانپ اٹھتا تھا۔

اس کی عمر تب بمشکل آٹھ سال تھی۔ ہر روز وہاں نئے لوگ آتے اور پرانے چلے جاتے تھے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ اپنے گمشدہ عزیزوں کو کھوجتے یہاں آتے اور اپنا گوہر مقصود پا کر واپس لوٹ جاتے۔ لیکن اسے کوئی لینے نہیں آیا۔

وہ صبح ہوتے ہی کسی آنے والے کا منتظر ہو جاتا اور رات ڈھلنے پر پھر اگلے روز کسی آنے والے کے انتظار میں سو جاتا۔ دن ہفتوں اور مہینوں میں ڈھلنے لگے۔ اللہ وسایا کو یقین ہو چلا تھا کہ اسے لینے کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن اس روز وہ حیران ہی رہ گیا جب کیمپ کے انچارج نے اسے بلا کر ایک مہربان صورت سے اس کا تعارف کروایا۔

"یہی ہے اللہ وسایا"...... نوواردنے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی خوشی سے کہا اور

اپنی جگہ سے اٹھ کر حیران پریشان اللہ وسایا کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

کیمپ انچارج حیرت سے کبھی نووارد اور کبھی اللہ وسایا کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اللہ وسایا کی طرف سے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

"یہ بے چارہ مجھے کیسے پہچانے گا جناب! ساری زندگی تو میں گاؤں سے باہر رہا ہوں قسمت کی بات ہے جناب؟ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کلکتہ نوکری کرنے نہ جاتا تو میں بھوکا نہیں مرنے لگا تھا۔ لیکن...... "ہائے ری قسمت" وہ چپ ہو گیا۔

اللہ وسایا کے چھوٹے سے ذہن میں تب یہی خیال آیا تھا کہ چلو غلط فہمی ہی کی بنا پر سہی کوئی اسے لینے تو آیا۔ کیمپ انچارج بھی خوش تھا کہ بچے کا کوئی وارث تو پیدا ہوا۔ سب سے زیادہ خوشی تو نووارد کو تھی کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی اور اچھا بھلا شکار ہاتھ آ گیا۔

وہ شخص اللہ وسایا کو اپنا بیٹا بنا کر ہی گھر لایا تھا۔ لیکن بے آسرا اللہ وسایا اس کی اصلیت کو نہ جان سکا۔ یہ ہمدرد صورت آدمی انسان کے لباس میں بھیڑیا نکلا۔ اس نے جلد ہی اللہ وسایا کو اپنی لائن پر لگا لیا۔ اس جیسے دو اور بیٹے یہاں پہلے بھی موجود تھے۔

نیا نیا ملک بنا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ وہ عظیم مقاصد ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جو اس ملک عزیز کی اساس تھے۔ لٹ کر آنے والوں میں سے بہت سے خود لٹیرے بن گئے۔ انہوں نے اللہ وسایا جیسے بے سہارا لوگوں کو بھی لوٹ کا مال سمجھ لیا تھا۔

تاجو تقسیم ملک سے پہلے کلکتہ میں ورغلا کر یا اغوا کر کے لائے گئے بچوں کا ایک ایسا ہی گروہ چلا رہا تھا کہ پاکستان بن گیا۔ بادل نخواستہ اسے بھی پاکستان آنا پڑا۔ جہاں تھوڑی محنت ہی سے کام کے تین چار بچے اس کے ہاتھ آ گئے تھے۔

اس نے اللہ وسایا کے ذہن میں جلد ہی یہ بات ڈال دی کہ اسے نہ صرف خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے بلکہ اپنے چاچا کے لئے بھی کما کر لانا ہے۔ اور کمانے کا آسان

طریقہ فطری طور پر بہادر اور ذہین اللہ وسایا کو اس نے دنوں میں سمجھا دیا۔

پہلی مرتبہ جب اس نے اللہ وسایا کو ایک خالی مکان میں جس کے مکین کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ داخل کیا تو خوف سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ لیکن پہلی ہی واردات اس نے اتنی کامیاب کی تھی کہ تاجو اسے عطیہ خداوندی جاننے لگا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا۔

اللہ وسایا پھر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے پہل تو تاجو اس کے ساتھ جایا کرتا تھا پھر وہ دور آیا کہ اللہ وسایا اکیلے وارداتیں کرنے لگا۔ ایک مرتبہ پکڑے جانے پر جب وہ جیل پہنچا تو پہلے سے اندر موجود استادوں نے اسے اپنے فن کے وہ اسرار و رموز سکھا دیئے کہ اللہ وسایا بالکل کامل ہو گیا۔

دو تین مرتبہ جیل کاٹنے کے بعد وہ تاجو سے الگ ہو گیا، اب وہ اپنی محنت میں سے کسی کو حصہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایک روز وہ ایک بڑے شہر کی معروف شاہرہ پر کسی شکار کے انتظار میں کھڑا تھا۔ جب اس نے ایک بوڑھے آدمی کو بریف کیس سنبھال کر بنک سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اللہو سایا نے بھانپ لیا کہ معاملہ ٹھیک جمے گا۔

اس کی بے قرار نظریں بریف کیس پر جم گئیں۔ جیسے ہی وہ بزرگ ایک قدرے غیر مصروف شاہراہ کی طرف بڑھا جہاں اس نے غالباً اپنی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ دبے قدموں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اللہ وسایا لپک کر سامنے آ گیا۔

اس کی جراب میں چھپا خنجر ہاتھ میں آ گیا اور اس کی آنکھیں بزرگ کے چہرے پر جم گئیں۔

لیکن یہ کیا؟

اللہ وسایا کو یوں لگا جیسے ان آنکھوں سے کوئی برقی رو خارج ہو کر اس کے جسم کو چھیدنے لگی ہے۔

"تم محمد دین کے لڑکے ہو...... بزرگ کی آواز اسے کسی کنوئیں سے آتی سنائی دی

"ہاں! ہاں"...... بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔"

اسے یاد آ گیا کہ اس کے باپ کا یہی نام تھا...... لیکن یہ شخص کون ہے۔

"خنجر واپس رکھ لو اور میرے ساتھ آؤ"...... تحکمانہ لہجے میں اسے کہا گیا۔

"میں...... میں۔ مجھے جانے دو۔" اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے...... کیا نہ کرے۔ کسی بھی لمحے یہاں کسی کی آمد کا خطرہ موجود تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ یہ بوڑھا اس کی توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنائے ایک آہنی شکنجے نے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ بو نقوں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہا۔

"مجھے اپنا ہمدرد سمجھو۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ تم جان بھی نہیں سکتے؟"

اسی بزرگ نے نزدیک کھڑی کار کا اگلا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھا دیا اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی۔ تمام راستے وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش رہا۔ اس دوران اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ یہ شخص آہنی اعصاب کا مالک ہے اور اندر سے کہیں زیادہ طاقتور اور جوان ہے۔

گھر پہنچنے پر اس نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا یہی پراسرار رویہ اب اللہ وسایا کو دہشت زدہ کرنے لگا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص کون ہے۔ اٹھارہ انیس سال اس کی عمر ہو رہی تھی اور آٹھ نو سال سے اپنے گاؤں سے نکلے ہوئے تھے۔

"تمہیں فوجی چاچا یاد ہے۔" مہربان بزرگ نے گھر پہنچ کر اسے ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"فوجی چاچا۔"...... وہ بڑبڑایا اور اسے یاد آ گیا۔ اس کی والدہ کا ایک دور پار کا رشتہ دار فوجی تھا۔ شاید فوج کا کوئی بڑا افسر تھا۔ کبھی کبھی انہیں ملنے آیا کرتا تھا۔ کمال کا مشاہدہ

تھا فوجی چاچا کا...... جس نے آٹھ نو سال بعد بھی اسے پہچان لیا تھا۔

اللہ وسایا کو یہیں علم ہوا کہ اس کا تو سارا کنبہ مارا گیا تھا۔ وہ اکیلا سسکنے کے لئے زندہ رہ گیا۔ فوجی چاچا نے اسے اپنے گھر پناہ دی۔ اس نے اللہ وسایا سے کہا کہ وہ اپنا ماضی بھول کر اچھا انسان بننے کی کوشش کرے۔ اللہ وسایا کب برا بننا چاہتا تھا۔ فوجی چاچا نے چند ہی دنوں میں اسے اتنا پیار دیا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔

اس نے اللہ وسایا کو اپنی فرم میں اپنے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کروایا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے فوجی چاچا نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اللہ وسایا اچھے لوگوں کی طرح اس کی دکان پر بیٹھا رہتا لیکن وہ بھول چکا تھا کہ اس کی اصلیت کچھ اور ہے۔

دس بارہ روز بعد ہی ایک دن ایک سپاہی اسے لینے آگیا۔ "چوہدری صاحب نے بلوایا ہے۔"

اللہ وسایا سمجھ گیا کہ کسی مقامی ٹاؤٹ نے اسے پہچان کر اس کی رپورٹ کر دی ہو گی۔ تھانیدار نے شریفانہ لباس میں ملبوس اللہ وسایا کو سر سے پیر تک بڑے غور سے دیکھا پھر ایک رجسٹر کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا۔" اس نے بڑے طنز سے ایک تصویر پر انگلی مار کر کہا۔

"جی سرکار...... میری ہی ہے لیکن اب میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"اب کی بات چھوڑو بچے...... ہمیں کیا تم اب کیا کرتے ہو...... ویسے ہاتھ لمبا مارا ہے استاد تم نے......"

تھانیدار نے مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

اللہ وسایا کی قسمیں پولیس والوں کے لئے نئی نہیں تھیں۔ ان کے اپنے کچھ اصول تھے ایک مرتبہ جو پولیس کے کاغذوں میں آگیا...... آگیا۔ تھانیدار نے اس کی رونے اور قسمیں کھانے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا...... "مطب کی بات کرو وسایا......

مطلب کی بات کرو۔ ہمیں بے وقوف بناؤ گے کیا؟ پھر ہم تمہیں گرفتار تو کر نہیں رہے۔ بس ذرا خیال رکھنا ہمارا بھی...... آج کل تو بڑے آدمی بن گئے ہو نا۔" تھانیدار کی طنزیہ باتیں اسے کھا گئیں لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ اس دنیا کے قوانین جانتا تھا۔ اب اس کے سوا اس کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پولیس ٹاؤٹ بن جائے۔ لیکن اس نے تو قسم کھالی تھی کہ دوبارہ اس زندگی میں واپس نہیں لوٹے گا۔ جسے اس نے چھوڑ دیا ہے۔

اللہ وسایا کچھ نہ کر سکا۔ آئے روز تھانے اس کی پیشی ہونے لگی۔ پولیس کا جب جی چاہتا اسے شک میں گرفتار کر کے لے جاتی۔ ایک روز بالآخر اسے غنڈہ ایکٹ میں بند کر دیا گیا آج تک اس نے جی جان سے کوشش کی کہ فوجی چاچا کہ اس کے لئے پریشان نہ ہونا پڑے۔ لیکن ایسا ہو کے رہا۔

جب وہ تین مہینے کی نظر بندی کاٹ کر جیل سے باہر نکلا تو گھر کے بجائے اپنی دنیا میں واپس لوٹ گیا۔

پھر وہی چوریاں، ڈکیتیاں اس کا مقدر بن گئیں۔ اس نے یہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک اور بڑے شہر کو اس نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ کئی تاجو یہاں بھی قدم قدم پر بانہیں پھیلائے اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے اللہ وسایا کو ہاتھ ہاتھ لیا۔ تھانے اور جیل اب اس کے لئے کھیل تماشا بن چکا تھا۔

دن بھر کی کمائی وہ رات کو لٹا دیتا تھا انہی راستوں پر چلتے چلتے ایک روز شاہدہ اس سے ٹکرا گئی۔ شاہدہ کی داستان کوئی الگ نہیں تھی اس سے وہ بھی اسی کی طرح مختلف ہاتھوں سے گزرتی یہاں پہنچی تھی۔ پہلے روز اللہ وسایا اس کا گاہک بن کر گیا تھا۔ لیکن پہلے ہی دن اس کی جہاندیدہ نظروں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ فاحشہ ابھی تک اندر سے مکمل عورت ہے۔

جب اسے شاہدہ کے عورت ہونے کا ادراک ہوا تو ایک روز وہ اس کے سامنے

سسک پڑا۔ اس نے اپنے اوپر چڑھا خول اتار کر پھینک دیا اور شاہدہ کو بتایا کہ وہ صرف ایک معصوم دیہاتی بچہ ہے۔ جسے لٹیروں نے لوٹ کا مال بنا دیا ہے...... شاہدہ خود مردم گزیدہ تھی۔ وہ بھی بلک پڑی۔ "چلو شاہدہ اس دنیا کو چھوڑ دیں۔ نکل جائیں یہاں سے......" اس نے بڑے دکھی دل لیکن پر عزم لہجے میں کہا۔

"لیکن یہاں" شاہدہ نے پوچھا۔ "اس کی سرحدیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں سے فرار صرف سوچا جا سکتا ہے وسایا...... صرف سوچا جا سکتا ہے۔"

اللہ وسایا اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اس نے شاہدہ کو بظاہر قائل کر لیا کہ وہ یہاں سے نکل کر کسی دیہاتی علاقے میں چلے جائیں گے۔ اسے یاد آ گیا کہ یہاں سے اسی میل دور بیجووال میں اس کا ایک دوست موجود ہے۔ جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور اس نے بڑے خلوص سے ایک تاریخ مقرر کر کے شاہدہ کو وہاں پہنچنے کے لئے کہہ دیا شاہدہ نے بھی اس کا دل رکھنے کے لئے ہاں کر دی۔

اس کی زندگی میں اللہ وسایا پہلا ایسا آدمی نہیں تھا۔ جس نے اسے نئی زندگی کی راہ دکھائی تھی۔ ایسے دو تلخ تجربات وہ کر چکی تھی اور تیسری مرتبہ دھوکہ کھانے کے لئے تیار نہیں تھی۔

اس روز جب اللہ وسایا نئی زندگی کے خواب دیکھتا وہاں پہنچا تو اسے یقین تھا کہ شاہدہ وہاں موجود ہو گی۔ لیکن یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے دو گھنٹے تک وہ ایک بنچ پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران دو اور گاڑیاں وہاں رک کر آگے چلی گئیں۔

سٹیشن ماسٹر بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شخص پہلی ہی نظر میں اسے مشتبہ لگا تھا اور اب تو خاصی دیر ہو گئی تھی۔

"کہیں کوئی لمبا گھپلا نہ ہو جائے...... کوئی قتل وغیرہ۔" اس نے اپنے ساتھی سے مشورہ کیا اور اسے اس اطلاع کے ساتھ پولیس چوکی کی طرف دوڑا دیا کہ سٹیشن پر ایک

مشتبہ گھوم رہا ہے۔

اللہ وسایا نے اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ خودکشی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا جینا بھی مرنے جیسا ہی تھا۔ وہ اپنا سر نہوڑے بیٹھا تھا جب ایک حوالدار اور تین سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔

"کون ہو تم اوئے۔" بوڑھا حوالدار للکارا۔

اس نے سر اٹھایا تو حوالدار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اوہو! یہ تو اللہ وسایا ہے۔ پکڑ لو اسے اوئے......" اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "کوئی لمبا ہاتھ مارنے آیا ہے۔"

دو سپاہیوں نے اس کے دونوں بازو اپنی گرفت میں لے لئے۔ اللہ وسایا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ حوالدار اور سپاہی بہت خوش تھے۔ جیسے انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

پراسرار محسن

میں جو واقعہ آپ کو سنانے جارہا ہوں اس پر جانتا ہوں کہ آپ کو مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا کچھ پڑھ لکھ جانے کی وجہ سے میں بھی ایسے واقعات سنانے والوں کا تمسخر اڑایا کرتا تھا۔ لیکن خود ان کا نشانہ بننے کے بعد سے میرے خیالات میں خاصی تبدیلی آچکی ہے۔ ممکن ہے آپ بھی میری طرح سوچنے لگیں۔

میں نے آپ سے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔ میرا نام نواز خان ہے اور میں رینجر کا سابقہ حوالدار ہوں عمر کے ایسے حصے میں ہوں۔ جہاں بس چل چلاؤ والا ہی معاملہ ہے میں نے بیس سال تک اس کہانی کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن ایک عجیب بے کل سی ہمیشہ مجھے لگی رہی۔ آج جب آپ کو یہ کہانی سنا رہا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جیسے پچھلے بیس برسوں سے جو پھانس سی میرے گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ نکل گئی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد بدقسمتی سے ہم نے ان عظیم مقاصد کو بھلا دیا جن کے

لئے یہ مملکت خداداد وجود میں آئی تھی۔ قائداعظم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی قائد ملت کی شہادت کا سانحہ ہو گیا۔ اس کے بعد تو آئے روز وزارتیں بدلنے لگیں اور ملک میں سیاسی افراتفری کا طوفان بدتمیزی در آیا۔

جب بدامنی ہر طرف پھیل جائے تو ایسے حالات میں بد قماش عناصر ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہی ہوا ملک میں جرائم رواج پا گئے۔ راتوں رات دولت مند ہونے کی ہوس نے لوگوں کو اندھا کر دیا۔ دوسرے بہت سے جرائم کے علاوہ ان دنوں سمگلنگ کا دھندہ اپنے عروج پر تھا۔

یہ سمگلنگ دو طریقوں سے ہوتی تھی کہیں آپس میں مل ملا کر اور کہیں براہ راست ان دنوں میں حوالدار بن کر اس علاقے میں نیا نیا گیا تھا۔ میری ڈیوٹی جس سرحدی چوکی پر لگی تھی۔ وہ ایسے علاقے میں تھی جہاں ارد گرد سمگلنگ کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے خدا بہتر جانتا ہے کہ یہاں لوگ مل کر کام کرتے تھے، یا اس علاقے کے لوگ اس میں ملوث نہیں تھے۔ بہرحال یہ ضرور تھا کہ میرے آنے پر یہاں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

میں صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور متشرع شکل بھی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے نام کے بجائے ہر جگہ مولوی صاحب ہی پکارا جاتا تھا۔ میرے متعلق یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ میں غلط کام کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں ایک مشہور سمگلر رہتا تھا۔ جس کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ ہمارے پوسٹ والوں سے مل کر مال آر پار لاتا اور لے جاتا ہے۔ میں چونکہ رات کو نکلنے والی گشت کا انچارج تھا۔ اس لئے وہ لوگ جو اس کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ ان کے لئے یہ ضروری تھا کہ مجھے بھی اعتماد میں لیں، لیکن یہاں صورت حال ایسی تھی کہ ہر کوئی دوسرے پر شک کرتا اور محتاط رہتا تھا

ان میں سے کسی نے بھی میرے ساتھ اس ڈر سے بات نہ کی کہ اس طرح وہ خود بے نقاب ہو جائے گا پھر میری نیک نامی بھی آڑے آئی۔

ان لوگوں نے بجائے خود میرے سامنے آنے کے اس علاقے کے سمگلر ماجھے کو میرے متعلق بتایا کہ یہ مولوی بڑا سخت قسم کا آدمی ہے اور رشوت نہیں لے گا۔ اس من میں میری شہرت پہلے بھی خاص خراب تھی اور میں نے دو تین دفعہ ایسی حرکت کرنے والوں کو پکڑوایا بھی تھا۔ ان لوگوں کو مجھ سے صرف یہی خطرہ نہیں تھا کہ میں خود رشوت نہیں لوں گا۔ بلکہ وہ خوف زدہ تھے کہ میں ان کو مروا دوں گا۔ یہ ساری صورت حال جب ماجھے سمگلر کے سامنے آئی تو وہ ضرور ہنسا ہو گا کہ ایسا بے وقوف کون ہے جو گھر آئی مایا کو دھکے دے کر نکالے گا۔

اس نے فوراً براہ راست مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہماری پکٹ کے نزدیک ترین ماجھے سمگلر ہی کا گاؤں تھا۔ جہاں سے ہم ضروریات زندگی خریدنے جایا کرتے تھے۔ یوں بھی ہم لوگ دن میں ایک آدھ چکر اس گاؤں کا لگا ہی لیا کرتے تھے۔ میں بھی اس روز رات کی ڈیوٹی ختم کر کے سو گیا اور ظہر کے بعد جب اٹھا تو گاؤں کی طرف چل دیا میرا پروگرام یہی تھا کہ عصر گاؤں کی مسجد میں پڑھ لوں گا۔

میں ایک دکان سے صابن خرید رہا تھا۔ جب مجھے ایک آدمی نے آکر کہا۔

"مولوی صاحب آپ کو ماجھے پہلوان نے بلایا ہے۔"

مجھے تو اس کی بات سن کر ہی غصہ آ گیا۔ میں حکومت کا نوکر تھا کسی ماجھے ساجھے کا نہیں۔ پھر میرا ایک بدنام سمگلر کے پاس خود چل کر جانا یوں بھی مشکوک بنا دیتا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں ہے اسے کیا کہا تھا بس ڈانٹ کر بھگا دیا تھا سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل یہی چاہا اس کو جا کر دو چار سنا آؤں لیکن مصلحتاً خاموش رہا میں اس کی شہرت سن چکا تھا اور اس کے منہ لگنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔

میں دکان دار کو پیسے دے کر واپس مڑا تو ایک لمبا تڑنگا اور بڑے مضبوط جثے کا آدمی مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا اس نے میرے قریب پہنچ کر مجھے سلام کیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بڑی تکلفی سے بولا۔

"آیئے بیٹھ کر دو چار باتیں کرتے ہیں۔"

"کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"...... میں نے غصے سے پوچھا...... میں تو تم کو جانتا بھی نہیں۔"

"مولوی صاحب میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں کوئی دشمن نہیں۔"

میں مزید کچھ کہے سنے اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے وہیں ایک چائے کی دکان پر لے کر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دیا اس دکان پر میرے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی دیہاتوں میں ان دنوں کون چائے پیتا تھا۔

"مولوی صاحب، اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ میں آپ کو کسی چکر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ میری بات غور سے سن لینا۔ آپ بال بچوں والے آدمی ہیں۔ یہاں افسر سے سپاہی تک سب ہی موج کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے آپ کچھ زیادہ ہی ایماندار ہیں۔ سو دفعہ ہوں ہم کو اس سے کیا ہماری درخواست تو یہی ہے کہ ہم غریبوں کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانا ورنہ ایسے منہ کے بل گرو گے کہ زمانہ دیکھے گا اور ہاں اگر مناسب سمجھو تو ہم ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہیں مل جل کر جو کام ہو جائے وہی بہتر ہو گا۔" وہ بغیر سانس لئے بولتا چلا جا رہا تھا۔

میرا خون کھولنے لگا۔ غصے کے بارے میرے منہ سے نہ جانے کیا نکل گیا۔ میں اٹھا اور وہاں سے چل دیا۔ ماجھے نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔ صرف اس کا قہقہہ ہی مجھے سنائی دیا۔

میں پکٹ پر آیا تو کئی معنی خیز نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ شاید انکو علم تھا

کہ آج ماجھا میرے ساتھ بات کرے گا۔ میرے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر وہ لوگ بھی سمجھ گئے کہ میں ان کے دام فریب میں نہیں آیا۔

یہ میرا اس پکٹ پر چوتھا دن تھا رات کو میری گشت ڈیوٹی بدل کر لگائی گئی اور مجھے جان بوجھ کر اس علاقے سے دور رکھا گیا۔ جس کے متعلق مشہور تھا اور میرا تجربہ بھی یہی بتاتا تھا کہ یہاں سے بآسانی سمگلر آجا سکتے ہیں میں سمجھ تو گیا۔ لیکن قانونی اور اخلاقی دونوں طور پر مجبور تھا کہ وہیں جاؤں جہاں مجھے بھیجا جا رہا ہے اپنے سروس رولز کے مطابق میں اپنے افسر کو ڈیوٹی بدلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ گشت پر چلا گیا ہماری ڈیوٹی ایسی ہے کہ ہر لمحے چوکس اور حاضر دماغ رہنا پڑتا ہے۔ اندھیرے میں چلائی گئی گولی ہمیں نظر آنے سے رہی کچھ بھی ہو سکتا ہے ماجھا کوئی معمولی سمگلر نہیں تھا۔

اس نے جس طرح بے دھڑک ہو کر مجھ سے بات کی تھی اور جواب میں جس طرح اس کی بے عزتی کی اس کے بعد کچھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر اس کی طرف سے ہونے والے کسی بھی وار کو سہنے کی تیاری کر لی تھی۔ میں نے ڈیوٹی پر روانگی کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ میری نیت کا حال بہتر جانتا ہے۔ وہی میری حفاظت بھی کرے گا۔

ہم لوگ اس مخصوص علاقے میں پہنچے تو میں ایک درخت کے نزدیک بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو دو مختلف اطراف میں روانہ کر دیا ان کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ کس خاص مقام پر پہنچ کر انہوں نے واپس مڑنا اور ایک دوسرے سے ملاپ کرنا تھا۔

ملاپ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر ایک پہرے دار دوسرے کی طرف ٹارچ سے سگنل دیتا ہے تاکہ دونوں اپنی سمت کا اندازہ لگا لیں اور رات کو بھٹک کر سرحد کے دوسری طرف نکل جانے کے امکانات بھی نہ رہیں۔

خود میں ایک راستے پر درخت کے نزدیک ناکہ لگا کر بیٹھ گیا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے ایک دلدوز چیخ سنائی دی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کسی کا گلہ دبا رہا ہے میں چوکنا ہو گیا۔ کان آواز کی طرف لگا دیئے۔

ایک ہی چیخ کے بعد پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ میں بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ چونکہ ایک ہی چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس لئے سمت کا اندازہ بھی نہ کر سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا یہ جال میرے ہی لئے پھیلایا جا رہا ہو۔

میں اپنی جگہ جم کر بیٹھا رہا۔ بطور احتیاط میں نے اپنی رائفل کو فائرنگ کے لئے تیار کر لیا تھا میں کسی بھی واقعے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ انتظار کی شدت سے میرے اعصاب تڑخنے لگے لیکن دوسری طرف وہی سناٹا طاری رہا۔

چند منٹ مزید سن گن لینے کے بعد میں بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے کھسکنے لگا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کسی کو میرے یہاں بیٹھنے کا علم ہو گیا ہو اسی پوزیشن میں بیس پچیس گز دور نکل آیا لیکن کچھ نہ ہوا۔

میری آنکھیں اندھیرے میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھیں یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس طرف میرا سپاہی اسلم گیا تھا چیخ اس طرف سے بلند ہوئی تھی۔ میری نظریں اندھیرے میں اسی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ جب ایک منظر نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

مجھ سے بمشکل پندرہ بیس گز دور فضا میں ایک دیا جلتا ہوا نظر آیا یوں لگتا تھا جیسے یہ دیا ہوا میں تیر رہا ہو میں چکرا کر رہ گیا میری اطلاعات کے مطابق یہاں دور دور تک آبادی یا کسی قبرستان وغیرہ کا نام و نشان بھی نہیں تھا کہ کوئی آ کر کسی قبر پر دیا رکھ گیا ہو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ خوف سے میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں۔

دل ہی دل میں میں نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اور اس دیئے پر نظریں جما کر سوچنے لگا کہ یہ مجرموں ہی کی کوئی سازش نہ ہو اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور پریشانی بھی لاحق ہوئی کہ ابھی تک میرے دونوں سپاہیوں نے ملاپ نہیں کیا تھا۔

الٰہی خیر میرے دل سے دعا نکلی۔

اس کے ساتھ ہی ایک سمت سے ٹارچ جل کر بجھی میں نے فوراً دوسری طرف دیکھا لیکن اس طرف سے کوئی سگنل وصول نہیں ہوا تھا۔ دوبارہ اسی سپاہی نے ملاپ کی کوشش کی لیکن اب بھی جواب نہ آیا۔ جس طرف اسلم گیا تھا۔ اس طرف سے کوئی اشارہ موصول نہیں ہوا تھا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی میں نے اللہ کو یاد کیا اور خود اس کی تلاش میں جانے کو تیار ہوا اسلم اسی سمت میں چلا گیا تھا۔ جدھر یہ دیا فضا میں تیر رہا تھا۔ میں بھی رائفل چھپائے اسی طرف چل دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دیئے نے بھی چلنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے میں اس کی طرف بڑھا اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو میں نے گھبرا کر اس پر فائر کرنے کی بھی سوچی۔ لیکن پھر رک گیا کہ اگر میرے خیال کے مطابق یہ کسی زندہ شخص کی ہتھیلی پر نہ ہوا تو میں فائرنگ کے لئے کیسے جواب دہی کروں گا۔

میری آنکھیں اسی دیئے پر لگی تھیں۔ جب اچانک میرا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور میں منہ کے بل اسی پر گر پڑا گھبراہٹ سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ مجھے گرتے ہوئے یہ احساس ضرور ہوا کہ میں کسی انسانی جسم پر گرا ہوں گرتے ہی میں نے سنبھل کر اور بڑا زور لگا کر اپنے حلق سے "ہالٹ" کی آواز نکالی۔

اس کے ساتھ ہی کانپتے ہاتھوں سے ٹارچ روشن کی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ میرا سپاہی اسلم تھا وہ بے ہوش تھا۔ میں نے افراتفری میں اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔

اسلم ہوش میں آیا تو خوف سے کانپنے لگا۔ میں نے خطرات سے بے نیاز ٹارچ جلائے رکھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔

"ادھر ادھر"...... اس نے ہاتھ اٹھا کر اس سمت اشارہ کیا۔ جدھر مجھے دیا نظر آ رہا تھا اور کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور وہ کانپنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ خوف سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ خود میں بھی سہما ہوا تھا لیکن ابھی اس کی طرح میرے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں آیات قرآنی کا ورد شروع اور اس کو سہارا دے کر پکٹ کی طرف جانے لگا۔

اس دوران نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دیا غائب ہو چکا تھا۔ میں اسلم کو سہارا دے کر پکٹ میں آیا اور ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ یوں لگا جیسے اس کی زبان گنگ ہو چکی ہو۔ پکٹ پر موجود سپاہی بھی وہیں آ گئے۔ میں نے جو کچھ بھی یاد تھا پڑھ کر اسلم پر پھونکا اس کے اوسان بحال ہونے لگے اس نے ہوش میں آنے پر بتایا کہ کسی نادیدہ طاقت نے اس کا گلہ گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔

میں کسی بزدلی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس کو پکٹ والوں کی نگرانی میں دے کر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے دوسرا سپاہی بھی مل گیا۔ جسے ان واقعات میں سے کسی کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ بالکل نارمل تھا ہم نے ڈیوٹی کا وقت اکٹھے گزارا اور اس کو میں نے بتا دیا کہ اسلم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اپنے متعلق اس کو کچھ نہیں بتایا۔

آدھی رات کو ڈیوٹی ختم کر کے ہم پکٹ میں آ کر سو رہے صبح تک اسلم والے حادثے کی سب کو خبر ہو چکی تھی۔ میں نے اسلم کو سمجھایا کہ یہ اسلم کا وہم ہو گا۔ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں لیکن وہ قسمیں کھا کھا کر ہم کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا۔

صبح مجھے ایک بوڑھے کھوجی نے جو قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا الگ لے جا کر بتایا کہ

یہ ایسی پہلی واردات نہیں ہے۔اس علاقے میں دو تین مرتبہ پہلے بھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں اوراسنے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"مولوی صاحب جس کسی نے بھی آپ کی ڈیوٹی ادھر لگائی ہے۔اس نے آپ سے کوئی بدلہ چکایا ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیااور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا کئی مرتبہ جی بھی چاہا کہ جو واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے وہ بھی ان لوگوں کو سنا دوں لیکن میں خاموش رہا۔اگلی رات پھر میری ڈیوٹی اس طرف لگ گئی۔اس مرتبہ دونوں سپاہی نئے تھے۔میں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہااور اللہ کو یاد کر کے چل پڑا۔صرف دل میں اتنی دعا کی کہ مولا کریم تو سب کے دلوں کا حال بہتر جانتا ہے اگر کوئی سازش ہے تو بھی مجھے اس کا شکار اس لئے بنایا جارہا ہے کہ میں تیرے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چل رہا ہوں۔

اس مقام پر آکر میں ناکہ لگا کر بیٹھ گیااور دونوں سپاہیوں کو گشت پر بھیج دیا اچانک ایک خیال نے میرے ذہن میں سر اٹھایا کہ میں فوراً اپنی جگہ تبدیل کرلوں یہ سوچ کر ابھی میں اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہی دیا مجھے اس مقام پر جلتا نظر آیا...... لیکن آج نہ جانے کیوں مجھے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔

میں اٹھ کھڑا ہوااور دوسری سمت چل پڑا ابھی مشکل سے چند قدم اٹھائے تھے کہ یکے بعد دیگرے تین چار گولیاں فائر ہوئی میں فوراً زمین پر گر پڑااور پوزیشن میں آگیا۔میں نے رائفل کو فائرنگ کے لئے تیار کر لیا لیکن گولی نہ چلائی۔

میں نے سوچا کہ اگرچہ یہ گولیاں مجھ پر چلائی گئیں ہیں تو میں فائرنگ کر کے اپنی موجودہ پوزیشن حملہ آوروں کو کیوں معلوم ہونے دوں۔میں چاہتا تھا کہ وہ شخص اپنی گولیاں ختم کرے اس کے بعد میں اچانک اس کے سر پر پہنچ کر اس کو پکڑ لوں گا۔یہ ارادہ

کرتے ہی میں فائرنگ کی سمت چلنے لگا۔اچانک ہی فضا چیخوں سے لرز گئی یوں لگا جیسے کوئی کسی کو ذبح کر رہا ہے۔مجھے کل والا واقع یاد آگیا۔کسی غیر اختیاری عمل کے تحت میں آواز کی سمت اٹھ کر بھاگا۔

یہ بھاگنے کا طریقہ میری تربیت کے اصولوں کے بالکل خلاف تھا۔لیکن اس لمحے مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا اپنے علاوہ مجھے اور بھی بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں شاید میرے دونوں سپاہی بھی اسی سمت بھاگتے آرہے تھے۔میں نے ٹارچ جلائی۔ چیخوں کی آواز بند ہو چکی تھی۔جلد ہی میری ٹارچ کی روشنی ایک انسانی ڈھیر پر پڑنے لگی،میں اس کے نزدیک جاکر رک گیا۔اس دوران دونوں سپاہی بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ چکے تھے۔رائفل اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور جاگری تھی اور خود وہ وہاں اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔دونوں سپاہیوں نے مل کر اس کو سیدھا کیا۔میں نے ٹارچ جلا کر دیکھی۔خدا کی پناہ!یہ تو ماجھا سمگلر تھا۔اس کی آنکھیں ابل کر باہر آنے کو تھیں اور گردن پر سخت گرفت کے آثار بخوبی دکھائی دیتے تھے ہم نے جھک کر اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ ماجھا سمگلر مر چکا تھا۔

اس کی لاش پکٹ پر لائی گئی جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی،لیکن گلہ دبانے کے نشانات بڑے واضح تھے یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اس نے ہی مجھ پر فائرنگ کی تھی۔کسی نے اس کو بتادیا تھا کہ میں کسی جگہ ناکہ لگا کر بیٹھتا ہوں۔اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی اس کو مل گئی تھی کہ میں نے پکٹ پر پہنچتے ہی کمپنی کمانڈر کو اس کے متعلق رپورٹ دے دی تھی۔یہ بڑی خفیہ کارروائی تھی لیکن اس کو اس کے ایجنٹوں نے مطلع کر دیا۔

ماجھا تھا تو موٹی عقل کا بدمعاش وہ سیخ پا ہو کر مجھے مارنے پر تل گیا اس کو یہ اطلاع تو مل چکی تھی کہ مختلف علاقوں میں ناکے کہاں لگتے ہیں۔میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ابھی اس نے چار گولیاں ہی چلائی تھیں کہ کسی

نادیدہ طاقت نے اس کا گلہ دبا کر اس کو جان سے مار ڈالا۔

لیکن یہ میرا ان دیکھا محسن کون تھا؟ اس دیے کا راز کیا تھا اور وہ میرے علاوہ کسی اور کو کیوں نظر نہ آیا؟ آج تک نہیں سمجھ سکا۔ بس ایک ہی بات میرے ذہن میں آئی کہ میں نے اللہ سے مدد مانگی تھی اور اس نے میری مدد کی۔

کفارہ

پاکستان کے ایک مشہور شہر کا پر رونق بازار، زندگی کی گہما گہمی یہاں عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ایک دیہاتی بابو چھٹیاں گزار نے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ اس کی خواہش ہے کوئی تحفہ خرید کر گاؤں لے جائے۔ ایک گھڑی ساز کی دکان پر کھڑا وہ ایک گھڑی کی سودے بازی میں مصروف ہے۔ اس دکان سے کچھ فاصلے پر ادھ جلا سگریٹ انگلیوں میں پھنسائے۔ بار عب شخصیت کا مالک، خوش لباس، انگلی میں جعلی سونے (رولڈ گولڈ) کی انگوٹھی پہنے درمیانی عمر کا ایک شخص دکاندار پر نظریں جمائے کھڑا ہے۔ دیہاتی کے دکان پر پہنچتے ہی اس کی پر امید نظریں اسی جانب لگ گئی ہیں صبح سے کھڑا کھڑا وہ اکتا گیا ہے۔

ایک چمک اس معزز شخص کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے جیسے بھیڑیے نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ دکاندار نے اسے مخصوص سگنل دے دیا ہے۔ ہاتھ میں سلگتے سگریٹ کو پاؤں تلے مسل کر وہ بڑا گھبرایا ہوا دکان کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے یہی اندازہ ہو رہا ہے۔ جیسے بے چارے پر اچانک کوئی بپتا آن پڑی ہو۔

"بھائی صاحب! دو منٹ ذرا میری بات سن لیجئے۔" وہ دیہاتی اور دکاندار کی گفتگو

میں مداخلت کرتا ہے۔

دکاندار متوجہ ہوتا ہے۔ "میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اگر آپ براہ کرم میری مدد فرمائیں۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چپ ہو گیا۔

"اللہ رحم کرے۔" دیہاتی کو اس کی شریفانہ وضع قطع دیکھ کر ترس آنے لگا تھا۔

"فرمائیے۔" دکاندار نے کہا۔

"میں شریف آدمی ہوں۔ دوسرے شہر سے بچی کو علاج کروانے یہاں لایا تھا معلوم نہیں تھا اتنا زیادہ خرچ ہو جائے گا۔ کچھ عزیز رشتہ دار بھی یہاں ہی لیکن کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو یہ گھڑی رکھ لیں۔"

"بھائی صاحب!" رشتہ دار تو آج کل کے ہوئے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیا برا زمانہ آگیا ہے۔" اچھا دکھائیے تو گھڑی۔" دکاندار کا لہجہ بڑا ترحم آمیز ہے۔

دیہاتی اس دوران خاموش ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات ہیں۔ دکاندار نے گھڑی کو الٹ پلٹ کر سرسری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

"گھڑی تو پانچ سو سے کم کی نہیں ہے جناب!" دکاندار نے کہا۔ "لیکن میں معافی چاہوں گا۔ حالات آج کل خاصے خراب ہیں ہم لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے پولیس بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ میں آپ پر شک نہیں کر رہا لیکن ......"

خدارا صرف اڑھائی سو روپے ہی دے دیں۔ میں کیا بتاؤں خدا کسی کو اس طرح مجبور نہ کرے۔" اس مرتبہ باقاعدہ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے تھے۔

"گھڑی تو ٹھیک ہے نا!" دیہاتی نے پوچھا۔

"بظاہر تو ٹھیک ہی نظر آ رہی ہے نا!" دوکاندار نے کہا۔ میں نے اس کے اندر گھس کر تو دیکھا نہیں۔"

"آپ گھڑی مجھے دے دیں۔" دیہاتی نے حوصلہ کر کے بالآخر اس سے کہہ دیا۔

"اللہ تمہارے بھلا کرے۔" معزز سفید پوش نے گھڑی اتار کر دیہاتی کی طرف بڑھادی اور اڑھائی سو روپے بغیر گنے جیب میں ڈال لئے۔ آنسو بدستور اس کی آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔

دیہاتی بابو خوشی سے جھومتا وہاں سے روانہ ہوا۔ اب وہ گاؤں جا کر ہر کسی پر رعب گانٹھ سکتا تھا گھڑی واقعی بڑی قیمتی اور شاندار تھی۔

دیہاتی کے وہاں سے ٹلتے ہی وہ "شریف آدمی" دوبارہ دکان پر گیا۔ سو کا ایک نوٹ دکاندار کی طرف بڑھایا اور اپنی راہ لی۔ دوسری طرف دیہاتی بیچارہ ابھی گاؤں پہنچا ہی تھا کہ گھڑی نے کام کرنا بند کر دیا۔ گاؤں کے ایک دو گھڑی سازوں کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ سوائے گھڑی کے ڈائل کے باقی سب کچھ نقلی ہے اور اس کی مشینری کو اتنا ہی چلنا تھا۔ جتنا چل چکی ہے۔

دیہاتی بے چارہ ایک موہوم سی امید کے سہارے چھٹیاں گزارنے کے بعد دکاندار کے ہاں پہنچ گیا۔ دکاندار نے پہلے تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیا پھر دیہاتی کے یاد کرانے سے اسے یاد آگیا۔

"میں نے تو پہلے ہی تمہیں منع کیا تھا۔" دکاندار نے اس سے کہا۔۔ "تم پینڈو لوگ ہوتے ہی لالچی ہو۔ اب بھگتو۔" اور دیہاتی بے چارہ اپنا سا منہ لے کر واپس آگیا۔

○

لاہور کی ایک ماڈرن آبادی کا شاندار بنگلہ!

گھر کے مکین گیٹ کے سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈالے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اچانک ایک خاتون نے گھبرا کر کھلے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک سفید پوش درمیانی عمر کا باریش شخص دل پر ہاتھ رکھے لڑکھڑاتا اس طرف آ رہا تھا۔ سب

حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ برآمدے کے نزدیک وہ کسی نہ کسی طرح لڑکھڑاتا ہوا پہنچ ہی گیا۔

"پ...... پ...... پانی۔" اس کے منہ سے بمشکل نکلا وہ دھڑام سے گر پڑا۔

گھر کے مکین گھبرا کر اس کی طرف بڑھے۔ دو نوجوانوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا اور برآمدے میں لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگا۔ بڑی جان توڑ کوششوں سے قریباً پانچ چھ منٹ بعد اسے ہوش آیا۔ بے ہوشی کے دوران اس کی قمیض کی جیب سے شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کے لکھے ہوئے دو نسخے باہر آن پڑے تھے جن پر مختلف دوائیاں لکھی تھیں۔ ایک میڈیکل سٹور کی سلپ بھی اس کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ جس پر دوائیوں کی قیمت کا ٹوٹل سات سو روپے لکھے تھے۔

سارا معاملہ ان لوگوں کی سمجھ میں آ گیا۔ یہ بیمار سفید پوش تھا اور قیمتی دوائیاں خریدنے کی استطاعت اس میں نہیں تھی۔ یہ گھرانہ اپنی سوشل خدمات کے لئے کچھ زیادہ ہی شہرت رکھتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے نے بڑی ہمدردی سے اس سے پوچھا اسے کیا تکلیف ہے؟

"اللہ کسی کی قسمت خراب نہ کرے۔" علیل باریش نے کراہتے ہوئے کہا۔ "چار جوان بیٹیوں کا باپ ہوں۔" پھر اس نے روہانسی آواز میں ایک دردناک کہانی سنا دی کہ کس طرح بیوی کے مرنے پر اس نے اولاد کی خاطر دوسری شادی نہ کی اور آج جب وہ کمانے کے قابل ہو گئے ہیں تو اسے کوئی منہ لگانے کو بھی تیار نہیں۔ اس کا انداز گفتگو شریف اور پڑھے لکھے لوگوں کا سا تھا۔ سننے والوں کے دل پگھل گئے۔ وہ اپنی کہانی سنا کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کو مڑا۔ لیکن انہوں نے اسے روک لیا اور اس کے انکار کے باوجود زبردستی ایک ہزار روپے اس کی جیب میں ڈال دیئے۔

چند روز بعد جب انہوں نے اخبار میں ایک نوسرباز کی گرفتاری کی خبر اور اس کے

کارناموں کی تفصیل پڑھی اور تصویر بھی دیکھی تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ یہ وہی "ذات شریف" تھے جن کی مدد انہوں نے زبردستی کی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ بیچارے خود ہی شرمندہ ہو کر چپ ہو رہے۔ کہ اپنی بے وقوفی کا قصہ پولیس کو کیسے سنائیں۔

○

غلام علی کا باپ حال ہی میں کافی جائیداد چھوڑ کر مرا تھا۔ غلام علی آوارہ لڑکوں میں گھومنے پھرنے اور شہر جا کر فلمیں دیکھنے لگا۔ والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لئے روپے پیسے کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئیں۔ فلمیں دیکھتے دیکھتے شوٹنگ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور سٹوڈیوز کا رخ کیا۔ باپ کی زندگی ہی میں صاحبزادے نے ایکٹرسوں سے باقاعدہ عشق بھی فرمانا شروع کر دیا تھا۔

بات آگے بڑھی تو سٹوڈیوز سے کوٹھے پر آمدورفت شروع ہو گئی۔ غلام علی نے اپنے مختصر سے تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ یہ ایکٹرسیں سوائے فنانسروں کے کسی سے عشق نہیں فرماتیں۔ لاکھوں کی جائیداد کا اکلوتا مالک ہونے کے ناطے اس کے دل میں خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ وہ بھی فلم ساز بن جائے اور نہ صرف دولت میں ہاتھ رنگے بلکہ راجہ اندر بن کر بیٹھا رہے۔

باپ کی زندگی میں ایک مرتبہ جب اس نے ماں کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو ماں نے صاف صاف کہہ دیا کہ والدین کی زندگی میں یہ بات ہرگز ممکن نہیں۔ اس وقت تو غلام علی چپ رہا تھا۔ لیکن یہ خواہش اس کے دل سے نکلی نہیں تھی۔ باپ کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ اس نے زمین کا سودا اونے پونے داموں کیا کرنسی سے بریف کیس بھرا اور سٹوڈیوز کے شہر کا رخ کیا۔

ٹیکسی سٹینڈ کے ایک کونے میں پان سگریٹ کی دکان سے اس نے ایک فلمی دفتر کا

پتہ پوچھا اور دکان میں لگے شیشے میں اس کی ایک جھلک دیکھ کر "آغا صاحب" نے جو بوسکی کی قمیض اور سفید شلوار پہنے وہیں کھڑے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ صرف غلام علی کو تول لیا، بلکہ اس کی قیمت کا اندازہ بھی لگا لیا۔

غلام علی کو شاید اسی ایک دفتر کا نام دیا تھا۔ دکاندار کے بتائے ہوئے راستے پر وہ اس بلڈنگ تک پہنچ گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اس نے ایک بارعب شخصیت کو سگریٹ کے مرغولے بناتے وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا -- یہ آغا صاحب تھے۔

فلم ڈائریکٹر آغا صاحب کو دیکھتے ہی تین چار آدمی لپک کر ان کے نزدیک پہنچ گئے اور "آغا صاحب، آغا صاحب" ہونے لگی۔ وہ چاروں فلم ہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے آغا صاحب کی تعریفوں کے وہ پل باندھے کہ غلام علی جو تماشہ دیکھنے وہاں رک گیا تھا خوش ہو گیا۔ آغا صاحب نئے آدمیوں کو چانس دیتے ہیں۔

اسے پہلے ہی ایسے مہربان کی تلاش تھی۔ غلام علی نے چاہا کہ بڑھ کر ان سے دعا سلام لے لیکن ہمت نہ پڑی اور آغا صاحب آگے بڑھ گئے۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب؟ ملنا چاہتے ہیں آغا صاحب سے؟ ایک خوش پوش نوجوان نے ہمدردی کے لہجہ میں پوچھا۔

"جی ہاں!" غلام علی نے تھوک نگل کر کہا۔

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "یہ کوئی فلمی لٹیرے تو ہیں نہیں اللہ کا نیک بندہ اس لائن میں آ گیا ہے۔ ورنہ یہاں تو ایک سے ایک بڑھ کر فرعون کی اولاد ہے۔ آغا صاحب کی مہربانی سے مجھے بیک وقت تین فلموں میں کام مل گیا ہے۔ ورنہ میری تو جوتیاں گھس گئی تھیں۔ سٹوڈیوز کے چکر کاٹتے کاٹتے۔" نوجوان نے آغا صاحب کی سخاوت اور شرافت کے پانچ چھ قصے بیان کر ڈالے۔ غلام علی اس کی باتوں کے طلسم کا اسیر ہوتا چلا گیا۔

دس بارہ منٹ کے بعد وہ دونوں بہترین دوست بن چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک ہوٹل میں بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی اپنی درد بھری کہانی سنا رہے تھے۔ اس نوجوان کی کہانی بھی غلام علی سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ وہ کبھی کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا ایکٹنگ کے شوق میں ہزاروں روپے برباد کرنے کے بعد بالآخر آغا صاحب کی مہربانی سے کسی قابل ہوا تھا۔ اس نوجوان کا نام ظفر تھا۔ اس کی گفتگو بڑی ٹھوس اور مدلل تھی۔ غلام علی کو ظفر اپنے کرائے کے مکان میں لے گیا اور اگلے روز آغا صاحب سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا۔

وہ رات غلام علی نے سوتے جاگتے گزاری۔ خوشی کے مارے اس کی تو نیند ہی اڑ گئی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور دونوں تیار ہو کر آغا صاحب کے دفتر چلے گئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد آغا صاحب تشریف لے آئے۔ ظفر اور غلام علی نے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی۔ آغا صاحب سلام کا جواب دے کر بیٹھے۔ سب سے پہلے انہوں نے چپڑاسی کو ہدایت کی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے کیونکہ آج وہ مصروف ہیں اور ان کا منہ بولا بیٹا ظفر آیا ہوا ہے۔

ظفر نے غلام علی کا تعارف اپنے ایک عزیز کی حیثیت سے کرایا اور آغا صاحب سے درخواست کی کہ جس طرح انہوں نے ظفر کا ہاتھ تھاما اسی طرح وہ غلام علی کو بھی سہارا دیں۔ آغا صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے ظفر کو بے بھاؤ کی سنا دیں کہ اس نے فلم انڈسٹری کو کھیل تماشہ سمجھ رکھا ہے۔ جس کا دل چاہا منہ اٹھا کر ہیرو بننے کے لئے آ گیا۔ لیکن اس صورت حال کے لئے ظفر نے غلام علی کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا آہستہ آہستہ سماجت کر کے اس نے آغا صاحب کو ٹھنڈا کر لیا۔

آغا صاحب نے پہلے تو غلام علی کو سمجھایا بجھایا کہ برخوردار یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اب بھی وقت ہے واپس لوٹ جاؤ۔ بڑے بڑے جی داروں نے اس

میدان میں پہنچ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی اور بھاگ گئے۔ لیکن انہوں نے غلام علی کو ارادے کا پکا دیکھا تو گفتگو کا رخ بدل گیا اور انہوں نے ان لوگوں کی کہانیاں سنانی شروع کیں جو بالکل ٹٹ پونجیے تھے اور آج وہ آسمان شہرت پر جگمگا رہے ہیں۔ دولت ان کی باندی ہے۔

غلام علی نے بتایا کہ اس کے پاس ستر ہزار روپے ہیں۔ آغا صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے پچاس ہزار میں فلم تیار کر دی جس کا ہیرو غلام علی تھا اور ہیروئن سے ملنے اسے رات کو جانا تھا۔ پچاس ہزار میں فلم بنانا ممکن تھا۔ لیکن آغا صاحب کے اثر و رسوخ کے سامنے ہر چیز ممکن تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ صرف بیس ہزار روپیہ ایڈوانس ایکٹروں اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کریں گے۔ باقی پیسے فلم ریلیز ہونے کے بعد ادا کئے جائیں گے۔ تیس ہزار روپے شوٹنگ اور خام مال پر اٹھ جائے گا اور جونہی آدھی فلم مکمل ہوئی وہ پارٹیوں سے ایڈوانس پکڑ کر باقی کام بھی چلا لیں گے۔

فلم کی تیاری اور غلام علی کی شہرت اور دولتمندی کا نقشہ انہوں نے ایسا پیش کیا کہ غلام علی جھوم اٹھا۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ رات کو پوری ہو گئی۔

رات کو آغا صاحب اور ظفر کی معیت میں غلام علی کو بازار حسن کے ایک کوٹھے پر لے جایا گیا اور اس کی ملاقات ایک نوخیز اور مستقبل کی ابھرتی ہوئی فنکارہ سے کروائی گئی۔ جس کی من موہنی اداؤں نے غلام علی کو بری طرح متاثر کیا۔ اس رات غلام علی واقعی خود کو راجہ اندر محسوس کر رہا تھا، عارفہ جو اس کی فلم کی ہیروئن تھی۔ اس پر جان چھڑک رہی تھی۔

غلام علی کے حکم پر وہاں کڑاہی تکہ منگوالیا گیا اور جب رات کو ناؤ نوش کا ہنگامہ گرم ہوا تو ظفر نے ہیرو اور ہیروئن کو آرام کروانے کے لئے الگ کمرے میں بھیج دیا۔ وہ رات غلام علی کی قسمت کے تابوت میں پہلا کیل ٹھونکتی گزر گئی۔ صبح غلام علی نے

دس ہزار روپیہ بطور ایڈوانس ہیروئن کی ماں کو تھما دیا اور دو ہزار روپیہ انعام الگ دے دیا۔ آغا صاحب کا پانچ ہزار تو رات ہی ظفر نے انہیں دلا دیا تھا۔

صبح عارفہ اور غلام علی کو سٹوڈیو لے جایا گیا۔ ان کا سکرین ٹیسٹ ہوا اور سیٹ پر موجود قریباً سب ہی لوگوں نے انہیں مستقبل کا کامیاب ترین جوڑا قرار دیا۔ آغا صاحب نے اپنے دفتر ہی میں غلام علی کی فلم کا بورڈ لٹکا دیا۔ گرما گرم کہانی پہلے ہی سے موجود تھی۔ دوسرے تیسرے روز خالی کیمرے کے سامنے غلام علی سے الٹی سیدھی حرکتیں کروائی جانے لگیں۔ کبھی آغا صاحب پانچ ہزار میوزک ڈائریکٹر کے لئے ایڈوانس مانگ رہے ہیں تو کبھی تین ہزار کیمرہ مین کے لئے اور کبھی کسی کے لئے۔ ہر روز آغا صاحب عارفہ اور اس کی ماں کی معیت میں دعوتیں اڑائی جاتیں۔ ہیروئن غلام علی کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لئے نکل جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ستر ہزار روپیہ راکھ کی طرح اڑ گیا پھر دس ہزار مزید اور پھر دس ہزار مزید۔ اس کے بعد غلام کلی کی بیوہ ماں کو ہوش آیا اور اس نے باقی پونجی رشتہ داروں کی مدد سے آخری عمر کے لئے قابو کر لی۔

اب کون ہیرو اور کون ہیروئن، لڈو ختم ہوئے تو یارانے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر فلک نے عجیب نظارا کیا کہ گاؤں کے چوہدری کا بیٹا در در کا محتاج ہو گیا اور آج چوہدری غلام علی "گاماں لائٹ مار" کے نام سے ایک سٹوڈیو میں ٹین کی چمکتی ہوئی سلیٹ ہاتھوں میں پکڑے بربادی حالات کا رونا رو رہا ہے۔ اس چمکتی سلیٹ پر اس کی بد قسمتی کی داستان بھی جلی حروف میں لکھی نظر آتی ہے۔

○

خدا کسی کو کچہری کا منہ نہ دکھائے۔ لیکن گردش حالات اچھے اچھوں کو کیا سے کیا دکھا دیتی ہے۔ تقدیر کے سامنے بندہ مجبور محض ہوتا ہے۔ اللہ دین بھی گردش حالات

کاشکار ہو کر کچہری تک پہنچا تھا۔ شریف آدمی بے چارہ پانچوں وقت کا نمازی، بس گھر، مسجد اور دکان کی تکون ہی میں اس کی زندگی چکرا رہی تھی کہ ایک روز اطلاع ملی کہ صاحبزادے تھانے میں بیٹھے والد کو یاد فرما رہے ہیں۔

اللہ دین گھبرا گیا۔ اس نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ پولیس کی اگاڑی اور پچھاڑی دونوں ہی بری ہیں۔ بچہ بھی شریف تھا پھر یہ آخر بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آن پڑی۔ تھانے پہنچ کر علم ہوا کہ کالج کے لڑکے بس کنڈیکٹر کو تنگ کر رہے تھے۔ جب وہ زچ ہو کر ان سے جھگڑ پڑا تو باقی سب بھاگ گئے اور اللہ دین کا بیٹا دھر لیا گیا۔ پولیس کو گدھے گھوڑے سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی شریک ہے یا بدمعاش۔ اس بات سے بھی انہیں کوئی علاقہ نہیں۔ وہاں تو جو پھنس گیا، پھنس گیا۔

پانچ سو روپیہ تھانے میں اٹھ گیا اور ضمانت نہ ہو سکی، بیٹا جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل چلا گیا۔ اللہ دین شریف آدمی، عدالت، کچہری کی دنیا سے بالکل ناواقف۔ اگلے روز جب متعلقہ عدالت کے باہر پہنچا تو ایک وکیل کا منشی اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے بڑی درد مندی سے اللہ دین کی کہانی سنی۔ پھر اسے عدالت کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے بعد ہدایت کی کہ وکیلوں کے چکر میں نہ پڑے۔ یہاں سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلا کرتا۔ اس نے اللہ دین کو "ملک صاحب" کے ہاں جانے کو کہا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور ملک صاحب مدد پر راضی ہو گئے تو وہ مل ملا کر فائل ہی غائب کروا دیں گے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، اگر ضمانت، مقدمے کے چکر میں پڑ گئے تو آدھی عمر گزر جائے گی۔

اللہ دین سیدھا سادا بندہ، عدل و انصاف اور جرم و سزا کی اس دنیا کے بارے میں صرف یہ جانتا تھا کہ یہاں ٹاؤٹ ہوتے ہیں جو لے دے کر معاملہ رفع دفع کروا دیتے ہیں۔ ملک صاحب کو بھی اس نے ایسی ہی کوئی ہستی جان لیا۔ منشی اسے لے کر ملک

صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ ملک صاحب کے تو انداز ہی نرالے تھے۔

وہ اللہ دین کی سوچ سے مختلف کسی اور ہی قسم کی ہستی تھی۔ دروازے پر اس جیسے تین چار اور ضرورت مند کھڑے تھے۔ جن کے کام حال ہی میں انجام پائے تھے۔ منشی اسے لے کر اندر داخل ہوا تو ملک صاحب نے بغیر ان کی طرف نگاہ اٹھائے سلام کا جواب دے کر سامنے رکھے ایک ٹیلیفون کا نمبر گھمایا۔ پھر انہوں نے فون پر پوچھا کہ یہ فلاں تھانہ ہے؟ جواب ملنے پر حکم ہوا کہ ایس، ایچ، او کو بلاؤ۔ اس کے بعد انہوں نے تھانیدار کو وہ سنائیں جیسے وہ ملک صاحب کا زر خرید غلام ہو۔

فون رکھنے کے بعد بھی وہ گالیاں دیتے ہوئے منشی سے مخاطب ہوئے۔ "اب کیا مصیبت آ گئی ہے؟" انہوں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں منشی نے اللہ دین کی کہانی سنا کر مدد کی درخواست کر دی۔ منشی کی بات ابھی نامکمل ہی تھی کہ ملک صاحب کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔

بالآخر منشی کی منت سماجت سے ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اللہ دین کو اگلے روز کچہری آنے کو کہا۔ اگلے روز اللہ دین خوش خوش کچہری پہنچا۔ ملک صاحب سے ملاقات ہوئی اور علم ہوا کہ "جج صاحب" ریٹائرنگ روم میں آرام فرما رہے ہیں۔ اللہ دین کی آنکھوں کے سامنے ملک صاحب سیدھے ریٹائرنگ روم میں جا گھسے۔ قریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ برآمد ہوئے اور "جج صاحب" کے "ریڈر" سے گفتگو کرنے لگے۔ پھر انہوں نے اللہ دین اور منشی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کچہری کی کنٹین میں بیٹھے اللہ دین نے ان کے لئے پر تکلف چائے منگوائی۔ ملک صاحب نے کہا۔ "اجی کیسے کام نہ کرتا میرا۔ میں نے ہی تو اسے فلاں چکر سے نکالا تھا۔"

انہوں نے اللہ دین کو بتایا کہ پرسوں اس کا بیٹا رہا ہو کر گھر پہنچ جائے گا اور دو ہزار روپے ہتھیا لئے۔ جن میں سے ان کے ایک پھوٹی کوڑی بھی حرام تھی۔" وہ اللہ دین کو

لے کر عدالت کے "ریڈر" کے پاس پہنچے۔ جس کے گرداگرد لوگوں کا اس قدر جمگھٹا تھا کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ملک نے آگے بڑھ کر اللہ دین کا اس سے تعارف کروایا۔

"ٹھیک ہے بزرگو!" ریڈر نے کہا۔ "پرسوں آپ گیارہ بجے آجائیں۔ کام ہو جائے گا۔"

دو ہزار روپے میں جان کر خلاصی ہونے پر اللہ دین نے سو نفل شکرانے کے گزارے اور دو روز بعد جب وہ متعلقہ عدالت میں پہنچا تو اس کا کام واقعی ہو چکا تھا۔ ریڈر نے مقدمات کے کاغذات کی نقلیں تیار کروا رکھی تھیں۔

"لیکن ملک صاحب تو کچھ اور......" اللہ دین نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ ریڈر نے آنکھیں نکالیں۔

جواب میں اللہ دین نے ساری کہانی سنادی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے بڈھے!" ریڈر نے کہا۔ "مجھے تو اس شخص نے منت سے صرف اتنی بات کہی تھی کہ تم شریف اور ان پڑھ آدمی ہو۔ میں تمہارے کاغذات کی نقلیں تیار کروادوں۔ میں نے خداخوفی سے یہ کام کروادیا۔ اندر خانے کیا چکر ہے۔ مجھے اس کا علم نہیں۔"

اللہ دین بے چارہ روتا پیٹتا پولیس سٹیشن پہنچا۔ تھانیدار نے اس کی کہانی سن کر دو چار گالیاں اسے اور دس پندرہ اس فراڈیے کو دیں، جس نے اس کے ساتھ یہ ہاتھ کیا تھا اور دو کانسٹیبل اس کے ہمراہ کر دیئے کہ جاؤ اور فوراً اس نوسرباز کو گرفتار کر کے لاؤ۔ جیسے وہ بس انہیں کا منتظر بیٹھا ہو۔

کانسٹیبلوں کے خرچ پانی اور کرایہ جات پر ڈیڑھ دو سو روپے مزید اٹھ گئے پہلے تو اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ دفتر تھا کہاں۔ جب مختلف نشانیوں کی مدد سے ایک دفتر میں

پہنچے تو وہاں ملک صاحب کی بجائے کوئی بھٹی صاحب فروکش تھے۔

اللہ دین نے اپنی داستان الم سنائی اور اس ملک زادے کا جغرافیہ سمجھایا تو بھٹی صاحب بولے کہ اس طرح کی شکل و شباہت کا منشی انہوں نے دو ماہ قبل ملازم رکھا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ دفتر میں زیادہ تر وہی بیٹھا کرتا تھا لیکن وہ تو پرسوں ہی آٹھ دس دن کی چھٹی اور ایک ماہ کی ایڈوانس تنخواہ لے کر جا چکا ہے۔ کیونکہ گاؤں سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کی بیوی مرنے ہی والی ہے۔

ایڈریس پر تفتیش کی گئی تو اس جیسے اور نام کے آدمی کا دور دور تک کوئی نشانی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ پولیس نے پراپرٹی ڈیلر سے ضمانت نیک چلنی طلب کر لی اور کیس داخل دفتر ہو گیا۔

مظلوم گھڑی فروش، دل کا مریض دکھیا باپ، فلمی دنیا کا آغا صاحب اور کچہری کی دنیا کا ملک صاحب چار شخصیتیں نہیں بلکہ ایک ہی ذات شریف ہے جس کو لوگ حمیدا بوری والا کے نام سے جانتے ہیں۔

حمید اس کا اصلی نام ہے؟ یہ بھی کوئی یقینی بات نہیں وہ بیک وقت چوہدری، بھٹی، ملک، خان، پراچہ، باجوہ، آغا اور نہ جانے کیا کیا کہلاتا ہے۔ میری اور اس کی پہلی ملاقات ایک وکیل صاحب کے ہاں ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنے دس پندرہ مقدمات میں سے کسی ایک کے متعلق جانکاری حاصل کرنے آیا تھا۔

ڈھلتی عمر، سرخ و سفید رنگت، اس پر مہندی لگی، چھوٹی چھوٹی داڑھی، سر قراقلی ٹوپی شلوار قمیض پہنے وہ کسی محلے کی مسجد کمیٹی کا ممبر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بھی سرراہے وکیل دوست سے پوچھ لیا تھا کہ ایسے شریف لوگ بھی اس کے پاس پھنس جاتے ہیں؟ اور جب اس نے مجھے اس "شریف آدمی" کے کارنامے بتانے شروع کئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شریف کم اور "ذات شریف" زیادہ ہے۔ اس کی عمر

ساٹھ پینسٹھ سال ہو چلی تھی۔ میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے پچھلے تین چار سال سے مکمل توبہ کر لی ہے۔ اور کوئی واردات نہیں کرتا۔ لیکن اس پر اتنے کیس بن چکے ہیں کہ مرتے دم تک وہ عدالتوں کے چکر کاٹتا رہے تو بھی نہ نمٹ سکیں گے۔

یہ نوسر باز حمیدا بوری والا کے نام سے پولیس کے حلقوں میں مشہور تھا۔ میرا واسطہ زندگی میں بڑے اچھے اور بہت برے قسم کے لوگوں سے رہا ہے۔ کئی لوگوں نے مجھے اپنی باتوں سے عادات سے کارناموں سے متاثر کیا۔ لیکن حمیدا بوری والا ایک ایسی شخصیت تھی۔ جو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی اور میں اسے شاید کبھی نہ بھلا پاؤں۔

میں نے وکیل دوست سے درخواست کی کہ وہ میرا تعارف اس سے کروا دے پہلے تو اس نے مجھے منع کیا۔ کیونکہ اسے اب بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر کبھی اس کی فطری جبلت اس پر غالب آ گئی تو عین ممکن ہے کہ حمیدا مجھ سے بھی کوئی ہاتھ کر جائے۔

وکیل صاحب نے اگلے ہی روز ہماری ملاقات کروا دی اور میرا تعارف ایک جرنلسٹ دوست کی حیثیت سے کروایا۔

"ارے واہ پھر تو اپنے ہی گھر کے بندے ہوئے۔" لفظ جرنلسٹ پر اس نے قہقہہ لگایا۔

حمیدے نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ نگر نگر گھوما تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے خاصا فری ہو گیا۔ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک ہوٹل چلے گئے، جہاں اس نے ماضی کی گرد جھاڑتے ہوئے اپنی کتاب زندگی کے مختلف اوراق میرے سامنے کھول دیئے۔

اس کی داستان طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ، سنسنی خیز اور طویل ہے۔ اتنی طویل کہ اسے لکھنے کے لئے بھی عمر خضر درکار ہو گی۔ میں نے اس کے چیدہ چیدہ واقعات آپ کو سنا دیئے ہیں۔ ان واقعات میں اس نے کمال احسان سے کام لیتے ہوئے اپنی دنیا کے کئی رازوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

حمیدا کی پیدائش مشرقی پنجاب کے ایک شہر میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ انگریزوں

کی فوج میں ملازم تھا۔ اس لئے گھر سے دور دراز رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا۔ جب ہندوستانی فلم انڈسٹری کا آغاز ہوا تھا اور لوگ اس طرف کھچے کھچے جا رہے تھے۔ حمیدا کو فلمیں دیکھنے کی لت سکول کے زمانے سے پڑ گئی اور ایک روز جب وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اپنے ایک دوست کے ورغلانے پر گھر سے فرار ہو گیا۔

اس کا دوست حمیدا سے قریباً دس سال بڑا تھا۔ اور ایک مجرم گروہ کا ایجنٹ۔ اس نے حمیدا کو بمبئی میں سیدھا اپنے گورو کے ہاں پہنچا دیا۔ گورو نے دیکھا کہ لڑکا سمجھدار، تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھنے والا اور سرخ و سپید رنگت کا مالک ہے تو اس نے بجائے عام قسم کا جیب کترا بنانے کے اس کے متعلق کچھ اور ہی منصوبہ بنایا اور اس پر عمل پیرا ہو گیا۔

یہ گورو اپنے زمانے کا مشہور ٹھگ رہا تھا اور اپنا سلسلہ وہ مشہور زمانہ امیر علی ٹھگ سے ملاتا اور اس پر بڑا فخر کیا کرتا تھا۔ اس نے حمیدا کی تربیت۔ "سائنٹفک" بنیادوں پر کی اسے اپنے ڈیرے پر رکھنے کے بجائے اپنے گھر بیٹا بنا کر رکھ لیا۔

حمیدا بتاتا ہے کہ بمبئی میں اس نے جی بھر کے عیاشی کی نئی سے نئی فلم، گھومنا پھرنا، سیر سپاٹے، کھانا پینا، یہی تھی اس کی زندگی۔ اس نے بڑے لمبے عرصے تک ماں باپ کو بھلائے رکھا۔ کیونکہ گورو نے اس کا ذہن دوسری طرف لگا دیا تھا، اسے آپ "برین واشنگ" کہہ سکتے ہیں۔"

وہ حمیدا کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ عمر صرف پندرہ سال تھی۔ وہ جیب تراش، چاقو چلانے کا ماہر اور نوسر باز بن گیا۔ اس نے اپنی گھناؤنی زندگی کا آغاز چھوٹی چھوٹی وارداتوں سے کیا۔ پہلے پہل تو گورو ہر واردات پر اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے اعتماد ہونا شروع ہو گیا تو اس نے حمیدا کو اکیلے اپنی صلاحیتیں آزمانے اور جوہر دکھانے کے لئے چھوڑ دیا۔

اس نے بتایا کہ پہلے پہل اس کا گورو اور وہ دونوں بھکاریوں کا بھیس بدل کر بمبئی کی امیر اور خصوصاً اینگلو انڈین اور فرنگی آبادیوں میں چوریاں کرتے رہے۔ اس کے لئے انہوں نے بڑا سیدھا سا طریقہ اپنایا تھا۔ دونوں سادھوؤں کا روپ دھار کر بھیک مانگنے نکل جاتے۔ اکثر وہ ماڈرن آبادیوں ہی کا رخ کیا کرتے تھے۔ بھیک مانگتے ہوئے وہ اس بات کا اندازہ لگا لیتے کہ گھر کے افراد کی تعداد کتنی ہے۔ اکثر ایسے گھروں میں ان کا واسطہ اکا دکا میم صاحبان یا ان کے خانساموں ہی سے پڑا کرتا تھا جنہیں جل دے کر وہ گھر میں داخل ہو جاتے اور دن کے اجالے میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چمپت ہو جاتے۔

بمبئی کوئی چھوٹا سا شہر نہیں تھا لیکن کب تک۔ بالآخر بھید کھل گیا اور پولیس کو اطلاع مل گئی کہ چور وہی دو پراسرار سادھو ہیں جو خود کو کاشی اور متھرا کے پجاری بتا کر بھیک مانگنے نکلتے ہیں اور صفایا کر کے بھاگ جاتے ہیں۔ پولیس نے اپنا جال ان کے گرد بننا شروع کیا اور آہستہ آہستہ وہ گورو کے ڈیرے تک آ پہنچی۔

یہ گورو پہلے ہی ایک ریاست سے مفرور تھا اور یہاں آشرم کھولے بیٹھا تھا۔ اس آشرم کی آڑ میں وہ اپنا دھندہ بھی چلا رہا تھا۔ حمیدانہ بتایا۔

”اس رات جب انگریز پولیس کپتان اپنی دانست میں بڑی چالاکی سے آشرم کے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے اچانک دھاوا بول کر اپنے جوانوں سمیت ہمارے آشرم میں داخل ہوا ہم ایک ٹرین کے آرام دہ کمپارٹمنٹ میں بیٹھے، بڑے امیرانہ ٹھاٹ سے سفر کر رہے تھے۔ ہماری منزل کلکتہ تھی۔ دو مہینے تک گورو چیلے نے مل کر گلچھرے اڑائے۔ جب کنگال ہونے لگے تو آگے کی فکر دامن گیر ہوئی اور ہم نے وہی بمبئی والا چکر یہاں بھی شروع کر دیا لیکن کلکتہ کی پولیس قریباً آدھے سے زیادہ مسلمان اور انگریز افسروں سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے جلد ہی ہمارا سراغ پالیا۔ یہاں دال گلتی نہ دیکھ

کر ہم بادل نخواستہ دہلی چلے گئے۔ دہلی میں میرے استاد نے ایک نیا دھندہ شروع کر دیا جس نے بعد میں ”پلہ“ کا نام اختیار کیا۔ ہمارا طریق کار سائنٹیفک اور محفوظ تھا۔ ہم اپنے شکار کو تاڑ لیتے۔ پھر اس کے راستے میں ایک پوٹلی پھینک دیتے۔ جس میں نقلی سونے کے زیورات ہوتے تھے۔ لیکن یہ نقل اتنی مہارت سے تیار کی جاتی تھی کہ اصل کا گمان ہوتا تھا۔ یوں بھی جب آدمی لالچی ہو رہا ہو تو اسے نقل اصل نظر آتی ہے میرا گورو علم نفسیات پڑھے بغیر بہت بڑا ماہر نفسیات تھا۔ وہ انسانی فطرت کے کمزور پہلوؤں پر نظر رکھتا تھا اور اسے استعمال کرنے کا فن بھی خوب جانتا تھا......

”آپ ذرا تصور کریں کہ ایک شخص ٹہلتا ہوا سڑک پر جا رہا ہے اچانک اس کی نظر ایک کپڑے کی تھیلی پر پڑتی ہے وہ بڑی بے قراری اور تجسس سے بڑھ کر تھیلی اٹھا لیتا ہے۔ جس میں سونے کے زیورات رکھے ہیں ابھی وہ تھیلی کو چھپانے کی فکر ہی کر رہا ہوتا ہے کہ ہمارا ایک ساتھی ہاں اچانک کونے سے نمودار ہو کر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اسے ایک طرح رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اب یہ ہمارا پکا شکار ہے۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ ہمارا ساتھی سونے کی قیمت لگا کر اس کا چوتھا حصہ اس سے طلب کرتا ہے۔ اگر وہ شخص اس چکر میں نہ پھنسے اور کہے کہ وہ تو زیورات تھانے میں جمع کرائے گا۔ تو وہاں فوراً دوسرا ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارا تیسرا ساتھی ایک بوڑھی عورت سمیت آ جاتا ہے اور اس پر چوری کا الزام لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی کچھ دے کر ہی اس کی جان چھٹتی ہے......

”یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک بار جس پر ”پلہ“ پڑ جائے وہ اس سے بچ کر نکل جائے اس تیکنیک میں ہم نے نئی اختراعیں کیں اور ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ آپ کی عقل حیران رہ جائے۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

”یو۔ پی کے ایک نواب صاحب کو شکار کا شوق تھا۔ ایک رات وہ اپنے دوستوں

کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ وہ لوگ جس علاقے میں مقیم تھے اس کے قریب آثار قدیمہ تھے۔ ان کھنڈرات میں سے اکثر لوگوں کو سونے کے سکے اور دیگر نوادرات ملے تھے اور ان واقعات نے خاصی شہرت پائی تھی۔ ہمارے گورو نے اسی شہرت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک طریقہ سوچ لیا جو کسی انگریزی ناول کے پلاٹ سے کم شاندار نہیں......

"رات کا دوسرا پہر تھا۔ نواب صاحب اور ان کے ساتھی شغل مے نوشی میں مصروف تھے کہ اچانک ایک آدمی جو خاصا زخمی تھا وہاں آگھسا۔ نواب اور اس کے ساتھی گھبرا گئے کہ یہ کیا مصیبت آگئی۔ صورت حال اتنی سنگین ہو گئی کہ وہ خوفزدہ ہو گئے۔ زخمی نے ان سے درخواست کی کہ اس کے تعاقب میں کچھ لوگ ہیں جو یقیناً اسے مار ڈالیں گے اس کے پاس ایک بوسیدہ ڈائری تھی جو اس نے نواب کے ساتھیوں کو دے کر کہا۔ اگر زندگی باقی رہی جس کی امید نظر نہیں آتی وہ ان سے ڈائری واپس لے لے گا اور وہ باہر نکل گیا۔

"ابھی اسے گئے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ تین چار مسلح آدمی وہاں آگئے انہوں نے نواب اور اس کے ساتھیوں کو دھمکانا شروع کر دیا کہ مفرور کو انہوں نے چھپا رکھا ہے۔ انہوں نے ساری حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ پھر انہیں دھمکیاں دیتے چلے گئے۔ وہ بگولے کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔ شراب کا اثر بھی تھا۔ ان کے جانے کے بعد نواب کو خیال آیا کہ وہ لوگ اس زخمی کا تعاقب کیوں کر رہے تھے پھر ان کا خیال ڈائری کی طرف گیا۔ اس کے اوراق بوسیدہ اور تحریر شکستہ تھی۔ انہوں نے ڈائری کا مطالعہ کیا۔ اس میں اس علاقے کے ایک قدیم مندر سے متعلق چونکا دینے والی بات لکھی تھی کہ مندر کی فلاں جگہ کھدائی کرنے پر خزانہ برآمد ہوگا۔ یہ خزانہ دوران غدر (جنگ آزادی 1857ء) میں ایک ریاست کے

مہاراجہ نے یہاں چھپا دیا تھا۔ اسے دوبارہ نکالنے کی مہلت نہ مل سکی کیونکہ وہ غدر میں مارا گیا تھا......

"جس شخص نے یہ تحریر لکھی وہ راجہ کا دیوان تھا۔ یہ اس کی ذاتی ڈائری تھی۔ اب ساری بات نواب اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں آگئی کہ اصل معاملہ اس دفینے کا ہے وہ جگہ جس کا ذکر اس ڈائری میں موجود تھا۔ یہاں سے بمشکل بیس بائیس میل دور تھی۔

"نواب اور اس کے ساتھیوں نے اس خزانے کی تلاش کا ارادہ کر لیا۔ ابھی آدھی رات باقی تھی انہوں نے کل کا انتظار بھی مناسب نہ سمجھا اور خزانہ حاصل کرنے چل دیئے ڈائری کے مطابق ٹوٹا پھوٹا مندر بھی مل گیا، وہ مختلف نشانیاں بھی وہاں موجود تھیں جن کا ذکر ڈائری میں کیا گیا تھا۔ ایک مخصوص مقام پر جس کی نشاندہی ڈائری نے کی۔ انہوں نے کھدائی شروع کر دی۔ ان کی توقعات کے مطابق جلد ہی وہاں سے چاندی کے پرانے سکے دستیاب ہونے لگے۔ اس کے بعد کچھ پرانے برتن نکلے اور دو گھنٹے کی جان لیوا کھدائی کے بعد گوہر مقصود بھی ہاتھ آگیا۔ یہ ساگوان کی لکڑی کے تابوت میں رکھی ہوئی سونے کی ایک مورتی تھی جس پر بڑا نفیس ہیروں کا جڑاؤ کیا گیا تھا......

"عین اسی لمحے جب وہ مورتی کو دیکھ رہے تھے، گورو کے مسلح ساتھی آدھمکے اور انہیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ انہوں نے نواب کے ساتھیوں کو دھمکی دیتے ہوئے بتایا کہ وہ تو ان کا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں شک تھا کہ ڈائری یہیں موجود ہے...... مختصر یہ کہ بات یہاں ختم ہوئی کہ مورتی کے عوض نواب اور اس کے ساتھی ہمیں 20 ہزار روپے دیں گے۔ جو اس زمانے میں بہت بڑی بات تھی لیکن یہ بھی مد نظر رہے کہ مورتی بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم کی نہیں تھی۔ راتوں رات خفیہ تجوریوں کے منہ کھل گئے اور ان لوگوں نے آپس میں مل کر 20 ہزار روپیہ ہمیں فراہم کر دیا۔ صبح جب انہوں نے کسی سنار یا جوہری کو بلا کر مورتی کی قیمت معلوم کرائی

ہو گی تو انہیں یہی جواب ملا ہو گا کہ یہ سب مال نقلی ہے۔ اس واقعے نے بہت شہرت حاصل کی اور کئی روز تک زبان زد خاص اور عام رہا......

میرے گورو نے ایسی بے شمار وارداتیں کی تھیں۔ وہ بتایا کرتا تھا کہ یہ پیشہ اسے ورثے میں ملا ہے اور اس کی تقریباً آدھی مجرمانہ زندگی بنارسی ٹھگوں کے ساتھ گزری ہے ان دنوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ پولیس مجرم کو پکڑ کر دم لیتی تھی۔ سزا اتنی سخت کہ جو ایک مرتبہ جیل میں چلا گیا۔ وہ ساری عمر جیل کے تصور ہی سے کانپتا رہا۔ جیلوں میں آج کل جیسی سہولتیں نہیں ملتی تھیں...... خزانے والی واردات شاید اس دور کا سب سے بڑا فراڈ تھا۔ جس نے پولیس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بڑے بڑے ہوشیار پولیس افسر اس کیس پر کام کرنے لگے۔ لیکن ہم اسی روز وہ شہر چھوڑ گئے تھے۔ ہمارے گروہ کا ایک آدمی اس واردات کے تقریباً ایک سال بعد کسی اور واردات میں گرفتار ہوا تو اس نے پولیس کو اس واردات کی تفصیل بتادی۔ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی پکڑے گئے۔ لیکن میں اور گورو محفوظ رہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک تھا لیکن جس طرح پولیس اور سی۔ آئی ڈی ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ہمیں ہندوستان میں کم از کم اتنے بڑے پیمانے پر واردات کرنے کا موقع پھر نہ مل سکا۔

"یہ غالباً 1947ء کا دوسرا یا تیسرا مہینہ تھا۔ میں اب کڑیل جوان بن چکا تھا۔ گھر سے فرار ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا اس دوران میں نے کبھی کبھی گھر آنا جانا بھی شروع کر دیا۔ لیکن میرے گھر والے جواب میری حقیقت جان چکے تھے۔ مجھ سے کھنچے لگے۔ ایک روز والد نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر راہ راست پر آجاؤ تو بسم اللہ ورنہ جہاں جی چاہتا ہے چلے جاؤ۔ ٹھگی اور نوسربازی میری سرشت میں داخل ہو چکی تھی۔ میں اپنے شہر بھی آتا تو اکا دکا واردات کر دیتا۔ ایک مرتبہ پولیس میرے گھر کے دروازے تک آکر واپس آگئی۔ اس کے بعد میں نے مناسب نہ سمجھا کہ دوبارہ یہ نوبت

آئے۔ میں نے ایمانداری سے اپنے حالات پر غور کیا، میں برائی کی دلدل میں اس قدر گہرا دھنس چکا تھا کہ نکلنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ میرے ماں باپ اور بہن بھائی بھی میری وجہ سے بدنام ہو رہے تھے۔ لیکن برائی جیت گئی اور میں ہار گیا۔ دوستوں نے مجھے گھر سے بھاگ چلنے پر مجبور کر دیا......

اب میں تھا اور میرا گورو...... ایک روز بڑا عجیب حادثہ گزرا، گورو نے ایک بازار میں ایک انگریز کو تاڑا۔ جس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں پرس رکھا ہوا تھا۔ ہمارا طریقہ واردات یہ تھا کہ ایک شخص سائیکل پر تیار رہتا۔ دوسرا واردات کرتا۔ خطرے کی صورت میں وہ سائیکل کی طرف بھاگتا۔ سائیکل چلانے کے ہم ماہر تھے۔ وہ سائیکلوں کا دور تھا۔

میرے استاد کے ہاتھ بڑے پکے تھے۔ لیکن اس روز اس نے اناڑیوں کی طرح کچا ہاتھ ڈالا۔ انگریز خبردار ہو گیا۔ استاد کے ہاتھ بٹوہ تو آگیا تھا۔ لیکن اس نے انگریز کو چوکنا ہوتے دیکھا تو فوراً چاقو نکال لیا۔ یہ انگریز کوئی عام آدمی نہیں بلکہ علاقہ کا ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ ہم چونکہ یہاں نئے آئے تھے۔ اس لئے اسے نہیں جانتے تھے......

"پولیس کپتان پہلے ہٹا اور پلٹا تو اس کے ہاتھ میں سرکاری ریوالور دکھائی دیا استاد نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چاقو کو ٹھگوں کے مخصوص انداز سے گھما کر اس پر پھینکا۔ نشانہ چوک گیا اور بجائے دل میں پیوست ہونے کے چاقو اس کے کندھے میں لگا۔ پولیس کپتان نے فوراً ریوالور فائر کر دیا۔ اب استاد کے لئے سوائے فرار کے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا۔ وہ بھاگا اور دو گولیاں اس کی پشت میں لگیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ مجھ تک پہنچ گیا۔

"میرے تو پہلے ہی ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے اسے سائیکل پر بٹھایا اور سائیکل دوڑا دیا۔ پولیس کپتان کو زخم کاری لگا تھا۔ وہ گر پڑا اور لوگ

اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس مہلت سے ہم نے فائدہ اٹھایا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک محفوظ جگہ نہر کے کنارے پہنچ کر استاد کی سانس اکھڑنے لگی۔ اس نے مجھے سائیکل روکنے کے لئے کہا۔ میں نے استاد کو زمین پر لٹا دیا اور چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کے منہ میں پانی ڈالوں لیکن گورو نے ہاتھ کے اشارے سے رک جانے کو کہا۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس نے مرتے مرتے پہلی نصیحت کہ بچہ! یا تو اس دھندے سے توبہ کرلو۔ اگر جاری ہی رکھنا ہے تو کبھی کسی کو ساتھی نہ بنانا۔

"میں نے اس کے بعد ساری زندگی اس اصول پر عمل کیا اور کبھی کوئی با قاعدہ گروہ بنایا نہ کسی اور گروہ میں شامل ہوا۔ وقتی طور پر لوگ آتے جاتے رہتے اور دھندا چلتا رہا استاد کی موت نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا۔

لیکن گورو کی موت کا صدمہ مجھے کراچی لے گیا۔ کراچی بڑا شہر، بڑے لوگ، بڑے ہنگامے۔ شہر کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میرے دھندے کے لئے یہ شہر موزوں تھا۔ میں نے دھندہ شروع کر دیا اور ایک بار جیل جانا پڑا۔ اس قید کے دوران ایک پرانے ساتھی سے ملاقات ہوگئی۔ یہاں وہ جمالوں کے نام سے مشہور تھا۔ جمالو کو میں نے اپنے گورو کے ہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن گورو نے اس کا تعارف میرے ساتھ نہیں کروایا تھا۔ اس میں بھی یقیناً کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ میرا استاد بڑا گہرا آدمی تھا۔ اس کو مکمل طور پر خدا کی ذات ہی سمجھ سکتی تھی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ اس کی موت تک میں اسے ہندو سمجھتا رہا۔ مرنے کے بعد اس کے مسلمان ہونے کا علم ہوا اور اس بات کا بھی کہ وہ پنجاب کے ایک علاقے کا رہنے والا تھا......

"جو شخص میرے استاد کا ساتھی رہا ہو وہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ پتہ چلا کہ جمالو پر جعلی سونا فروخت کرنے کا الزام ہے۔ جعلی سونا فروخت کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ ہمارے پیشے کے بڑے پرانے گرگے ہی اس میدان میں پاؤں رکھنے کی ہمت

کرتے ہیں۔ جمالو دوسری بارک میں بند تھا۔ ہماری ملاقات جیل کے احاطے میں ہوئی۔ اس نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ گورو کے ذکر نے اسے کچھ سوگوار کر دیا تھا۔ بہت دیر تک میرے استاد کی باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں کسی زمانے میں بڑے پکے یار رہے تھے۔ پھر استاد کو اس سے الگ ہونا پڑا اور اس کی موت سے پانچ چھ ماہ پہلے ان دونوں کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔

"میں نے جمالو سے کہا کہ وہ میرے استاد کا پیر بھائی ہے۔ اس ناطے میں اس کا بھی شاگرد ہوں۔ یہ روز روز کی بک بک جھک جھک ٹھیک نہیں۔ کوئی سیدھا سادا نسخہ بتا دو کہ باقی زندگی آرام سے گزر جائے۔ جمالو پہلے تو خاموش رہا۔ پھر اگلے روز کچھ بتانے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے روز ہماری ملاقات ہوئی تو ہم دونوں اپنی اپنی مشقت سے فارغ ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ جمالو پہلے تو چپ چاپ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔ "پیر بنو گے؟"...... مزے کرو گے بیٹا! میرے پیر بھائی کے شاگرد ہو ورنہ یہ راز تو قبر میں میرے ساتھ جاتا......"

ضرور بنوں گا۔" میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

"جا بچہ موج کر، اب ساری زندگی کوئی دھندہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔" اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دی اور میری ٹریننگ شروع ہوگئی......

"میری سزا چھ ماہ تھی۔ ایک مہینہ معافی کا باقی پانچ ماہ میں جمالو سے ٹریننگ لیتا رہا۔ اس دوران میں نے داڑھی بڑھا لی تھی اور اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے نمازیں پڑھنا بھی شروع کر دیں۔ آخری ایک ماہ میں نے بغیر نہائے گزارا اور جیل سے رہا ہو کر نکلا تو میرے سر کے الجھے ہوئے اور داڑھی کے بے ترتیب بالوں نے مجھے کوئی اور ہی بہروپ دے دیا تھا۔

"باہر آکر میں نے اپنے دو قابل اعتماد ساتھی تلاش کئے اور ایک عورت کو ہمراہ لیا

جو ہمارے دھندے میں ہمارے لئے اکثر کام کرتی رہتی تھی۔ سبز رنگ کا ایک لمبا سا چولا جس میں بے شمار جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے زیب تن کر لیا۔ اس کی مختلف جیبوں میں کیا الم غلم موجود تھا۔ اس کا علم میرے اور خدا کی ذات کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ پنجاب کے ایک دور دراز اور خاصے جاہل علاقے کو ہم نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا اور جانگلیوں کے ایک گاؤں کا انتخاب کر لیا۔

"گاؤں کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے میں نے ڈیرے ڈال دیئے اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ علی الصبح جب گاؤں کے کچھ لوگوں نے وہاں ایک فقیر خدا مست کو دیکھا تو میرے نزدیک آگئے اور ایک گھنٹہ مجھے بلانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میں خاموش رہا۔ بلکہ ان سے بالکل بے نیاز منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ وہ بے چارے بھاگے بھاگے گاؤں میں گئے اور ایک پیر فقیر کی موجودگی کی دھوم مچا دی۔ گاؤں کے لوگ اس طرف امڈتے چلے آئے...... تین روز تک وہ لوگ مجھے متوجہ کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے۔ دنیا بھر کے لوازمات کا ڈھیر انہوں نے میرے سامنے لگا دیا لیکن میں نے ان کی طرف نظر بھی نہ کی اور اپنے حال میں مگن رہا۔ یہ تین دن اور راتیں میں نے جاگ کر گزار دی تھیں اور اس کے لئے پہلے سے کافی پریکٹس کر رکھی تھی۔ چوتھے روز میری طرف سے پہلی "کرامت" کا مظاہرہ ہوا۔

"میرا ایک ساتھی ایک بچے کو لئے آیا جسے بھڑ نے کاٹا تھا اور بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ میں نے اس کے ڈنک پر ہاتھ پھیرا۔ بچہ پرسکون ہو گیا۔ اس کو سوجن بھی نہ ہوئی اور آرام آگیا۔ جانگلی لوگ فوراً میرے گن گانے لگے۔ یہ بالکل معمولی سی بات ہے۔ اگر آپ بھی چاہیں تو یہ قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ ساون بھادوں سے پہلے آموں پر بور آجاتا ہے۔ اگر آپ آم کے بور کو دیر تک ہاتھوں میں مسلتے رہیں اور یہ عمل تین چار روز جاری رکھیں تو دو اڑھائی ماہ تک آپ کو بھی یہ قوت حاصل ہو جائے گی کہ بھڑ

کے کاٹے پر ہاتھ پھیر دینے سے سوجن نہیں رہے گی، اس کے بعد تو وہاں بھڑ سے کاٹے ہوئے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

"دوسری کرامت کا مظاہرہ بھی تھوڑی ہی مدت کے بعد ہو گیا۔ ایک عورت درد سے بے حال چیختے چلاتے بچے کو لے کر آئی۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے ایک کمرہ سا بنا دیا تھا۔ میں اس میں بند یاد الٰہی میں مصروف رہتا اور وہ باہر جمگھٹا لگائے بیٹھے رہتے۔ دن میں ایک دو مرتبہ میں باہر آکر ان کو اپنے درشن کروا دیتا۔ صرف ایک شخص کو اندر جا کر مجھ سے ملنے کی اجازت تھی اور وہ میرا خاص آدمی تھا۔

"یہ روتا ہوا درد سے بے حال بچہ ہمارے گروہ کی اسی عورت نے وہاں پہنچایا تھا اس کے خاوند نے باہر کھڑے ہو کر التجا کی کہ بچے کے حال پر ترس کھا کر اس کے لئے دعا کروں۔ میں دروازے پر آیا چیختے چلاتے بچہ پر نظر ڈال کر اندر چلا آیا۔ اندر بیٹھ کر میں نے افیون ملی سیاہی سے تعویذ لکھا اور اسے دے دیا۔ میرے خادم خاص نے وہ تعویذ پانی میں گھول کر بچے کو پلایا۔ چند منٹ کے بعد ہی بچہ گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے ماں باپ میرے پاؤں میں پڑے مشکور ہو رہے تھے۔

"اس علاقے میں جوہڑ بے شمار تھے اور مچھروں کی بہتات سے ملیریا پھیل رہا تھا میرے گروہ کے لوگ کونین کا سفوف مجھے پہنچا دیتے اور میں چینی میں ملا کر اس پر جنتر منتر پڑھ کر پھونکتا اور مریض کو پانی میں گھول کر پی جانے کی ہدایت کرتا۔ چینی کا ذائقہ کونین ملنے سے کڑوا ہو جاتا۔ جسے میرے خاص لوگ پیر جی کے کلام کا اثر بتاتے۔ یہ سفوی ملی چینی پیتے ہی مریض کو خوب پسینہ آتا اور بخار اتر جاتا۔

"اسی طرح مختلف امراض کا علاج ہونے لگا۔ سر درد دانت درد دور کرنے کا تو میں اسپیشلسٹ بن گیا۔ دور دراز کے گاؤں سے لوگ علاج کروانے میرے پاس آنے لگے۔ میں سارے دن میں صرف دو گھنٹے "فیض" پہنچاتا باقی تمام وقت حجرے میں لیٹا

رہتا۔ جہاں میرے مقربین میری خاطر مدارات میں مصروف رہتے۔ رفتہ رفتہ میرا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ نذرانے کے نام پر دولت کے ڈھیر لگنے لگے۔ میرے لئے خصوصی کھانے پک کر آتے لوگوں کی شدید خواہش ہوتی کہ میں ان پر خصوصی مہربانی فرماتے ہوئے ان کے ہاں کچھ دن کے لئے قیام کروں لیکن میں سو میں سے بمشکل پانچ خوش قسمتوں کو شرف باریابی بخشا کرتا......

"ان لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر میں نے دونوں ہاتھوں سے انہیں خوب لوٹا۔ میری ایجنٹ عورت لوگوں کے گھروں میں چلی جاتی اور گھر کے کسی کونے میں چوری چھپے (تعویذ) سر کے بال اور اسی طرح کی کچھ چیزیں چھپا دیتی۔ اس کے بعد بڑی استادی سے وہ ان لوگوں کو وہم میں مبتلا کرتی کہ ان پر کسی دشمن نے جادو کروا دیا ہے۔ انہیں میرے پاس لایا جاتا اور میں چلہ کاٹ کر اگلے روز حقیقت حال بتانے کا وعدہ کرتا۔ اگلے روز میں بڑے جلال میں آکر انہیں حکم دیتا کہ فلاں جگہ سے تعویذ یا فلاں شے زمین کھود کر برآمد کرلو۔ اس کے بعد وہ میرے پکے مرید ہو جاتے۔

"ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ میں نے ایک اور گھناؤنا دھندا بھی شروع کر دیا انسانی ہوس اسے کیا کیا راہ سجھاتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ بھی مجھے یہ روپ دھارنے کے بعد ہوا تھا۔ دیہات کی عورتیں مجھ سے مختلف مرادیں پوری کرانے آیا کرتی تھیں۔ کسی کو وہم تھا کہ اس کے ساس نے اس کے خاوند پر تعویذ کروا کر اسے قبضے میں کیا ہوا ہے تو کوئی اپنے خاوند کو بندۂ بے دام بنانے کی فکر میں ہلکان رہتی تھی، کوئی عورت کسی کے ساتھ خراب تھی تو کوئی کسی غیر مرد کو حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

"ایسی عورتوں کو میں اکیلے اکیلے اپنے حجرے میں بلایا کرتا تھا۔ ایک روز ایک انتہائی حسین الہڑ قسم کی مٹیار میرے پاس آئی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ برس تھی اور اس کا خاوند جو اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ بلا مبالغہ اس کے باپ سے زیادہ عمر کا

تھا۔ لڑکی کے ماں باپ نے اسے زمیندار کے ہاتھ فروخت کر کے اس کا بیاہ کیا تھا۔ اس نے رو رو کر مجھے بتایا کہ اس کے جذبات کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اس قسم کی عورتیں اور بوڑھوں کی نوجوان بیویاں میری خاص مریدنیاں بن جاتی تھیں۔ میں بے اولاد عورتوں کو اولاد بھی دیا کرتا تھا۔ میرے گروہ کے دوسرے لوگ بھی اس گھناؤنے کھیل میں میرا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی اندھی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ ساری رات کے لئے اپنی بیٹیوں کو میرے ہاں چھوڑ جاتے کہ پیر صاحب رات کو ان کے لئے چلہ کاٹ کر ان پر پھونکیں مارتے ہیں......

"دو سال تک میرا یہ کھیل جاری رہا۔ ایک روز ایک خیال میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ میں نے کہا کہ سو دن چور کا اور ایک دن سادھ کا۔ آخر کبھی نہ کبھی تو یہ بھید کھلے گا۔ یہ جانگلی لوگ ہمارا امراد بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔ قتل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی۔ راتوں رات میں نے وہ رقم سنبھال لی۔ اپنے اس بہروپ سے نجات حاصل کی اور وہاں سے جان بچا کر نکل آیا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے شہر کا رخ کیا اور بڑی کامیابی سے یہ ناٹک وہاں بھی کھیلتا رہا۔

"پانچ چھ سال میرا یہ دھندہ جاری رہا۔ لیکن ایک روز ایک گاؤں کے لوگوں کو مجھ پر شک گزرا۔ انہوں نے مجھے کسی کی بیوی کے ساتھ پکڑ لیا۔ میرا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا اور سارے گاؤں میں گھمایا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے میری اچھی خاصی ٹھکائی کی اور مجھے حوالے پولیس کر دیا۔

اس جرم میں دو سال قید بھگت کر میں رہا ہوا تو پھر کبھی یہ سوانگ نہ بھرا ایک اور شہر کا رخ کیا اور چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دیں۔ اس دوران کئی مرتبہ جی میں آئی کہ اس دھندے پر لعنت بھیج کر اپنا گھر بساؤں اور زندگی کے بھلے چنگے دن گزار لوں۔ لیکن

ہائے رے انگریز کے قانون کی برکتیں جو وہ یہاں چھوڑ گیا ہے اس ملک میں جس شخص کا نام ایک دفعہ پولیس کی لسٹ میں آگیا وہ پھر کبھی شریفانہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے زندہ رہنے کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ چپ چاپ پولیس کو اس کا حصہ پہنچاتا رہے اور اپنے کام میں جتا رہے۔ جب کبھی میں نے غلوص دل سے اس بات کی کوشش کی کہ میں یہ ذلیل پیشہ چھوڑ دوں۔ مجھے کسی نہ کسی الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ یہ میرے عروج کا زمانہ تھا۔ ان دنوں میں ہاتھ ذرا لمبے ہی مارا کرتا تھا۔ میرے علم میں بابو صدیق نام کا ایک آدمی آیا۔ جسے راتوں رات امیر بننے کا شوق تھا۔ ایسے لوگ جو لالچ اور ہوس کے مارے ہوئے ہوں۔ ہمارے خاص شکار بنتے ہیں۔ میں نے اسکیم تیار کی اور بابو صدیق سے ہم نے کہا کہ ہمارے آدمی انڈیا سے چیزیں لے کر آئے ہیں جو ہم سستے داموں اسے مہیا کر سکتے ہیں۔

"بابو صدیق کے تعلقات ایک سنار سے تھے۔ اس نے سنار سے 20 ہزار روپے ادھار پکڑے اور اپنی زندگی بھر کی جمع شدہ پونجی بھی اس میں شامل کر کے پچاس ہزار روپے کا بندوبست کر لیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ واہگہ سے آنے والی ٹرین میں ہمارا آدمی مال لے کر آئے گا۔ تم اس سے مال وصول کرنے کے بعد اسے رقم ادا کرو گے۔ دس ہزار روپیہ ہم نے ایڈوانس اس سے حاصل کر لیا۔ ڈرامہ تیار تھا۔ بابو صدیق چالیس ہزار روپیہ بیگ میں لئے مقررہ مقام پر چاندی کا منتظر تھا۔ بالآخر ٹرین آئی اور ہمارا متعلقہ آدمی چاندی کا بھرا بیگ لئے اس طرف آگیا۔ ہم نے بابو صدیق کو یقین دلا رکھا تھا کہ کسٹم والے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

"چاندی آئی۔ بیگ کے اوپر کے حصے میں چمکتا ہوا سلور رکھا تھا۔ جسے ہم نے

چاندی کی شکل دے رکھی تھی۔ ابھی وہ لوگ معائنے میں مصروف ہی تھے کہ "انٹیلی جنس" کا جعلی چھاپہ پڑ گیا۔ باقاعدہ وردیوں میں ملبوس "اسپیشل ڈیوٹی" کے لوگوں نے چھاپہ مارا تھا۔ انہوں نے چاندی اور چالیس ہزار روپیہ قبضہ میں لے لیا اور ہمارے "منت سماجت" کرنے پر بابو صدیق کو رہا کر دیا۔

"یہ سب کچھ پہلے سے تیار کردہ ڈرامہ کا حصہ تھا۔ سمگلر، چاندی، انٹی سمگلنگ، سپیشل سٹاف سب کچھ جعلی تھا۔ بابو صدیق عزت دار آدمی تھا۔ اس نے راتوں رات لکھ پتی بننے کے لالچ میں رقم اکٹھی کی تھی گھر میں جوان بیٹی ہاتھ پیلے کرنے کے لئے تیار تھی۔ لڑکے والوں کا تقاضا رخصتی کے لئے بڑھتا جا رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے دو ماہ میں بیاہ دینے کا چیلنج کر دیا۔ کیونکہ لڑکے کو باہر جانا تھا۔ ان سارے عوامل نے مل ملا کر اثر دکھایا۔ ایک روز یہ منحوس خبر ملی کہ بابو صدیق نے خودکشی کر لی ہے، میں لاکھ برا سہی۔ لیکن ابھی میرا ضمیر شاید زندہ تھا کہ میں نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور خود کو اس کی موت کا ذمہ دار گردانا۔ میرا آنا جانا بابو صدیق کے گھر تھا۔ اس کی موت نے ایک برے انسان کو نیکی کا راستہ دکھا دیا۔ میں نے اس کے گھر والوں کو یقین دلایا کہ میں انہیں کبھی بابو صدیق مرحوم کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا اور ان کی خدمت میں جت گیا۔ میں نے بابو صدیق کی روح کو خوش کرنے کے لئے نہ صرف اس کا قرض ادا کیا بلکہ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر ڈولی میں بٹھایا اور رخصت کیا۔ ممکن ہے اس عمل سے میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔

شکست خوردہ

اگست اور ستمبر 1965ء میں اگر آپ "صدائے کشمیر" ریڈیو سنتے رہے ہوں تو آپ کو یاد ہو گا کہ کشمیر کے حریت پسندوں نے مقبوضہ کشمیر کے اندر جہاں بھارتی فوج کے کنوائیوں کو تباہ کیا تھا وہاں بہت سارے پلوں کو بھی تباہ کیا تھا۔ جس سے مقبوضہ کشمیر پر قابض فوج اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس کا کشمیر میں ٹھہرنا محال ہو گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ مقبوضہ کشمیر حریت پسند گوریلوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ فرق صرف یہ رہ گیا کہ آزاد کشمیر کی فوج کو اندر جا کر باقاعدہ قبضہ کرنا تھا۔

صدائے کشمیر کی انہی خبروں میں اس پل اور اس مشین گن پوسٹ کا بھی ایک روز ذکر کیا گیا تھا جس کی میں کہانی سنانے لگا ہوں۔ بھارت والے ابھی تک شور مچا رہے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستان آرمی کے جوان گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ الزام کہاں تک غلط ہے، میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا ہوں کہ جہاں تک میری گوریلا پارٹی کا تعلق تھا، ہمیں پاکستان آرمی کی کوئی مدد حاصل نہیں تھی، نہ میں نے نہ میرے ساتھیوں نے کبھی پاکستان آرمی کا کوئی آدمی اس آپریشن میں دیکھا تھا۔ ہماری اپنی جنگ

تھی وہ ہمارے ہی باپ، چچے، قاور، ماموں تھے جنہوں نے 48-1947 میں ڈوگرہ راج کے خلاف مسلح بغاوت کی تھی اور ریاست اور بھارت کی پکی فوجوں کے خلاف لڑے تھے۔ اس وقت ہم بچے تھے۔ ہم بھی لڑنا چاہتے تھے لیکن ہمارے بزرگوں نے ہمیں پاکستان میں یا ان جگہوں پر بھیج دیا تھا جہاں ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی بہت سے لڑکے محاذ پر پہنچ گئے تھے۔ اور مجاہدوں کو ایمونیشن پہنچانے کے علاوہ لڑے بھی تھے۔

ہم یہی خواہش لے کر جوان ہوئے کہ ایک تو کشمیر کو ہندو سے آزاد کرائیں گے اور دوسرے یہ کہ نہتے کشمیری مسلمانوں کے خون کا بدلہ لیں گے۔ خدا نے سولہ برس بعد موقع عطا کر دیا اور ہم ماؤں سے دودھ بخشوا کر نکل کھڑے ہوئے۔ ہم بھارتیوں کے خلاف دل میں آگ لئے ہوئے جوان ہوئے تھے، اس لئے لڑنا مرنا ہمارے لئے کوئی عجیب اور خوفناک بات نہیں تھی۔ ہم ایک قسم کے پیدائشی فوجی تھے۔ ہم بہت سے لڑکے اکثر اکٹھے ہو کر سکیمیں بنایا کرتے تھے کہ مقبوضہ کشمیر میں ہم کس طرح تباہی مچا سکتے ہیں۔ جب ہم لکھ پڑھ گئے تو چین کے گوریلوں کے کارنامے پڑھنے لگے، پھر ویت نام کے وطن پرست گوریلوں کے کارنامے سامنے آنے لگے تو ہم نے ان کے جنگی طور طریقوں کو از بر کر لیا، آزاد کشمیر آرمی میں ہمارے گاؤں اور علاقے کے بہت سے آدمی تھی جو چھٹی آیا کرتے تھے تو ہم ان سے رائفل، مشین گن اور گرینیڈوں کے متعلق معلومات اور ان کے استعمال کے طریقے پوچھتے رہتے تھے۔ جب ہم جوان ہوئے تو فوجیوں کی بارکوں تک پہنچنے لگے، فوجی بھائیوں نے ہمیں تمام ہتھیار دکھائے اور دو تین بار فائرنگ رینج پر ان کی فائرنگ بھی دکھائی۔ ان ہتھیاروں کے دھماکوں سے ہمارا خون کھولنے لگتا تھا اور ایسی خواہش ہوتی تھی کہ یہ ہتھیار چرا کر اپنے گھر رکھ لیں۔

آخر وہ وقت آیا کہ وہ ہتھیار خود ہی ہم تک پہنچ گئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے کہ ہمیں ہتھیار اور گرنیڈ کہاں سے ملے۔ میں صرف

اتنا بتا دیتا ہوں کہ یہ پاکستان سے نہیں آئے تھے۔ ہم تین تین چار چار کی ٹولیوں میں مقبوضہ کشمیر کے اندر چلے گئے۔ وادیوں اور پہاڑی راستوں سے ہم خوب واقف تھے۔ ہم رات کو کسی چوکی یا اکیلی دکیلی فوجی گاڑی پر حملہ بولتے تھے۔ اس سے نہ صرف دشمن کو نقصان ہوتا ہے بلکہ ہمیں اسلحہ اور ایمونیشن مل جاتا تھا۔ ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ صبح سے پہلے پہلے اپنی سرحد کے اندر آئیں۔

ہماری ایک تنظیم جس کے تحت ہمیں کبھی کبھی اکٹھا کر کے سارے مقبوضہ کشمیر کی صورتحال سے آگاہ کیا جاتا تھا اور ہمیں نئی ٹارگٹ بتائے جاتے تھے۔ وہاں ہمیں یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ہماری تنظیم کے کون کون سے ساتھی شہید یا قید ہو چکے ہیں۔

گوریلا آپریشن کو پچیس چھبیس دن گزر چکے تھے اور مقبوضہ کشمیر کے اندر بھارتی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے تھے فتح ہمارے قدم چوم رہی تھی۔ کوئی پل سلامت نہیں تھا نہ کوئی چوکی رہ گئی تھی لیکن ایک روز ہمیں بتایا گیا کہ ایک ندی پر چھوٹا سا پل ہے جہاں پگڈنڈی گزرتی ہے۔ دشمن کی فوجیں اس پل کو استعمال کر رہی تھیں۔ پل کی پوزیشن ایسی تھی کہ دونوں طرف اونچی چٹانیں تھیں۔ ایک چٹان پر دشمن کی بڑی مشین گن کا "گھونسلہ" تھا۔ یہ گن پوسٹ چٹان میں ایسی جگہ لگی ہوئی تھی کہ دائیں بائیں اور پیچھے سے اسے چٹان نے محفوظ کر رکھا تھا۔ سامنے کا علاقہ ایسا کھلا تھا کہ زمین پر چوہا بھی چلے تو اوپر سے مشین گن کے گنروں کو نظر آ جاتا تھا۔ پیچھے جا کر گرنیڈ پھینکنا بالکل ممکن نہ تھا کیونکہ اس طرف سے چٹان دیوار کی طرح سیدھی تھی۔ دائیں اور بائیں سے بھی اوپر چڑھنا آسان نہ تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ دائیں بائیں دشمن نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔

اس پل کو تباہ کرنے کے لئے ہماری دو پارٹیاں گئی تھیں جن میں تین تین جوان تھے۔ پہلی پارٹی گئی اور کبھی واپس نہ آ سکی۔ دوسری پارٹی کا بھی یہی حشر ہوا۔ تیسری

پارٹی میں پلندری تحصیل کے دو آدمی تھ، ان میں سے ایک رینگتا ہوا پل تک پہنچ گیا۔ اس کے پاس ڈائنامیٹ تھا۔ اس کا ساتھی ہلکی مشین گن لئے پیچھے رہا تاکہ اپنے ساتھی کی حفاظت کر سکے۔ جب اس کا ساتھی پل تک پہنچا تو چٹان کے اوپر سے مشین گن کی دھاڑ سنائی دی۔ گن کی پوری بوچھاڑ اس جانباز کے جسم سے پار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے ڈائنامیٹ تھا جو گولی لگنے سے ہیبت ناک دھماکے سے پھٹا۔ اب آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس شہید کے جسم کا کیا حال ہو گا۔ اس کے ساتھی کو پہلی بار معلوم ہوا کہ پل کی حفاظت کے لئے دشمن نے مشین گن لگا رکھی ہے۔ وہ رینگ رینگ کر ایسی آڑ تلاش کرنے لگا جہاں سے وہ اس مشین گن کو اپنی مشن گن سے ختم کر سکے مگر دشمن کی گن پوزیشن ایسی تھی کہ کسی طرف سے زد میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس مجاہد نے یہی بہتر سمجھا کہ واپس آ کر اپنے ہیڈ کوارٹر کو خبردار کر دے کہ اس پل کو انتہائی خطرناک پوزیشن سے ایک مشین گن کور کر رہی ہے۔

ہیڈ کوارٹر نے اس مجاہد کی رپورٹ کے مطابق اگلی رات تین مجاہدوں کی پارٹی بھیجی۔ انہیں پوری طرح ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ وہاں کس طرح کے خطرات ہیں لیکن وہ پارٹی بھی واپس نہ آ سکی۔

چوتھے روز میری پارٹی کے ایک مجاہد نے رضاکارانہ کہا کہ اس پل اور مشین گن کو ہم تباہ کریں گے۔ میں بھی تیار ہو گیا۔ چنانچہ ہم چار آدمی اس آدم خور مشین گن کے شکار کے لئے رات کی تاریکی میں روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ چوتھا آدمی وہی تھا جو اس مشین گن کی خبر لایا تھا۔ راستہ اسی کو معلوم تھا۔ ہم ہر بار نئی جگہ سے سرحد پار کرتے تھے۔ اس رات بھی ہم ایک نئی جگہ سے خیریت سے پار نکل گئے۔ ہمارے پاس ڈائنامیٹ کا ایک سیب، چھ چھ گرینیڈ اور ہر ایک کے پاس ٹین گن تھی۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم بھارتی فوج کے ایک گشتی دستے کے نرغے میں آ گئے اور

جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ دو بھارتی میرے سر پر آکر رک گئے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی آدمی نہیں گیدڑ ہو گا"---

دوسرے نے کہا--"حوالدار کہتا ہے کہ اس نے دو تین آدمی دیکھے ہیں۔"

پہلی نے گالی دے کر کہا---"حوالدار کو خواب میں بھی پاکستانی نظر آتے رہتے ہیں۔"

یقین کیجئے ان دونوں بھارتیوں اور مجھ میں صرف آٹھ دس انچ کا فاصلہ تھا۔ اگر وہ پیچھے ہٹتے تو ان کا پاؤں میرے اوپر پڑتا۔ میں انہیں پیچھے سے آسانی سے ختم کر سکتا تھا لیکن ہمارا مشن کچھ اور تھا۔ ہم راستے میں کسی سے الجھنے سے گریز کر رہے تھے۔ اتنے میں کوئی سوڈیڑھ سو گز دور سے گیدڑ کی آہو آہو سنائی دی۔ ایک بھارتی سپاہی نے حوالدار کو غلیظ گالی دے کر کہا--"دیکھا نا گیدر کو پاکستانی کہہ رہا ہے۔"

دوسرے سپاہی نے کہا--"یہ حوالدار سور کا بچہ ہمیں کسی دن پاکستانیوں سے مروائے گا--چلو چلیں۔"

ان جاہلو کو معلوم نہ تھا کہ آہو آہو کی آواز گیدڑ کی نہیں میرے ایک ساتھی کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ خطرہ ٹل رہا ہے۔

○

آخر خطرہ ٹل گیا۔ بھارتیوں کا گشتی دستہ جو غالباً جاٹ رجمنٹ کا تھا پہاڑی نشیب و فراز میں غائب ہو گیا۔ اور کوئی بیس منٹ بعد ہم چاروں ساتھی اکٹھے ہو کر آگے کو چل پڑے۔ صبح کاذب کا وقت ہو گا جب ہم ہانپتے ہوئے چھوٹی سی ایک وادی میں پہنچے تو ہمارے رہبر ساتھی نے کہا "یہیں رک جاؤ۔ پل چار پانچ فرلانگ رہ گیا ہے--"

ہم رک گئے۔ میرے ایک ساتھی نے جھولے (فوجی تھیلی) سے مکئی کی میٹھی

روٹیاں نکالیں جو ہم سب نے کھالیں۔ ہم بہت تھک گئے تھے لیکن نیند کا ذرہ بھر احساس نہ تھا۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ مشین گن کو ختم کر کے پل کو برباد کرنا ہے۔

وہیں صبح ہو گئی۔ قریب ہی گھنی جھاڑیاں اور ان کے ساتھ پہاڑی میں کھوہ سی تھی۔ ہم وہاں دبک گئے۔ دن کے وقت اس علاقے میں گھومنا پھرنا ایسے ہی تھا جیسے کوئی موت کے منہ میں پھر رہا ہو۔ پھر بھی میں اپنے راہنما کو ساتھ لے کر چھپتا چھپاتا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے پل نظر آتا تھا۔ اسکے دونوں طرف چٹانیں تھیں اور جس چٹان پر مشین گن لگی ہوئی تھی وہ بہت اونچی تھی۔ میں نے پوری طرح جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ پل کو اڑانا آسان نہیں۔

ہم واپس آرہے تھے کہ اچانک ہمیں ایک کشمیری لڑکی نظر آئی۔ وہ سر پر گٹھڑی سی رکھے حیران و پریشان چلی جا رہی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں فیصلہ کرتا اس لڑکی سے چھپے رہیں یا کیا کریں کہ میرے ساتھی نے اوٹ سے اٹھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ لڑکی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن میرے ساتھی نے یہ کہہ کر کہ "ہم مسلمان ہیں" اسے خاموش کر دیا۔

بھولی سی لڑکی بیس اکیس برس کی عمر کی ہو گی۔ وہ کشمیر کی لڑکیوں کی طرح خوبصورت تھی لیکن اس کے چہرے پر مظلومیت اور اذیت کے آثار تھے۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ ہم اسے اوٹ میں لے گئے۔ میرے ساتھی نے پھر کہا۔

"ہم مسلمان ہیں اور آزاد کشمیر سے آئے ہیں۔"

لڑکی نے پوچھا--"تم بھی ہندوؤں سے لڑائی کرنے آئے ہو؟"--اس کی آواز میں خوشی نہیں تھی نہ غم تھا، نہ اس کی آواز میں جوش تھا نہ ہی اس کی آواز مری ہوئی تھی۔ کہنے لگی--"تم کشمیر کو کب آزاد کراؤ گے؟ یہاں جو آتا ہے مارا جاتا ہے۔ اس پل کے پاس آزاد کشمیر کے بہت سارے آدمی مارے گئے ہیں۔"

"تم کہاں رہتی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا "تمہارے ساتھ کون رہتا ہے؟"

اس نے اپنی مظلومیت کی بہت سی لمبی کہانی سناڈالی، اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کی آواز میں کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ رو بھی رہی تھی اور دانت بھی پیس رہی تھی۔ باتیں کرتے کبھی اس طرح ہو جاتی جیسے انسان نہیں پتھر ہے۔ اس کی داستان مختصراً یہ ہے کہ اس کے گاؤں (جو وہاں سے دو تین فرلانگ دور تھا) میں تین چار گھرانے بھاگ نہیں سکتے تھے۔ باقی گاؤں خالی تھا۔ اب ان کے لئے بھاگ کر آزاد کشمیر چلے جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ لوگ بھارتی فوجیوں کے لئے بیگار کرتے تھے۔ اور یہ لڑکی مسلسل غیر انسانی مظلومیت کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ گاؤں کے تمام جوان آدمی شہید کر دیئے گئے تھے۔ وہاں اب نو عمر لڑکے اور بوڑھے رہ گئے تھے جو فوجیوں کے لئے سامان اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر لے جاتے تھے۔ اگر کوئی فوجی دستہ اس علاقے میں قیام کرے تو عورتیں اس کے لئے کھانا پکاتی تھیں انہیں اس کی اجرت دو وقت کی روٹی کی صورت میں ملتی تھی۔

اس لڑکی پر جو ظلم و ستم ہو رہا تھا اس کی تفصیل نہیں سناؤں گا کیونکہ آپ اپنا خون پینے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ہم چار آدمی تو گئے ہی مرنے کے لئے تھے لیکن اس لڑکی کی باتیں سنیں تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم پل پر بھارتی مشین گن کا نشانہ بننے سے پہلے اس لڑکی کی عصمت کا انتقام لے کر مریں گے۔

لڑکی نے بتایا کہ یہاں سے دو میل دور ایک فوجی کیمپ ہے اور وہ وہاں ہندو افسروں کے چھوٹے موٹے کام کرنے جاتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی بیگار تھی۔ اسے وہاں حکماً بھیجا جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس پل اور چٹان پر لگی ہوئی مشین گن کو بہت اچھی طرح جانتی ہے اس نے کہا "تم میں سے کوئی بھی اس پل کو نہیں اڑا سکتا، تم سے پہلے یہاں بہت مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟"

میرے ایک ساتھی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "تمہاری عزت کی قسم ہم

11

واپس نہیں جائیں گے۔ کچھ کر کے جائیں گے اور تمہیں ساتھ لے کے جائیں گے یا تمہارے ساتھ یہیں مریں گے۔

لڑکی بھی جذباتی ہو گئی اور بے طرح رونے لگی۔ پھر اس نے باتیں شروع کیں تو ہمیں دشمن کی مشین گن کے متعلق نہایت کار آمد باتیں معلوم ہونے لگیں۔ لڑکی نے بتایا کہ اس مشین گن پوسٹ پر سات آٹھ آدمی ہیں۔ ان کے لئے ہر بدھ وار کی رات جیپ یا ٹرک پر پورے ہفتے کے لئے راشن آیا کرتا ہے۔ لڑکی نے کہا۔۔ بعض اوقات کافروں کے افسر مجھے دو دو تین تین رات اپنے پاس روک لیتے ہیں اور بدھ وار کے راشن والے ٹرک پر بٹھا کر یہاں بھیج دیتے ہیں۔"

وہ سوموار کا دن تھا اور یہ وہی سوموار تھا جس روز انڈین آرمی نے پاکستان پر حملہ کیا۔ ہمیں تو بعد میں پتہ چلا تھا۔ ہم چاروں ساتھی اکٹھے ہو گئے۔ ہم نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ اب کہاں جائے گی؟ اس نے خود اعتادی سے کہا۔ "جہاں تم جاؤ گے" جواب قدرتی تھا۔ ہم نے اسے کہا کہ انشاءاللہ اسے ساتھ لے چلیں گے۔

ہم ساتھیوں نے آپس میں مشین گن کی باتیں شروع کر دیں اور سکیمیں بنانے لگے۔ ہم میں سے کسی نے گرینیڈ کا نام لیا تو لڑکی نے بے تابی سے پوچھا "تمہارے پاس گرینیڈ ہے؟"

ہم نے کہا "ہاں؟"

وہ بولی "میں نے سنا ہے کہ گرینیڈ میں ایک چھلا ہوتا ہے اسے کھینچ کر پھینکو تو وہ دشمن کو اڑا دیتا ہے۔" ہم نے اسے بتایا کہ ہاں۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔

"ایک گرنیڈ مجھے دے دو۔" اس نے پرجوش لہجے میں کہا "میں اکیلی مشین گن اڑا دوں گی؟"

"نہیں" میرے ایک ساتھی نے کہا "یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ ہماری موجودگی میں

ایک لڑنے جائے ہمارے لئے شرم کی بات ہے۔"

لڑکی نے بجلی کی تیزی سے ایک ہاتھ میری کلائی پر اور دوسرا میرے گریبان پر رکھا اور چیخ کر بولی--"مجھے گرینڈ دو"--اس کی انگلیاں میری کلائی کے گرد اس قدر زور سے لپٹ گئیں جیسے میری کھال میں اتر گئی ہوں۔ میں نے اسے دیکھا تو اللہ کی قسم ڈر گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ چہرہ بھی سرخ اور اس کے دانت پس رہے تھے۔ وہ اب ایک خوبصورت اور مظلوم لڑکی نہیں۔ سراپا قہر بن چکی تھی میرے ایک ساتھی نے اسے کندھے سے تھام کر کہا--"بہن، صبر سے کام لو، یہ کام تمہارا نہیں۔"

وہ پھر چیخی--"مجھے گرنیڈ دو۔" وہ رونے لگی اور ساتھ ہی چیخ چیخ کر کہنے لگی--"مجھے گرنیڈ دے دو- یہ کام میرا ہے عزت میری لٹی ہے۔ تم بے غیرت مسلمان کشمیر کو کیا آزاد کراؤ گے، مجھے گرنیڈ دے دو- مجھے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا ہے"--اس کی انگلیاں میرے بازو میں اتر گئیں اور میرا گریبان جو اس نے ہاتھوں میں دبوچا تھا میرا گلہ دبانے لگا۔

بڑی مشکل سے اس سے گریبان چھڑوایا لیکن اس وعدے پر کہ اسے گرنیڈ دے دیں گے۔ ہمیں توقع تھی کہ اس کا ابال سرد پڑ جائے گا لیکن نہیں، وہ پاگل ہو چکی تھی۔

ہمارے رہبر نے اس سے پوچھا کہ وہ مشین گن پوسٹ پر کس طرح گرنیڈ پھینکے گی؟"

"بھارتیوں کو تم نہیں جانتے، میں جانتی ہوں"--اس نے کہا--"وہ مجھے دیکھیں گے تو اوپر بلالیں گے۔ کیونکہ وہ مجھے مظلوم اور غلام لڑکی سمجھتے ہیں۔ میں اوپر چلی جاؤں گی۔ وہ اپنے نشے میں بدمست ہوں گے اور میں ان کے درمیان گرنیڈ پھینک دوں گی۔"

میں اب سوچتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے کہ ہم نے ایک لڑکی کو گن پوسٹ تباہ کرنے کیلئے بھیج دیا تھا لیکن لڑکی کی اس وقت کی ذہنی حالت یاد آتی ہے تو تسلی ہوتی ہے

کہ ہمیں اس کی خواہش پوری کرنی چاہئے تھی، ورنہ وہ چیخ چیخ کر ہمیں پکڑوا دیتی۔

میں نے اسے گرنیڈ دیا تو اس نے پوچھا کہ یہ کیسے چلے گا؟ میں نے اسے بتایا کہ چھلا کھینچ کر پھینک دینا اور گرنیڈ پھینک کر خود لیٹ جانا یا اوٹ میں ہو جانا۔

لڑکی نے گرنیڈ ہاتھ میں لے لیا اور اس کے پاس جو چھوٹی سی گٹھڑی تھی اسے اس طرح ہاتھ میں اٹھا لیا کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں گرنیڈ بھی ہے۔

وہ آگے چل پڑی اور ہم رینگتے اور چھپتے اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ آدھے گھنٹے بعد دیکھا کہ لڑکی نیچے پگڈنڈی پر کھڑی اوپر مشین گن پوسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم زیادہ دور نہیں تھے۔ ہمیں مشین گن کا "گھونسلہ" صاف نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بھارتی سپاہی باہر نکلا اور ہاتھ ہلا کر بولا--"اوپر آجاؤ"--اور اس نے غلیظ سی بات کہہ دی۔

لڑکی اوپر چڑھنے لگی۔ اوپر جانے کا راستہ خاصا دشوار تھا۔ ایک دو دفعہ لڑکی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں بونے بونے درخت اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ مشین گن پوسٹ خاصی بلندی پر تھی۔ ہم نے دیکھا کہ دو اور سپاہی باہر نکلے اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ اتنے میں لڑکی کا سر نظر آیا، وہ مشین گن سے پندرہ بیس گز نیچے رہ گئی تھی۔

اچانک بڑے زور سے دھماکہ ہوا۔ جہاں لڑکی کا سر نظر آیا تھا وہاں سیاہ دھواں اور پتھر اڑے۔ بھارتی سپاہی بھاگ کر مشین گن کے بنکر میں گھس گئے۔ اس کے بعد لڑکی نظر نہ آئی۔ ہم ایک ہی بات سمجھ سکے--لڑکی نے شاید گرنیڈ کی پن نکال لی تھی لیکن اس کے سپرنگ کو مٹھی میں دبا کے رکھنا بھول گئی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے بتایا تھا یا نہیں کہ اسے دبا کر رکھے معلوم ہوتا ہے کہ گرنیڈا اس کے ہاتھ میں پھٹ گیا

تھا--کشمیر کی مظلوم لڑکی آزاد ہو گئی تھی۔

ہم پر سکتہ طاری ہو گیا اور ہم اپنی پناہ گاہ میں واپس آ گئے۔ اب ہمارے ذہن پر بدھ وار والا راشن ٹرک سوار ہو گیا۔ ہم نے سوموار کی رات، منگل کا دن اور رات، بدھ کا دن بھی وہیں چھپے چھپے گزارا۔ ہمیں کچھ علم نہیں کہ ٹرک رات کس وقت راشن لے کر آتا ہے۔ بدھ کی رات آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہم پناہ گاہ سے نکلے اور دور کا چکر کاٹ کر، مشین گن والی چٹان کے پیچھے سے گزرتے اس پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو آگے آ کر پل سے گزرتی تھی، ٹرک کے لئے یہی راستہ تھا۔ ہم پل سے خاصا دور پیچھے چلے گئے اور ایک آڑ دیکھ کر گھات میں بیٹھ گئے۔ خدا کی مدد شامل حال تھی۔ ہم اسی کے بھروسے یہ مہم سر کرنے آئے تھے۔ ہم گھات میں بیٹھے ہی تھے کہ دور سے ٹرک کی گونج سنائی دی۔ ہم سٹین گنوں پر میگزینیں چڑھا کر تیار ہو گئے لیکن فیصلہ یہ کیا کہ فائر نہ کریں کیونکہ پکڑے جائیں گے۔

ٹرک قریب آ گیا۔ اس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ یہ پندرہ ہنڈرڈ ویٹ ٹرک تھا۔ رفتار زیادہ نہیں تھی جونہی ہمارے قریب سے گزرنے لگا میرا ایک ساتھی ڈرائیور کی طرف سے ٹرک پر چڑھا اور آہستہ سے کہا۔ گاڑی روکو۔ میرے ہاتھ میں گرنیڈ ہے۔" ادھر سے میں چڑھ گیا اور سٹین گن گاڑی کے اندر کر دی۔ میرے دو ساتھی ٹیل بورڈ پر جا چڑھے اور آہستہ سے للکارا "خبردار، کوئی ہلا تو گولی مار دیں گے۔" گاڑی رک گئی۔

اس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک نائک اور پیچھے تین سپاہی بیٹھے تھے۔ حریت پسندوں کے کارنامے سن سن کر ان پر پہلے ہی دہشت طاری تھی۔ کیا مجال کہ ان میں کسی نے اونچی سانس بھی لی ہو وہ تو مٹی کے پتلے نکلے اور بے حد دہشت زدہ۔

انہیں نیچے اتارا پھر چار بھارتیوں کی وردیاں اتروائیں جو ہم چاروں نے پہن لیں۔ سر پر ان کی فولادی ٹوپیاں رکھیں۔ انہیں ہانک کر ٹیکریوں کی اوٹ میں لے گئے۔ ضرورت

کے سامان میں ہمارے پاس مضبوط موٹی رسیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہم نے ان کے ہاتھ اور پاؤں ایک ہی رسی سے باندھ کر انہیں پیٹ کے بل لٹا دیا اور ٹرک سے گندے کپڑے اور اپنے رومال نکال کر سب کے منہ میں ٹھونس دیئے۔ ہم ان پر فائر نہیں کر سکتے تھے ورنہ مشن چوپٹ ہو جاتا۔ ہمارے رہبر نے ان سے پوچھا "آج کا پاس ورڈ کیا ہے؟"

نائک نے جواب-- "گھوڑا"۔

اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر یہ "پاس ورڈ" غلط نکلا تو آ کر تمہیں جان سے مار دیں گے۔ نائک نے سر ہلا دیا کہ نہیں یہ ٹھیک ہے۔

میرا ایک ساتھی ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا۔ ساتھ ہمارا رہبر بیٹھا اور ہم دو پیچھے چڑھ گئے اور ٹرک چلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم مشین گن پوسٹ کے نیچے کھڑے تھے۔ رہبر نے ہارن بجایا تو اوپر سے آواز آئی-- "ہالٹ، ہکم ذر--ادھر سے جواب ملا فرینڈ، ادھر سے آواز آئی-- "پاس ورڈ"--ادھر سے جواب ملا۔ "گھوڑا" اوپر سے آواز آئی"-- پاس پر فرینڈ اور ہم چاروں اوپر چڑھنے لگے۔ اوپر سے آواز آئی۔ ارے کیا لائے ہو؟--سالے دال لائے ہوں گے"--میں نے جواب دیا-- "نہیں یار، آج تو تر مال ہے"--اوپر سے ہنسی کی آواز آئی--

اوپر چڑھنا محال تھا۔ قدم قدم پر پاؤں پھسلتا تھا۔ آخر ہم مشین گن کے "گھونسلے" تک جا پہنچے۔ ایک حوالدار نے پھر مذاق کرنا چاہا تو میں نے کہا "ارے سب اندر ہو جاؤ، میجر صاحب بھی آ رہے ہیں"--حوالدار بھاگ کر بنکر کے اندر چلا گیا اور اپنے سپاہیوں سے کہنے لگا "پوزیشن، پوزیشن، میجر صاحب آ رہے ہیں۔ ایمونیشن ٹھیک سے رکھو۔"

ہم نے انہیں اندر کر کے ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا۔ چاروں نے نہایت پھرتی سے ایک ایک گرنیڈ پرائم کر کے مشین گن پوزیشن کے چوڑے سوراخ سے اندر

پھینک دیا۔ ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے چار گرنیڈ پھٹے۔ ہم گرنیڈ پھینکتے ہی سوراخ کے نیچے لیٹ گئے تھے۔ اس قدر زور کا دھماکہ ہوا کہ پتھر دور دور تک اڑے اور ساری وادی میں دھماکے کی گونج کتنی ہی دیر بھٹکتی رہی "گھونسلے" کے اندر دو تین چیخیں سنائی دیں پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم نے دھواں دھار میں ٹارچ سے دیکھا "گھونسلے" کی چھت اڑ گئی تھی۔ اندر کوئی بھی زندہ نہ تھا۔ ایک میڈیم مشین گن پوزیشن میں تھی جو پرے جا پڑی تھی۔ دوسری الگ پڑی ہوئی تھی اور دو لاشوں کے نیچے مارٹر گن پڑی تھی۔

ہم نیچے آئے، نہایت اطمینان سے پل کے نیچے دیسی ساخت کا ڈائنامیٹ رکھا۔ یہ بتی والا ڈائنامیٹ تھا۔ بتی کو آگ لگائی اور دور بھاگ گئے۔ ایک منٹ بعد وادی ایک دھماکے سے لرز اٹھی اور پل کے پرخچے اڑ کر بکھر گئے۔

ہم نے ٹرک سے بھارتیوں کے ہتھیار اٹھائے۔ پھر وہاں گئے جہاں ٹرک والے بھارتی سپاہیوں کو باندھ آئے تھے۔ وہ اس طرح اوندھے منہ پڑے تھے۔ میرے ایک ساتھی نے سٹین گن کے فائر کا چھڑکاؤ کیا اور سب کو ٹھنڈا کر دیا۔

اس رات ہم واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ ہمارا مشن کامیاب تھا۔ میں آج بھی اس ہیبت ناک مہم کے متعلق سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے مہم سر کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے وہ کشمیری لڑکی یاد آجاتی ہے تو دل کی کیفیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ میرے آنسو نکل آتے ہیں اور دل اس طرح ڈوبنے لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بھی مہم سر نہیں کی۔۔ کشمیر ابھی تک غلام ہے۔ میں شکست خوردہ ہوں۔۔

فرار

یہ جاننے کے باوجود بھی کہ آج بارڈر پار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اور ہزار سمجھانے کے باوجود میں خود کرشی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ دراصل مجھ پر اب ایک ضد سی سوار ہو گئی۔ پچھلے ہفتے سے اب تک ہم چار مرتبہ ناکامی کا منہ دیکھ چکے تھے۔ پنجاب میں اس کے علاوہ کسی بھی جگہ سے بارڈر پار کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ دونوں طرف سے فوجوں نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔ مشرقی پاکستان میں حالات جوں جوں بگڑتے جا رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ مغربی محاذ پر بھی کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں جب کہ سرد جنگ عروج پر پہنچ جائے، فتح کا تمام تر انحصار انٹیلی جنس کی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ مجھے کشمیر کے ایک نہایت نازک مقام پر پہنچ کر چند ضروری معلومات حاصل کرنا تھیں۔ لمحہ لمحہ قیمتی تھا اور مجھے ہر لمحے سے فائدہ اٹھانا تھا۔

سیالکوٹ کی ایک تحصیل کا یہ سرحدی علاقہ جسے ہم نے اس مرتبہ چنا تھا۔ بہرحال کسی حد تک محفوظ تھا۔ چھوٹے چھوٹے نالے اور پہاڑی علاقوں نے کچھ ایسی پوزیشن اختیار کر لی تھی کہ کسی بھی بہترین تربیت یافتہ آرمی کے لئے اسے مکمل کیموفلاج کرنا

ناممکن تھا۔ یہ علاقہ عام طور پر ان چوروں کیت صرف میں تھا جو بارڈر کے دونوں طرف چوریاں کرتے ہیں۔ پاکستانی انڈین علاقے اور انڈین پاکستانی علاقے سے عام طور پر مویشی ہانک کر لے جایا کرتے تھے۔ میرا گائیڈ جس کی مدد سے میں بارڈر پار کر رہا تھا اس علاقے کا منجھا ہوا چور تھا۔ اسی نے نو سو چوہے کھانے کے بعد حج کو جانے کی ٹھان لی تھی۔ اب ایک عرصے سے وہ اپنا یہ آبائی پیشہ خیر باد کہہ چکا تھا اور انٹیلی جنس کے لئے خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ وہ مسلسل دو گھنٹے سے میرا سر کھا رہا تھا۔ "دیکھو یہ ستارہ فلاں وقت نکلتا ہے۔"--- "فائر ہونے پر کس طرف بھاگنا ہے"--- روشنی راؤنڈ فائر ہو تو ایسے چھپنا ہے"-- وغیرہ وغیرہ۔

دراصل میری کم عمری نے اس کے ذہن میں نہ جانے کس شک کو جنم دے ڈالا تھا۔ وہ سب کچھ مجھے ایک ہمدرد ہونے کے ناطے سمجھا رہا تھا۔ رات کے سائے پھیلتے ہی ہم نے پاکستان کو الوداع کہہ دیا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ مبادا تھوڑی سی آہٹ سے بھی دشمن ہوشیار ہو جائے۔ اب ہم بارڈر سے قریباً دو میل اندر آ گئے تھے۔ یہاں سے دیہی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ ہمارے سامنے ایک گاؤں تھا جس کے باہر بنے ہوئے مندر کی دیوار کے قریب بلب لٹک رہا تھا۔ بلب کی روشنی صرف اتنی تھی کہ ارد گرد کے دو چار مکانوں پر ہی پڑ سکے۔ گاؤں کے گرد ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم اسے بھی آگے نکل گئے۔ دراصل ہم کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ پھر ایک اور گاؤں آیا اور گزر گیا۔ ہم قریباً چار پانچ میل سرحد کے اندر گھس آئے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر میرا گائیڈ ٹھہر گیا۔ سامنے بڑی سڑک نظر آ رہی تھی۔

"وہ سامنے جو روشنی نظر آ رہی نا!--- وہ ہے دینا نگر۔ یہاں دے دینا نگر اور پٹھان کوٹ جانے والی لاری گزرے گی۔ مقامی علاقوں کے لئے "ٹمپو" بھی چلتے ہیں۔ یہاں سے شیزان پور، کٹوعہ اور سانبا کے لئے جیسا مناسب سمجھو کرنا۔ اچھا خدا حافظ!" اس

نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کچھ کہا اور ہاتھ ملا کر میرے پیچھے پھیلے ہوئے اندھیرے میں واپس رینگ گیا۔

جس جگہ میں کھڑا تھا اس کے قریب ہی سڑک پر بس سٹاپ تھا۔ یہاں مسافروں کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا دی گئی تھی۔ میں اس جگہ سے ہٹ کر قریباً سو گز دور درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میری گھڑی پر رات کا ایک بج رہا تھا اور پہلی لاری یہاں سے کم از کم چھ بجے گزرے گی، پانچ گھنٹے مجھے ابھی سرد میں ٹھٹھرنا تھا۔ میں نے بازو پر لٹکے ہوئے تھیلے میں سے کمبل نکالا اور اس سے اچھی طرح جسم ڈھانپ کر کپڑے کا تھیلا نیچے رکھا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کمبل کے اندر ہی منہ کر کے میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اندر ہی اس کے کش لگانے لگا سگریٹ کی روشنی کی طرح نزدیک سے بھی نظر نہ آ سکے۔

سگریٹ کے کش لیتے ہوئے میں دل ہی دل میں ان تمام ہدایات کو دہرا رہا تھا جو مجھے اختیار کرنا تھیں۔ اپنے مشن کو یاد کر رہا تھا جسے سرانجام دینا تھا اور آنے والے حالات سے نمٹنے کے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ چپے چپے پر انڈین سیکورٹی پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی سڑک، کوئی پل، کوئی لاری اڈہ، کوئی اسٹیشن، ہوٹل، سرائے، آشرم، مندر اور گردوارہ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود وہ سب کچھ کرنا تھا جس کے لئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔

پٹھان کوٹ کی طرف بہت دور مجھے ایک روشنی حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اس روشنی کا رخ پنجاب کی طرف ہو گیا۔ یہ کوئی آرمی کانوائے تھا جسے اب میرے سامنے والی سڑک سے گزرنا تھا۔ سگریٹ بجھا کر میں نے اسے اچھی طرح مسلا اور وہیں پھینک دیا۔ پھر کمبل اس طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا کہ سوائے آنکھوں کے اور کچھ نظر نہ آ سکے۔ میرے کمبل کا رنگ اتنا گہرا تھا کہ رات کو نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا

تھا۔ میرے سامنے بنے ہوئے بس سٹاپ پر ٹرکوں کی ہیڈ لائٹس کی مدھم مدھم روشنی پڑتی شروع ہو گئی تھی۔

"میرے خدا۔ یہ کیا، ٹرک تو رکنا شروع ہو گئے تھے۔ بیک وقت کئی خیال میرے دل میں آئے۔ کہیں یہ میرے استقبال کو تو نہیں آ رہے۔ ممکن ہے مخبری ہو گئی۔"

صرف اسی ایک بات کے ہونے سے میں پریشان تھا اس کے علاوہ کچھ بھی ہو میری بلا سے۔ مجھ سے قریباً ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر اب ٹرکوں سے جوانوں نے اترنا شروع کر دیا۔ جیپ سے بندھی ہوئی مختلف قسم کی توپیں میرے بہت قریب سے یادہ سے زیادہ پچاس گز کے فاصلے سے گزر رہی تھیں۔ یہ کانوائے سرحدی علاقے پر ڈیپلائے ہونے کے لئے آیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا اگر کمبخت اگر گھنٹہ پہلے آ جاتے تو۔ اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے گاؤں سے آگے بڑھ کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ یہ عمل رات گئے قریباً تین بجے ختم ہوا۔ اب ٹرک واپس جانے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہر طرف پہلے کی طرح سناٹا طاری ہو گیا۔ میرے لئے اب صبح کا انتظار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اور علاقے کے متعلق میری معلومات صرف سامنے والی سڑک تک محدود تھیں جو پنجاب اور جموں کشمیر کو ملاتی ہے۔ میں بڑی احتیاط سے اپنی کمین گاہ سے نکلا اور نپے تلے قدموں سے سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ اس بات سے میں بخوبی آگاہ تھا کہ جہاں آرمی ڈیپلائے ہوتی ہے وہاں رات کے وقت پٹرول (گشتی پارٹی) بھی ضرور ہوتی ہے اور پٹرول شروع ہونے سے پہلے میں وہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کم از کم گولی کی رینج سے دور۔ عافیت اسی میں تھی۔

میں سڑک کے پرلی طرف کھیتوں میں اتر گیا۔ اور سڑک کے ساتھ ساتھ دینا نگر کی طرف چلنے لگا۔ مجھے صرف اسی حد تک علم تھا کہ یہ سڑک گورداسپور اور پٹھان

کوٹ کو ملاتی ہے اور بس! میں اتفاق سے پنجاب کی طرف ہی جا رہا تھا گورداسپور کی طرف صبح قریباً پانچ بجے میں دینا نگر شہر کے نزدیک پہنچ گیا۔ شہر سامنے نظر آ رہا تھا۔ سورج افق سے ابھر رہا تھا۔ گاؤں سے گوالے دودھ کے بھرے ہوئے کین سائیکلوں کے دونوں طرف لٹکائے شہر کی طرف رواں دواں تھے۔ مندر اور گردواروں کے سپیکر اونچی اونچی آواز سے چلا رہے تھے۔ میں نے عام ہندو دیہاتی کا روپ دھار رکھا تھا۔ شہر کو جانے والی سڑک سے ہٹ کر میں نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ایک مندر کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دینا نگر کا غالباً ایک یہی بازار تھا۔ مندر بازار کے اندر ہی واقع ہے۔ میرے سامنے سے لوگ "ہر رام، ہرے رام" کا جاپ کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میں بھی "ست نام، ست نام" کا ورد کرتا مندر میں چلا گیا۔ صبح ساڑھے چھ سات بجے تک پاٹھ ہوتا رہا۔ میں وہیں ایک کونے میں بیٹھا وقت گزارتا رہا۔ جب بازار میں خوب چہل پہل شروع ہو گئی تو میں بھی باہر نکل آیا۔ ایک "وشنو ڈھابے" پر میں نے صبح کا ناشتہ کیا۔ ہندو ہوٹل عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں ایک جن میں گوشت پکتا ہے اور دوسرے جہاں گوشت سے متعلق کوئی شے نہیں پکتی۔ ویشنو گوشت نہ کھانے والے کو کہتے ہیں اور ایسے ہوٹلوں کو وشنو ڈھابہ۔ میرا ناشتہ دو آلو کی کچوریاں اور دہی پر مشتمل تھا یہاں عجیب عجیب باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔

"فلاں جگہ ایک جاسوس وائرلیس کرتا پکڑا گیا ہے۔ وہ وہاں کافی عرصے سے جوگی کا روپ دھارے بیٹھا تھا۔ فلاں جگہ سے عورت پکڑی گئی۔ فلاں جگہ جاسوسوں نے بم پھینکا۔ فلاں جگہ پانی میں زہر ملا دیا جس کے پینے سے تین چار آدمی مر گئے وغیرہ وغیرہ۔

کچھ بھی ہو بہرحال ایک بات جو حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ تھی کہ وہ تمام لوگ جنگ سے خوفزدہ تھے۔ دینا نگر چونکہ ایک سرحدی قصبہ ہے اور جنگ کی لپیٹ میں بھی سب سے پہلے وہی آتا تھا اس لئے لوگ یہاں سے بیاس کے پار بھاگ رہے تھے۔ یہ حقیقت یہاں

دیکھنے میں عام طورِ آتی تھی کہ 65ء کی جنگ نے پارک آرمی کو ان کے ذہنوں پر مسلط کر دیا تھا۔ وہ لوگ پاکستانی فوج سے بہت ڈرتے تھے خاص طور پر پاکستان ایئر فورس کی دھاک ان کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی، اس لئے معمولی سی خبر بھی ان کے اعصاب پر بم بن کر گرتی تھی۔ شہر کا یہ واحد بازار تھا جہاں عام حالت میں تو شاید بڑی رونق ہوتی ہو لیکن ان حالات میں کوئی خاص چہل پہل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لوگوں نے اپنے مال اسباب پیچھے بھیج دیئے تھے اور وہ صرف اپنے گھروں کی نگہداشت کے لئے یہاں رہ گئے تھے۔

○

ایک اجنبی کا بغیر کسی مقصد، عام حالات میں یہاں کسی ہوٹل میں بیٹھے رہنا شاید کوئی نرالی بات نہ ہوئی لیکن ان حالات میں جبکہ آکاش وانی صبح شام پروگرام روک روک کر پاکستانی جاسوسوں اور کمانڈوز کے داخلے کا شور مچا رہی تھی اور لوگ خواہ مخواہ روک کر ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔ کسی اجنبی کا چھوٹے سے قصبے کے ایک ہوٹل میں بیٹھے رہنا، آبیل مجھے مار والی بات تھی۔ میں بھی ناشتے سے فراغت پاتے ہی لاری اڈے کی طرف چل دیا۔

دینا نگر کا لاری اڈہ معمولی سا ہے۔ پنجاب سے کشمیر کو آنے والی بسیں یہاں چند منٹ کے لئے صرف سواریاں اتارنے ٹھہرتی ہیں۔ ویسے تو پنجاب، راجستھان اور کشمیر کے تمام سٹیشن، ہوٹل، لاری اڈے، بس سٹینڈ، آشرم اور سرائیں انڈین سیکورٹی سے بھری رہتی تھیں لیکن سرحدی علاقے خاص طور سے جموں سے گورداسپور، ڈیرہ بابا نانک اور سرحد کے ساتھ ساتھ امرتسر تک کے علاقے پر ان کی خاص نظر رہتی تھی۔

یہاں بھی کئی سی آئی ڈی والے نظر آ رہے تھے۔ میں نے یہاں سے براہ راست

کشمیر جانا مناسب خیال نہ کیا بلکہ پنجاب کی طرف جانے کا ارادہ کیا تا کہ وہاں بیٹھ کر کوئی مناسب راستہ نکالوں اور کسی (Cover) (آڑ) کے ساتھ کشمیر کی طرف جاؤں۔ میں پٹھان کوٹ کی طرف سے آنے والی کسی بس کا منتظر تھا تا کہ گورداسپور اور امرتسر کے درمیان واقع ایک شہر بٹالے چلا جاؤں جہاں سے واپس جموں کی طرف سفر کیا جا سکے۔

دینا نگر کے بازار سے یہاں تک دو آنکھیں مجھے مسلسل گھورتی ہوئی آئی تھیں۔ سب سے پہلا کام تو تھا ان سے جان چھڑانا۔ ابھی میں اس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرے پیچھے ایک شور اٹھا۔

پکڑ لو سالے کو۔"

"جاسوس ہے۔"

"اس کے کپڑے اتارو۔"

"تلاشی لو، اس کی۔"

مختلف ملی جلی آوازوں نے عجیب سا سماں باندھ رکھا تھا۔ میری تو ایک مرتبہ جیسے جان ہی نکل گئی۔ دھڑکتے دل سے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک مخبوط الحواس آدمی کو بہت سارے لوگ گھیرے کھڑے تھے جو صاحب بازار سے یہاں تک مجھ سے چمٹے ہوئے تھے وہ بھی انہی گدھوں میں شامل ہو گئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور جلدی سے بس میں سوار ہو گیا جو جموں سے آئی تھی اور امرتسر کو جا رہی تھی۔ یہ بسیں عموماً ایکسپریس ہوتی تھیں اور راستے میں سواریاں اتارنے ہی کے لئے کہیں رک جایا کرتی تھیں۔ بس کا ڈرائیور بھی تماشا دیکھنے میں محو تھا ادھر میری جان پر بنی ہوئی تھی کہ کہیں وہ گدھا، جو یہاں تک میرے پیچھے آیا تھا، اسے دوبارہ میرا خیال نہ آ جائے۔ ایک ایک لمحہ قیامت ڈھا رہا تھا۔ میری حالت پر قدرت کو رحم آ گیا اور پیچھے سے ایک اور بس آ گئی جس کی وجہ سے ہماری بس کے ڈرائیور کو بس چلانا پڑی جونہی بس سٹینڈ سے

باہر نکلی، میں نے سکھ کا سانس لیا۔

ساری بس کا موضوع گفتگو، جاسوس بنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے پاکستانی جاسوس ان لوگوں کے حواس پر چھائے ہوئے ہیں اور سارا بھارت ان سے الرجک ہو گیا ہے۔ تمام لوگ اونچی اونچی آواز میں ایک دوسرے کو مختلف پاکستانی جاسوسوں کے کارنامے اور گرفتاری کے واقعات سنا رہے تھے اور میں ان سب سے بظاہر بے نیاز بس سے باہر کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ جہاں ہر دو تین میل کے بعد کوئی نہ کوئی آرمی کانوائے نقل و حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا یا پھر سہمے سہمے کسان تھے جو حسرت بھری نظروں سے اپنے کھلیانوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن پر بھارتی فوج نے قبضہ کر رکھا تھا۔

سڑک سے ہٹ کر کھیتوں کے پھیلے ہوئے وسیع سلسلے اب سمٹنے لگے تھے۔ غالباً گورداسپور آنے والا تھا۔ گورداسپور اڈے پر سواریاں اتار کر بس پھر چل دی۔ نئے سوار ہونے والوں نے یہاں کے کسی جاسوس کی گرفتاری کا حال سنانا شروع کر دیا۔ ایک مہاشے جی مجھ سے دو سیٹ آگے بیٹھے ہوئے بہت دیر سے سب کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے، انہیں نجانے کیا سوجھی کہ یکایک میرے ساتھ والی سیٹ خالی دیکھ کر وہاں براجمان ہو گئے۔

"کیا خیال ہے مہاراج جی آپ کا؟" انہوں نے بات چھیڑی۔

"جی! کس بارے میں؟" میں نے بظاہر لاتعلقی سے جواب دیا۔

"اجی یہی کم بخت جاسوسوں کے بارے میں۔"

"آپ کو لالہ جی! مجھ میں کیا نظر آیا جو مجھ ہی سے اس بارے میں پوچھ رہے ہیں۔" میں نے چڑتے ہوئے کہا "میں کوئی جاسوس نہیں ہوں۔"

"اجی واہ! آپ تو مہاراج برا مان گئے میری بات کا- ویسے آپ بھی تو ہو سکتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہونے کو تو آپ بھی کم نہیں" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

اس بات پر ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا اور میری ہنسی میں خوف کا عنصر تو شامل تھا لیکن نمایاں نہیں تھا۔ اب ہم بٹالے کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ بٹالہ قدیم شہر ہے اور اپنی صنعت خصوصیت کی وجہ سے پنجاب ہی میں نہیں سارے برصغیر میں ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ یہاں کے "ٹوکے" اور اسی نوعیت کے دوسرے اوزار بہت مشہور ہیں۔

بٹالہ آ گیا۔ میں اڈے سے باہر ہی اتر گیا تاکہ وہاں پر موجود سی آئی ڈی کی نظر سے بچ سکوں۔ لاری اڈے کے سامنے کچہری ہے اور وہیں سے جو راستہ امرتسر کو جاتا ہے اس پر واقع بازار میں جا گھسا۔ ارادہ یہ تھا کہ شام تک آوارہ گردی کروں گا اور پھر جموں جانے والی لاری میں سوار ہو جاؤں گا۔ رات کو جموں پہنچ کر کسی آشرم یا سرائے میں قیام کروں گا اور صبح اٹھ کر اپنے ٹارگیٹ کی طرف جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد میں لاری اڈے کا رخ کر رہا تھا کشمیر جانے کے لئے۔

بٹالے سے براہ راست جموں جانے والی لاری میں جگہ نہ مل سکی البتہ پٹھان کوٹ تک مجھے لاری میں جگہ مل گئی۔ ایک مرتبہ پھر انہی مقامات کو دیکھتا ہوا گورداسپور کے راستے پٹھان کوٹ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک دو میل چلنے کے بعد ہمیں کسی نہ کسی آرمی کانوائے سے سابقہ پڑ جاتا تھا۔ ان سب کا رخ بارڈر ایریا کی طرف ہوتا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے بھارت نے سارے پاکستان پر قبضہ کرنے کا جنون خود پر سوار کر رکھا ہے۔ یہی حالت عوام کی تھی۔ لاریوں پر کاروں پر، ٹرکوں پر جگہ جگہ کرش پاکستان (Crush Pakistan) لکھا ہوا تھا۔ پٹھان کوٹ پہنچ کر میں لاری سے اتر گیا۔

بنیادی طور پر یہ ایک چھاؤنی ہے اور یہی خصوصیت اس کو اور شہروں سے نمایاں مقام دلاتی ہے۔ جگہ جگہ مختلف رجمنٹوں کے جوان آ جا رہے تھے۔ پٹھان کوٹ کا ہوائی اڈہ اور

چھاؤنی چونکہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، اس لئے یہاں قدم قدم پر سیکورٹی کا زبردست پہرہ تھا۔ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا تھا۔ حد سے بڑھی ہوئی احتیاط بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ خواہ مخواہ کی احتیاط بھی بسااوقات شک پیدا کر دیتی ہے۔

میں اڈے سے باہر نکل آیا قریب ہی ایک ہوٹل میں چائے سے دل بہلانے لگا۔ میرے سامنے لاری اڈہ تھا۔ جس کے چاروں طرف انڈین سیکورٹی کے مختلف محکموں کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ پانچ چھ تو اب تک اپنی پہچان بھی کروا چکے تھے۔ میں پانچ بجے کا منتظر تھا کیونکہ پانچ بجے والی لاری کے لئے میں نے ٹکٹ بک کروا رکھی تھی۔ اب پانچ بجنے میں دس منٹ باقی تھے اور میں اپنی سیٹ سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک "پرنام" کی آواز سے چونک پڑا۔

"ست سری اکال" میری داہنی طرف سے کسی نے کہا۔ میں نے تیزی سے گردن گھمائی۔ اس اجنبی دیس میں ایسا کون سا میرا شناسا نکل آیا۔ پھر تو جیسے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

میرے سامنے امریک سنگھ کھڑا تھا۔

○

امریک سنگھ امرتسر کا رہنے والا تھا اور بڑے عرصے سے ہمارے ساتھ کام کر رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک اس کے ڈبل ایجنٹ ہونے کا انکشاف ہوا۔ اس نے دو تین دفعہ مجھے بھی بارڈر پار کروایا تھا۔ اب وہ ہمارے نزدیک "شکی" آدمی تھا اور اس سے بچنے کے لئے مجھے واضح احکام مل چکے تھے۔ میں بھرے بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا جس کے سامنے پٹھان کوٹ جیسے فوجی اہمیت کے حامل شہر کا ہوائی اڈہ تھا۔ قدم قدم پر سی آئی

ڈی اور انٹیلی جنس کے تربیت یافتہ آدمی جنہیں خاص طور سے کمانڈوز سے نمٹنے کے لئے تیار کیا گیا تھا، موجود تھے۔ ان کے نزدیک مجھ جیسے کی حیثیت ہی کیا تھی۔ اگر میں امریک سنگھ کو پہچاننے سے انکار کرتا تو وہ میری پہچان خود ہی کروا دیتا۔ کیونکہ اچانک بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر دھڑکتے دل کے ساتھ خود کو آنے والے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار کر لیا۔

"ست سری کال" میں نے جواباً نمسکار کیا۔

میں نے دلی جذبات پر مکمل قابو پا لیا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ میرے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے پائے۔

"کس طرح آنا ہوا مہاراج" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"امریکی مال لے کر آیا تھا۔" وہ مخصوص جگہ جسے سمگلر ملاپ کے لئے دونوں اطراف سے چنتے ہیں "پارٹی نہیں پہنچ سکی۔ ناکے بہت لگتے ہیں۔ اس لئے میں اکیلا ہی "جیکٹ" لے کر پار آ گیا ہوں۔" "سمگلر لوگ سونے ری ریتیاں چھپانے کے لئے پہنتے ہیں اس میں انہیں سلا کر چھپایا گیا ہوتا ہے۔" پارٹی پٹھان کوٹ کی ہے لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ لوگ پہلے ہی پولیس مقابلے میں مفرور ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ سرگوشی کے انداز میں آہستہ آہستہ اس کے گوش گزار کیا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا مقصد صرف دولت کا حصول ہوا کرتا ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے ہزار تولے سونے کے لالچ میں یہ ابھی مجھے گرفتار نہ کروائے اور تھوڑی سی مہلت مل جائے۔ میں صرف تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا اس کے بعد مجھے امید تھی کہ اللہ کے فضل و کرم شامل حال ہوتے ہوئے یہ لوگ مجھے زندہ گرفتار نہیں کر سکیں گے۔

ایک لمحے کے لئے امریک سنگھ کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت نظر آئی پھر ایسا لگا جیسے اسے میرے بیان پر یقین آ گیا۔

"مال کہاں ہے؟" اس نے اسی طرح سرگوشی کے انداز میں مجھ سے پوچھا اور میں نے خدا کر شکر ادا کیا۔

"شیزان پور۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

شیزان پور، پٹھان کوٹ کے نزدیک صرف پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس طرح کم از کم یہ بلا میرے گلے سے یہاں سے تو ٹلتی۔ پندرہ بیس میل کے سفر میں اطمینان سے اس سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔

"کس کے پاس؟"

جواباً میں نے اطمینان سے ایک سمگلر کا نام لے دیا جس سے وہ خود بھی واقف تھا۔

"لعنت بھیجو اس پر۔ میں تمہارا مال امرتسر میں لگوا دیتا ہوں۔" اس نے اسی لہجے میں دوبارہ مجھ سے کہا۔

"اور کیا چاہئے یار۔" میں نے بظاہر بہت خوش ہوتے ہوئے اسے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر وہ خود ہی بولا۔

"یار، میں ذرا بدنام آدمی ہوں۔ تھوڑا فاصلہ رکھ کر چلنا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے! تم آگے آگے چلو، میں تھوڑے فاصلے سے پیچھے آ رہا ہوں۔" خود آگے چلنے کا سن کر ایک لمحے کو غالباً وہ چونکا ہوگا، لیکن خدا کی مدد میرے شامل حال تھا۔ اس لئے وہ پھر داؤ میں آ گیا۔ دراصل ہزار تولے سونے کا سن کر اس کی عقل ماری گئی تھی اس نے سوچا سونے پر خود قبضہ کر کے مجھے ٹھکانے لگا دے گا یا ڈرا کر بھگا دے گا کیونکہ میری گرفتاری کی صورت میں اس سے سونا بھی پکڑا جائے گا اور اس کی دانست میں اتنا بیوقوف تو میں تھا نہیں کہ سونے کی خاطر خود کو بھارتی پولیس کے حوالے کر دیتا۔

اب ہم دونوں اپنی اپنی دانست میں ایک دوسرے کو بیوقوف بنا کر شہر سے باہر نکل رہے تھے۔ تاکہ کسی مقامی بس پر بیٹھ کر شیزان پور پہنچا جا سکے۔ پٹھان کوٹ کا لاری اڈہ

شہر ہی میں ہے۔ وہاں پر آنے کے لئے تمام بسوں کو اڈے کے سامنے والے بازار میں سے گزر کر آنا پڑتا ہے۔ بازار میں سے گزرتے ہوئے لاریوں کی رفتار ذرا کم ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے موقعے کا منتظر تھا کہ بازار کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آنکھ بچا کر کسی لاری میں سوار ہو جاؤں لیکن دوسری طرف مقابلہ بھی امریک سنگھ سے تھا۔ وہ ہر دو تین منٹ کی بتیاں جل رہی تھیں۔ بازار ختم ہونے میں زیاد سے زیادہ دس منٹ اور لگتے، اس کے بعد شیزان پور تک بھاگنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ اے مولا، پردہ غیب سے کوئی سبب پیدا کر۔ میرے قریب سے اب تک پانچ چھ لاریاں گزر چکی تھیں لیکن جب بھی کوئی لاری میرے قریب آتی امریک سنگھ چلتے چلتے ٹھہر جاتا اور گردن موڑ کر مجھے اس وقت تک گھورتا رہتا جب تک لاری گزر نہ جاتی۔

سول ڈیفنس کی وردیاں پہنے کئی نوجوان وہاں گھوم رہے تھے۔ میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ ان ہی کی کوئی مشق شروع ہو جائے۔ اچانک سائرن کی آواز گونجی، تمام جوانوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں اور اس کے ساتھ لائٹ آف ہو گئی۔

"بلیک آؤٹ۔ بھاگو۔"

میرے ذہن نے تیز سرگوشی کی اور میں اندھا دھند پیچھے کی طرف بھاگا۔ اچانک اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے میں دو تین دفعہ مختلف آدمیوں سے ٹکرایا۔ اسی کشمکش میں میرا بیگ بھی کہیں گر پڑا تھا۔ لیکن میں ان تمام باتوں سے بے پرواہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ سڑک سے خاصا ہٹ کر میں نے کھیتوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں اور ابھی اتنا گہرا اندھیرا پھیلا بھی نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ امریک سنگھ بھی میرے ساتھ ہی پیچھے کی طرف بھاگا ہوگا۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ وہ میرے پیچھے نہیں آ رہا، میں نے دوبارہ

اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ اب میں سڑک سے ہٹ کر بری تیزی سے اندازے کے ساتھ اسی سمت میں جا رہا تھا۔ جہاں سے میں نے بھاگنے کا آغاز کیا تھا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہیں اس طرح میں سول ڈیفنس کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔

بسوں کی آمد و رفت جاری تھی کیونکہ یہ مشقیں کی ہی اس لئے جاتی ہیں کہ ایسے اوقات میں انہیں کیا حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ میں تیزی سے چلتا ہوا بازار کے آخری سرے پر پہنچ گیا جہاں سے بسیں مڑ کر بڑی سڑک پر پہنچتی ہیں۔ اب میں وہیں ایک طرف درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا تاکہ پنجاب کی طرف جانے والی کسی بھی لاری پر سوار ہو سکوں۔ اب میرا انڈیا میں رہنا خودکشی کے مترادف تھا۔ مجھے علم تھا کہ انڈین سیکورٹی شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتی پھرے گی۔

ایک بس نہایت مدھم روشنی کے ساتھ نمودار ہوتی اور میں خدا کو یاد کر کے اس میں سوار ہو گیا اندر بیٹھ کر سب سے پہلے میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام کپڑے صحیح سلامت تھے۔ ورنہ یہاں کوئی بپتا آن کھڑی ہوتی لیکن میں بچا رہا۔ یہ بس امرتسر کو جا رہی تھی۔ امرتسر بارڈر سے میں صرف نقشے کی حد تک واقف تھا۔ خود پار کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں چپ چاپ امرتسر کا ٹکٹ خرید لوں اگرچہ راستے میں اور شہر بھی آتے تھے جہاں چیکنگ کا خطرہ تھا لیکن میں نے اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کا سفر تھا۔ میں سارے راستے اونگھنے کی ایکٹنگ کرتا گیا۔ لاری بھی پنجاب وڈویز کی ایکسپریس ٹائپ کی کوئی چیز تھی کیا مجال جو کسی شہر میں بھی پانچ منٹ سے زیادہ ٹھہری ہو۔ سارے راستے غالباً وہ تین یا چار جگہ ٹھہری ہو گی۔ جہاں کہیں لاری رکتی میں اونگھتا اونگھتا سیٹ پر بازو جما کر ان پر اپنا سر رکھ کر سو جانے کی ایکٹنگ شروع کر دیتا۔ اس اثنا میں اپنے ساتھ والی سواری کی چھٹی کروانے کے لئے اس سے پانچ چھ مرتبہ ٹکرا بھی

چکا تھا وہ بھی بڑی ڈھیٹ ہڈی کا معلوم ہوتا تھا وہیں جما بیٹھا رہا۔

آدھی رات گئے ہم لوگ امرتسر پہنچ گئے۔ میں نے بجائے شریف پورے کی طرف جانے کے فتح گڑھ جوڑیاں کو جانے والا راستہ اختیار کر لیا۔ میں جلد سے جلد شہر کی حدود سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ رات میں نے امرتسر کے ایک نواحی کھیت میں چھپ چھپے کاٹ دی۔ اس سے پہلے میں دو راتوں کا جاگا ہوا بھی تھا۔ میرے بدن پر ایک کوٹ، جرسی، قمیص، پتلون اور پاؤں میں بوٹ تھے یا پھر کوٹ کی جیب میں دو یا تین سو روپے کی کرنسی باقی تمام پیسے بیگ میں ہی رہ گئے تھے۔ سردی کے مارے مجھے بار بار جسم کو حرکت دینی پڑتی تھی۔ آدھی رات میں نے سگریٹ پھونک پھونک کر ہی گزار دی۔ نیند بار بار مجھ پر حملہ کرتی رہی لیکن مجھے علم تھا کہ اگر آج میں سو گیا تو شاید بڑی نیند سونا پڑے۔ امریک سنگھ مجھ سے بخوبی آگاہ تھا وہ میرے کارنامے اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتا کہ میرے لئے پاکستان واپس جانا ایک سپنا بن کر رہ جاتا۔

صبح اٹھ کر میں نے بازار کا رخ کیا۔ ایک حلوائی کی دکان سے ناشتہ کیا۔ اور ایک آشرم میں چلا آیا۔ میں نے ایک کمبل بازار سے خرید لیا تھا اور اب میرے جسم پر چادر کرتا، جرسی اور کمبل تھے۔ میں شکل سے مکمل دیہاتی نظر آ رہا تھا۔

آشرم میں ایک چارپائی پر میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ پجاری کی مٹھی میں نے آتے ہی گرم کر دی تھی۔ لہٰذا میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر سو رہا۔ میں دو راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا لیکن نیند اب بھی آنکھوں سے دور تھی۔ مجھے فوراً فیصلہ کرنا تھا کہ بارڈر کس جگہ سے کراس کیا جائے۔ امرتسر، ڈیرہ بابا نانک، کلانور یہ تین نام میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ بالآخر ذہن نے فیصلہ ڈیرہ بابا نانک کے حق میں دیا اور میں مطمئن ہو کر سو رہا۔ قریباً دو بجے تک سوتا رہا۔ مجھے علم تھا کہ آشرم، سرائے، گوردوارے یا ہوٹل میں رات ہی کو چیکنگ ہو سکتی ہے۔ دن کو تو کوئی گدھا ہی ہے جو

بھٹنے کے لئے خود بخود وہاں چلا آئے گا۔ دوپہر قریباً دو تین بجے میری آنکھ کھلی۔ ایک قریبی ونشوڈھابے پر دو تین پھلکے زہر مار کئے اور چائے کا ایک کپ اسپرین کے ساتھ پی کر میں چار بجے کے قریب ڈیرہ بابا نانک جانے والی لاری پر سوار ہو گیا۔ اس علاقے سے میں کچھ کچھ واقف تھا۔ ایک مرتبہ یہاں سے بارڈر پار کرنے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔

O

قریباً پانچ بجے لاری یہاں پہنچی میں شاہ پور کے نزدیک اتر گیا اور پکّا نے نام کے ایک گاؤں کی طرف چل دیا جہاں سے مجھے بارڈر پار کرنا تھا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ آرمی نے مورچے کھود رکھے تھے۔ کھیتوں میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ فصلیں جو کٹائی کی منتظر تھیں تباہ ہوتی جا رہی تھیں۔

میرے ساتھ ساتھ اور بھی ارد گرد کے دیہاتوں میں لوگ آ رہے تھے اور ہم سب کو فوجیوں کی مسلسل گھورتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ راستے میں پڑنے والے گاؤں میں اکا دکا فوجی بھی دکھائی دیتا تھا کیونکہ بہت سے لوگ جنگ کے خطرے کے پیش نظر گاؤں چھوڑ کر شہروں کی جانب بھاگ گئے تھے۔ صرف وہی لوگ گاؤں میں باقی تھے جنہیں بھاگنے والے اپنے سامان کی حفاظت کے لئے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

میرے پیچھے آتے ہوئے دیہاتی اب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے تھے۔ میں اکیلا ہی گاؤں کی سمت جا رہا تھا اور اب مجھ اکیلے کو گھورتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"ٹھہرو" ایک مورچے کے قریب سے گزرتے ہوئے گونج سنائی دی میں ہڑبڑا کر رک گیا۔ "کدھر جانا ہے" ایک لمبے تڑنگے سکھ صوبے دار نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"پکھویں مہاراج" میں نے قریبی گاؤں کا نام لے دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"امر جیت، مہاراج جی۔"

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"مہاراج جی! گمٹالے سے۔"

"کس سے ملنا ہے۔"

"سرپنچ سے مہاراج۔"

"کیا نام ہے سرپنچ کا؟"

"پرم جیت سنگھ مہاراج۔"

ارد گرد کے دس گاؤں کے سرپنچوں کے نام تو مجھے حفظ تھے۔

"یہ تھیلا دکھاؤ۔" اس نے کہتے ہوئے خود ہی میرے ہاتھ سے تھیلا چھین لیا جس میں اس سچوئشن سے نمٹنے کے لئے میں نے پہلے ہی امرتسر کچہری سے لے کر الٹے سیدھے کاغذات ڈال لئے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کاغذوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج جی! مقدمے کے کاغذ ہیں۔ کل ہماری پیشی ہے۔ سرپنچ سے سفارش ڈلوانی ہے۔"

"ٹھیک ہے جلدی جلدی نکل جاؤں یہاں سے" اس نے مطمئن ہوتے ہوئے مجھے تھیلا واپس کر دیا اور میں اس گدھے صوبے دار کو ست سری اکال کہہ کر اپنی منزل کی طرف چل دیا جہاں ابھی اور کئی مصیبتیں میری منتظر تھیں۔

"پکھویں" سے میں "روسے" پہنچ گیا جہاں سے میں پکّا نے کے ساتھ واقع نور پور نامی پکٹ کی ساتھ ساتھ باڈر کراس کرنا چاہتا تھا۔ سامنے دائیں طرف دریا کے ساتھ پاکستانی پکٹ گجر تور اور بائیں طرف صرف "بیلے" کا علاقہ تھا جس کے سامنے ہماری پکٹ "مردانہ" واقع ہے۔ یہاں سے بارڈر کم از کم میل بھر کی مسافت پر واقع تھا

اور اریا بھی ایسا جس کے چپے چپے پر انڈین آرمی یا تو خود ڈیپلائے تھی یا اس نے زمین دوز سرنگیں "مائنز" دبا رکھی تھیں۔ جب مجھے انڈیا میں داخل ہونا تھا تو اسی علاقے کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن یہاں سے ناکامی کے بعد مجھے دوسری جگہ سے داخل کیا گیا تھا۔ ہم نے یہاں سے داخل ہونے کی تین کوششیں کی تھیں۔ لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ اس اثناء میں مجھے اس علاقے کے چپے چپے سے واقفیت ہو گئی تھی اور اب قسمت پھر مجھے اسی مقام پر لے آئی تھی۔ اس جگہ سے بارڈر پار کرنا کتنا خطرناک تھا۔ اس کا مجھے بخوبی علم تھا، لیکن اپنے ملک پہنچنے کی تمنا اور اپنی بقا کی جنگ جو میں لڑ رہا تھا، اس کے سامنے اس خطرے کی ذرہ بھر اہمیت نہیں تھی۔ میں کماد کے ایک کھیت میں چھپا اندھیرا پھیلنے کا منتظر تھا تاکہ قسمت آزمائی کر سکوں۔ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ کھیت کے باہر سرکنڈوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ تھا اور اس کے آگے کھدے ہوئے فوجیوں کے مورچے جن کے درمیان سے گزر کر مجھے نور پور پکٹ کے قریب پہنچنا تھا۔ تاکہ میں وہاں سے سرکنڈوں کی آڑ میں چلتا ہوا خشکی کے راستے پاکستان میں داخل ہو سکوں، یہاں ہماری یونٹیں دریا سے آگے بنی ہوئی تھیں کیونکہ دریا سے آگے تقریباً پانچ میل کا ایریا پاکستانی علاقے ہی میں تھا اور اس کے لئے بارڈر لائن شروع ہوتی تھی۔ کماد کے کھیتوں سے سر باہر نکالا ہی تھا کہ میرے قریب ہی تقریباً پچیس یا تیس فٹ دور زور کا دھماکا ہوا۔ غالباً کوئی بارودی سرنگ پھٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں کی تڑتڑ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بھارتی فوجیوں کے پاس نجانے اتنا اسلحہ کہاں سے آ گیا تھا کہ وہ بغیر دیکھے بھالے خواہ مخواہ فائرنگ شروع کر دیتے تھے۔ میرے قریب سے روشنی راؤنڈ فائر ہوا اور وہ گدھے رک گئے۔ میں پھر واپس وہیں دبک گیا۔ روشنی میں "ہوم گارڈ (Home Gurard) کے جوان خاکی وردی پہنے، ہاتھوں میں رائفلیں تھامے ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ خدا نے ایک اور کرم کیا کہ مجھے اپنے قریب والے

مورچے کا بھی علم ہو گیا ورنہ ابھی تک میں اس سے بے خبر تھا۔ غالباً کسی "ہوم گارڈ" کا پاؤں غلطی سے بارودی سرنگ پر آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ پھٹ گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ان کی بھاگم دوڑ ختم ہوئی اور ماحول پر ایک مرتبہ پھر پہلے جیسا سناٹا طاری ہو گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے بوڑھا اور سرد آسمان اپنے دامن میں ہزاروں ستاروں کے ساتھ ٹھٹھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا سامنے شکر گڑھ پر بھی یہی آسمان اپنے ننھے ننھے جگنوؤں کے ساتھ سایہ فگن ہو گا اور وہاں سے کچھ دور اک شہر بے مثال میں میرے ماں باپ بہن بھائی آرام سے رضائیاں اور لحاف اوڑھے اطمینان کی نیند سو رہے ہوں گے۔ اس بات سے قطعی بے نیاز کہ ان سے کچھ فاصلے پر میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ میں نے چادر کو لنگوٹی کی طرح باندھ رکھا تھا۔ کمبل پھینک دیا تھا۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور میں پنڈلیوں تک شبنم سے بھرا ہوا تھا لیکن مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر رہے تھے اور مجھے اپنے وجود میں خون کی جگہ انگارے دوڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ رات اپنے سینے میں ہزاروں وحشتیں سمیٹے رینگ رینگ کر سورج دیوتا کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ رات اور دن کا صدیوں سے جاری سفر جاری تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک مرتبہ پھر آیت الکرسی پڑھی اور بڑی احتیاط سے چلتا ہوا کھیتوں سے باہر نکل آیا۔ اب ایک خالی قطعہ زمین جو غالباً پندرہ بیس گز لمبا تھا، مجھے رینگ کر طے کرنا تھا اس کے بعد سرکنڈوں کا وہ سلسلہ تھا جس سے گزر کر مجھے آگے پکٹ کی طرف بڑھنا تھا۔ تمام ایریا آرمی نے مکمل کیموفلاج کر رکھا تھا۔ کسی بھی وقت کسی بھی لمحے میرا پاؤں یا جسم کا کوئی اور حصہ کسی بھی مائنز کو چھو جاتا پھر ایک دھماکا ہوتا اور جسم کے پرخچے اڑ جاتے۔ میں رینگتا ہوا سرکنڈوں کی طرف جا رہا تھا۔ وقت بھی میرے ساتھ رینگ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیامت ڈھا دینے والا تھا۔ اب میں اس مقام پر آ گیا جہاں سے واپس

لوٹنا بھی موت اور آگے بھی موت۔ میرے چاروں طرف موت اپنی تمام وحشتوں
کے ساتھ رقص کر رہی تھی لیکن میں زندگی کے لئے اس سے چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔
اپنی بقا کے لئے موت سے جنگ کر رہا تھا اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے
انشاء اللہ اپنے مقدس وطن کی زمین پر پہنچ جاؤں گا یا پھر مر جاؤں گا کیونکہ زندہ ان
بھیڑیوں کے ہاتھ آنا تو سسک سسک کر مرنے والی بات ہے۔

میں دل کی تیز تیز دھڑکن کے ساتھ اب مورچوں کے عین نیچے پہنچ چکا تھا۔ نیم
دائرے میں بنے ہوئے یہ مورچے مجھ سے دس بارہ فٹ کی اونچائی پر واقع تھے۔ جس
کے نیچے سرکنڈوں کی ایک قطار سی پھیلتی چلی گئی تھی۔ میں اب مورچوں سے گزر کر
بیلے میں داخل ہو گیا جہاں مجھے امید تھی کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔

اچانک میرے پیچھے دھماکا ہوا اور سارا ماحول ننگا ہو گیا۔ میرے قریب ہی چھپے
ہوئے کسی فوجی نے وہاں پوزیشن لئے بیٹھا تھا، مجھے دیکھ لیا تھا اور اس نے روشنی راؤنڈ
فائر کر دیا تھا۔

"ہالٹ" کسی کی زوردار آواز گونجی اور میں نے بڑی پھرتی سے سامنے بڑی بڑی
لمبی جنگلی گھاس (بیلے) میں چھلانگ لگا دی۔ پر میں کمر کے بل جھک کر تیزی سے بھاگنے
لگا۔ گولیوں کی سرخ لکیریں میرے تعاقب میں تھیں۔ میرے کانوں کے دونوں
طرف شائیں شائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں لیکن میں جنونیوں کی طرح اپنی
پوزیشن می دوڑا چلا جا رہا تھا۔ میری پنڈلیوں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور دل کا یہ
عالم کہ جیسے سینہ پھاڑ کر باہر آن گرے گا۔ سردی گرمی کا احساس مر چکا تھا۔ بس ذہن
میں ایک ہی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ دوڑو۔ دوڑو۔ دوڑو۔ اور تیز۔ ان تمام باتوں کے
باوجود میرا ذہن مکمل بیدار تھا۔ مجھے علم تھا اگر مجھ سے ذرا سی بھی سمت کا غلط انداز
ہو گیا تو وہ مجھے گھیر کر مار ڈالیں گے۔ اب میں برجیوں پر پہنچ چکا تھا جو بارڈر کی حد ہوتی

ہے۔ میں نے چھلانگ لگائی اور پاکستانی دھرتی کو بوسہ دے دیا۔

میرے پیچھے فائرنگ ابھی تک جاری تھی۔ اچانک "ہالٹ" کی آواز گونجی اور میں
رک گیا جیسے یہ سب کچھ بجلی کا کوئی عمل ہو۔

"ہینڈز اپ۔"

میں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

"اوئے! یار تم پھر واپس آ گئے۔" کمپنی کمانڈر نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی
ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں آنے والی بات تو کوئی نہیں تھی"

اور میں نے ہاتھ نیچے گرا دیئے۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہنس رہے تھے۔

امانت

میرے نام ایک لفافہ آیا۔ کھولا تو اس میں سے کاغذوں کا ایک دبیز پلندہ نکلا۔ اوپر موٹے قلم سے لکھا تھا۔ "میں بھی جاسوس تھا۔" تحریر اتنی شکستہ کہ بہت ہی مشکل سے پڑھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ لکھنے والے کے ہاتھ میں بہت زیادہ رعشہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جاسوسی کی ایسی صلاحیتیں لکھی ہوئی تھیں جو صرف جاسوس ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بہر حال میں نے یہ تحریر اس طرح پڑھی جیسے انٹیلی جنس والے کسی جاسوس کا خفیہ الفاظ میں دیا ہوا پیغام Dectpher کرتے ہیں۔ لکھنے والے نے ایک کہانی لکھی تھی جو اس کے الفاظ میں پیش کر رہا ہوں۔

میں ایک لمبے عرصے سے بیمار پڑا ہوں اور اب آخری منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنا زور لگا چکے ہیں۔ میری ماں مجھے پیروں اور عاملوں کے تعویذ پلا پلا کر میرے ہی غم میں مر چکی ہے۔ نہ کسی دوائی نے کام کیا نہ کسی تعویذ نے اثر کیا۔ میرے مرض کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں اپنا یہ مرض آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کیونکہ اسے صرف آپ سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے کہ میری یہ کہانی چھپنے

تک میں اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوں گا۔ پورے آٹھ مہینے لگا کر یہ آپ بیتی لکھی ہے۔ ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی سکت نہیں رہی۔ میں اپنا نام اور پتہ دینا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ میں پاکستان کی تاریخ کا مجرم ہوں۔ ہیرو نہیں ہوں۔

میں اس کی آپ بیتی اسی کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتیں۔ یہ باتیں دانستہ طور پر لوگوں سے چھپا کر رکھی جاتی ہیں۔ جنگ کی صورت میں عوام کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ محاذوں پر کیا ہو رہا ہے۔ محاذوں کے پیچھے اور فوجی ہیڈ کوارٹروں میں اور سیاسی میدان میں اور انٹیلی جنس کے پردوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ عوام کے علم میں نہیں لایا جاتا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ انہیں اس سے بے خبر رکھا جائے۔ اسی اصول کے تحت میں بہت سی باتیں جن کا تعلق جاسوسی کے ساتھ ہے۔ وہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

1962ء میں چین اور بھارت کی جنگ ہوئی تھی۔ بھارت میں پاکستان کے جاسوس موجود تھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بھارتی جاسوس ہمارے ملک میں موجود رہتے ہیں۔ جب چین سے بھارت کی جنگ ختم ہوئی تو بھارت نے پاکستان کے بہت سے جاسوسوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ پھر چین اور بھارت کی جنگ ختم ہو گئی۔ بھارت نے اس بہانے امریکہ برطانیہ وغیرہ سے بیشمار اسلحہ جمع کر لیا اور اس کی نیت کا صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ یہ اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا۔ یہ انٹیلی جنس کی باتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے دشمن ملک کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس طرح معلوم کرتی ہے۔ دشمن کے ارادے جاسوسوں کے ذریعے معلوم کر لئے جاتے ہیں۔ بھارت کے ارادے اور اس کی نیت صاف نظر آ رہی تھی۔ بھارت بہت بڑی جنگی طاقت بنتا جا رہا تھا۔

اس وقت تک میں پاکستان کی انٹیلی جنس میں شامل ہو چکا تھا اور ٹریننگ بھی ہو چکی تھی۔ بھارت اور چین کی جنگ کے تقریباً ایک سال بعد مجھے ایک خاص مشن دے کر

بھارت بھیج دیا گیا۔ یہ بتانا ضروری اور صحیح نہیں کہ مشن کیا تھا اور میں بھارت میں کس طرح داخل ہوا اور ان سرکاری حلقوں تک میں کس طرح پہنچا۔ جہاں مجھے اپنے مشن کی تکمیل کرنی تھی۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ صرف بھارت کے جاسوس پاکستان میں موجود ہیں اور پاکستان اس معاملے میں کمزور ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس بھارت کی زمین کی تہوں کے نیچے سے بھی راز نکال کر لے آتی ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ جو کارنامے پاکستانی جاسوسوں نے کئے ہیں۔ وہ بھارتی جاسوس نہیں کر سکتے۔

میں دلی جا پہنچا اور ان سرکاری حلقوں میں داخل ہو گیا جن کے چاروں طرف حفاظت اور پہرے کا انتظام بڑا سخت ہوتا ہے۔ وہاں میری حیثیت اعلیٰ درجے کے شہری کی سی تھی۔ جسے انگریزی میں V.I.P کہتے ہیں۔ میں نے وہاں کے دو اعلیٰ درجے کے کلبوں تک رسائی حاصل کر لی۔ ایک تو مجھے ٹریننگ ملی ہوئی تھی اور دوسرے یہ میرا دماغ تھا۔ جس سے میں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی۔ میں آپ کو یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی سوسائٹی میں مجھے اتنی بڑی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی، میں مڈل کلاس خاندان کا آدمی ہوں۔ میں نے اداکاری میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ میں ہر قسم کے بہروپ بھر کر اس طرح کی ایکٹنگ کر سکتا تھا۔ میں صدر ایوب کے لب و لہجے اور آواز میں تقریر کرنے میں ماہر تھا۔ اگر میں ریڈیو پر تقریر کرتا تو سارا ملک یہی سمجھتا کہ صدر ایوب بول رہا ہے۔ میں بھٹو اور دوسرے لیڈروں کی آواز میں بھی تقریر کر سکتا تھا۔ اسی طرح میں نہرو اور شاستری کی آوازوں کی بھی سو فیصد نقالی کر سکتا تھا۔ بھکاری کا بہروپ دھارنا یا بھارت کا نواب یا مہاراجہ بننا میرے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ میرے اس وصف نے اور انٹیلی جنس کی حاصل کردہ ٹریننگ نے میری پوری پوری مدد کی۔

میں ایک مرتبہ پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو وہ طریقے نہیں بتاؤں گا جن

سے میں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری طرح وہاں جو بھی جاسوس جاتا ہے وہ یہی طور طریقے اختیار کرتا ہے۔ پاکستان انٹیلی جنس کا اپنا ایک طریق کار ہے جو میں ظاہر نہیں کروں گا۔ یہ بھی خیال رکھیں کہ میں آپ کو جاسوسی کی کہانی نہیں سنا رہا۔ یہ میری ذاتی کہانی ہے جسے آپ میرے جرم کی داستان بھی کہہ سکتے ہیں۔ بھارت کی اونچی سوسائٹی جس میں اکثریت اعلیٰ سرکاری اور فوجی حلقوں کی ہوتی ہے پاکستانی سوسائٹی جیسی ہے، لیکن بھارتی سوسائٹی زیادہ آزاد اور ننگی ہے۔ وہاں شراب کھلے بندوں چلتی ہے اور انتہا درجے کی بے حیائی نہ صرف یہ کہ فیشن میں شامل ہے۔ بلکہ ہندو مذہب کی طرف سے بھی اس پر کوئی بندش نہیں۔ اس سے مجھے خاصا فائدہ پہنچا۔

جاسوس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت بیدار مغز رہے۔ دو چیزیں انسانی دماغ کو بیکار کر دیتی ہیں۔ ایک ہے عورت اور دوسری شراب۔ جاسوس اونچی سوسائٹی میں جا کر ان دونوں چیزوں سے بچ نہیں سکتا اور جاسوس انہی دونوں کے نشے میں اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

میں جس سوسائٹی میں گیا۔ وہاں انہی دونوں چیزوں کا جادو چلتا تھا مجھے انہی دونوں چیزوں کے ذریعے اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔ میرے لئے سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ تھا کہ مجھ سے کوئی پوچھ بیٹھتا کہ میری کوٹھی کہاں ہے تو اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔ میں جہاں رہتا تھا۔ وہ ایک مڈل کلاس گھرانہ تھا۔ میں اس محلے اور گھرانے کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پاکستان حاصل کرنے میں آج کے بھارت کے مسلمانوں نے بھی اتنی ہی قربانیاں دی تھیں جتنی پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں نے دی ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پاکستان کے تحفظ کے سلسلے میں پاکستانی مسلمانوں میں اتنا جذبہ نہیں جتنا بھارتی مسلمانوں کا جذبہ شدید ہے۔ بھارتی مسلمان اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہندو آج تک انہیں سزا دے رہا ہے۔ یہی

مسلمان تھے جن کے ایک خاندان نے صرف دلی میں ہی نہیں بلکہ میں جہاں بھی گیا میری رہائش اور تحفظ کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا۔

دلی کے ایک اعلیٰ درجے کے کلب میں جہاں سول اور ملٹری کے افسر زیادہ ہوتے تھے مجھے جاتے ہوئے قریباً ایک ماہ گزر گیا۔ وہ لوگ مجھے کٹر برہمن سمجھتے تھے اور یہ تسلیم کرتے تھے کہ میرا بس چلے تو میں آج ہی پاکستان پر حملہ کر دوں۔ اس ایک مہینے میں میری دوستی ایک جواں سال ہندو لڑکی کے ساتھ ہو گئی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی اس کا نام جو کچھ بھی تھا۔ وہ مجھ تک رہنے دیں۔ میں اسے پورنما کہوں گا۔ بھارتی انٹیلی جنس کے کاغذات میں اس کا اس کے باپ اور خاوند کا نام بڑے صاف الفاظ میں لکھا ہوا ہوگا۔

دراصل دوستی کی ابتدا پورنما نے کی اور انتہا میں نے کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی پسند کے دو چار افسروں کے ساتھ تعلقات پیدا کر چکی ہے۔ یہ اس کے خاوند کی غلطی اور اس کی اپنی مجبوری تھی۔ خاوند کی غلطی یہ تھی کہ پچاس برس کی عمر میں اس نے پچیس چھبیس سال کی عمر لڑکی کے ساتھ شادی کی اور شادی صرف اس لئے کی تھی کہ وہ خوشامد کے ذریعے بھارتی حکومت کا اعلیٰ افسر بن گیا تھا اور اس کی پرانی بیوی اس کے ساتھ سوسائٹی میں گھومتی پھرتی اچھی نہیں لگتی تھی۔

پورنما کو وہ باقاعدگی سے اپنے ساتھ کلب میں اور جہاں کہیں بھی ڈنر یا پارٹی ہوتی یا کوئی فنکشن ہوتا ساتھ لے جاتا تھا۔ پورنما نے مجھے دراصل اپنا ایک اور شکار سمجھا تھا لیکن وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ لڑکی میری رُوح پر قابض ہو گئی ہے۔ اس نے اشاروں اشاروں میں مجھے کئی مرتبہ دعوت گناہ دی تھی جو میں نے اس لئے قبول نہ کی کہ مجھے عورت کے نشے سے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔ دوسری وجہ میری مجبوری تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لڑکی پاک صاف نہیں۔ میں اسے

پاک صاف سمجھتا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آجاتی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں مجاہد ضرور تھا۔ لیکن میں مرد مومن نہیں تھا۔ میں نے زندگی میں ہر عیش بھی دیکھی ہے اور توفیق کے مطابق اچھے برے کام بھی کئے ہیں۔ کوئی شریف آدمی جاسوسی میں کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن پورنما کو دیکھ کر میرے دل سے بدی کا خیال نکل جاتا تھا۔

میں نے ایک روز اپنے دل کی کیفیت اسے بتا دی۔ اس نے کہا کہ وہ اسی محبت کی تلاش میں ہے لیکن وہ جس آدمی کے قریب ہوتی ہے۔ وہ اسے ایک خوبصورت عورت سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا۔ پورنما نے یہ بھی کہا کہ سچی محبت کی تلاش میں وہ گناہوں کا ایک بت بن گئی ہے۔ جسے یہ مرد پوجتے ہیں۔ میں نے اس سے تسلیم کروالیا کہ وہ جس محبت کی تلاش میں ہے وہ میرے پاس ہے۔

اس شام کے بعد ہم دونوں نے یہ معمول بنا لیا کہ کلب کے ساتھ جو ایک وسیع لان تھا، اس کے ایک تاریک کنج میں جا کر بیٹھ جاتے اور کبھی کبھی موقع ملتا تو اس کے خاوند کی گاڑی لے کر کسی ایسی طرف نکل جاتے جہاں ہمیں تنہائی میسر آسکے۔ دلی میں ایسی بہت سی جگہیں تھیں تین چار مرتبہ ہم جمنا کے کنارے بھی جا بیٹھے۔ دن کو ہم ہمایوں کے مقبرے میں بھی وقت گزارتے رہے۔ پورنما محبت کی اتنی پیاسی تھی کہ وہ میری ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ اس پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میری حالت یہ تھی کہ تاریک تنہائی میں بھی میرے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تو بھی میرے ذہن سے نکل جاتا تھا کہ میں مرد ہوں اور یہ عورت ہے۔

اس نے مجھ سے چند مرتبہ پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ وہ میرے گھر آنا چاہتی تھی میں نے اسے بتایا کہ وہ میرے گھر آنے کی غلطی کبھی نہ کرے کیونکہ میں بہت بڑے خاندان کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیوی مرچکی ہے اور

میری ماں بڑی سخت طبیعت کی عورت ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اسے ایسی وجوہات بتائیں کہ پھر کبھی اس نے میرے گھر آنے کا نام نہ لیا اور وہ مجھے ایک مظلوم اور مجبور انسان سمجھنے لگی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بوڑھے خاوند سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھے اکساتی تھی کہ میں اسے کسی طرح طلاق دلا دوں یا کہیں بھگا کر لے جاؤں۔

میں نے اس وقت تک کچھ راز حاصل کر لئے تھے۔ جو میں نے اپنے مخصوص طریقوں سے پاکستان پہنچا دیئے تھے۔ لیکن میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ پورنما کو اپنے مشن کی تکمیل کے لئے استعمال کروں۔ وہ میرے کام آسکتی تھی۔ میں اس کی اس کمزوری یا اس وصف کو استعمال کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہندو سوسائٹی سے نالاں تھی۔ مگر میں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف نہیں تھی۔ میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ میں پورنما کو استعمال کرنے کا خطرہ مول نہ لوں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ پاکستان کے اتنا ہی خلاف تھی جتنا کسی ہندو کو ہونا چاہئے۔

اس کے بجائے مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ میں اس کے ہاتھ میں نہ کھیلنے لگوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری محبت پاک تھی۔ جس میں بدی کا شائبہ تک نہ تھا لیکن پورنما کی محبت میں جو نشہ اور خمار تھا وہ مجھے کبھی کبھی فراموش کروا دیتا تھا کہ میں جاسوس ہوں اور یہ لڑکی میرے ملک کی دشمن ہے۔ میرے لئے اپنے آپ میں آنا دشوار ہو جایا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ہندو سوسائٹی میں کس قدر بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ پھر بھی میں اس وقت حیران رہ جاتا جب پورنما کا خاوند اسے میرے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا اور دوسری مرتبہ چائے پر۔ یہ مکروہ شکل ہندو میرے ساتھ جلد ہی بے تکلف ہو گیا۔ میں اس کی وجہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے۔ پورنما اپنے حسن و جوانی کے اثر سے اس بوڑھے خاوند کو بندر کی طرح نچاتی رہتی تھی۔ ایک نقصان یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ دو

تین افسر پورنما کی وجہ سے میرے خلاف ہو گئے تھے۔

چار پانچ مہینے گزر گئے۔ میں نے اس دوران اپنا کچھ کام کر لیا تھا لیکن ایک انتہائی ضروری کام ابھی باقی تھا جو خاصا مشکل تھا۔ اس کے لئے آرمی کے چیف آف سٹاف تک پہنچنا ضروری تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں یہ کام کر لوں گا۔ اس کا کچھ تعلق گڑگاؤں کے ساتھ بھی تھا۔ گڑگاؤں دلی سے پندرہ سولہ میل دور ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے وہاں ائرفورس کے لئے ایک اڈہ بنایا تھا۔ 1947ء کے بعد وہاں اور بھی بہت کچھ بن چکا ہے۔ مجھے وہاں تک جانا ہی تھا۔ لیکن ایک شام پورنما نے خواہش ظاہر کی کہ چلو آج ذرا دور کی سیر کریں۔ میں نے اسے کہا کہ چلو جدھر چلنا ہے چلے جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ گڑگاؤں کی طرف چلتے ہیں۔ کہنے لگی کہ اس طرف کی فضا اور ماحول بڑا کھلا ہے۔

اس نے اپنے خاوند کی گاڑی لی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر خود ہی گاڑی چلائی۔ میں اس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کیا کرتا تھا، یہی باتیں اسے اچھی لگتی تھیں لیکن میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس روز وہ کچھ گھبرائی سی لگ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک بات شروع کی تو بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ ہم اس وقت دلی اور گڑگاؤں کے درمیان جا رہے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کوئی بات سنا رہی تھی۔ پھر چپ کیوں ہو گئی ہے۔ اس نے ہنس کر مجھے ٹالنا چاہا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی ہنسی بناوٹی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ آج کیوں پریشان ہے اس نے میری طرف دیکھا اور گاڑی روک لی۔

اس نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا۔ میں سر سے پاؤں تک سن ہو گیا۔ اچانک ارادہ کیا کہ اسے دھکا دے کر گاڑی سے نیچے پھینک دوں اور گاڑی لے کر بھاگ جاؤں۔ اسے میرا نام کس نے بتایا تھا؟ وہ تو مجھے ایم۔ ڈی شرما کے نام سے جانتی تھی۔ میں نے

اسے پھینک کر گاڑی میں بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن پورنما پر میرا ہاتھ اٹھ نہ سکا۔ فرار کی دوسری صورت یہ تھی کہ میں اسے گاڑی میں چھوڑ کر خود نکل جاتا۔ میں وہاں سے سڑک کے دائیں یا بائیں طرف کہیں بھی غائب ہو سکتا تھا۔ اگر میں دلی پہنچ جاتا تو میری گرفتاری کا خطرہ بہت کم ہو جاتا۔ پورنما سے پوچھنے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی کہ اسے میرا نام کس نے بتایا ہے۔ میرے سمجھنے کی بات صرف یہ تھی جو میں نے سمجھ لی کہ اسے اگر میرا اصلی یعنی اسلامی نام معلوم ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں۔ اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔

"گھبراؤ نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اور اس کو چومتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام مجھے آج معلوم نہیں ہوا۔ میں دو تین مہینوں سے جانتی ہوں کہ تم مسلمان اور پاکستانی جاسوس ہو۔"

"پھر تم نے مجھے پکڑوایا کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں پکڑوانے کے لئے ہی گڑگاؤں لے جا رہی تھی۔" پورنما نے کہا۔ "لیکن دلی سے یہاں تک میرے سینے میں جو لڑائی لگی رہی ہے اس نے مجھے بہت پریشان کیا۔ ایک طرف میری محبت ہے۔ دوسری طرف میرا مذہب اور میرا ملک ہے۔ تم نے شاید محسوس نہیں کیا کہ میں کس قدر گھبراہٹ میں تھی، یہاں پہنچ کر اچانک میرا ذہن صاف ہو گیا۔ میرے دل نے کہا کہ محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں میں اپنی محبت کو قتل نہیں کر سکی۔"

میں حیران تھا کہ میری نشاندہی کس طرح ہوئی ہے اور میرا نام یہاں کس طرح بے نقاب ہوا ہے۔ میں نے پورنما سے پوچھا۔

"مجھ سے زیادہ باتیں نہ پوچھو۔" پورنما نے کہا۔ "ہمارے پاس اتنی لمبی گفتگو کا وقت نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ تین مہینے ہوئے تمہارا پردہ اٹھ گیا تھا۔ مجھے

یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ تمہارے ساتھ لگی رہوں اور دیکھوں کہ تم کہاں کہاں جاتے ہو، کس کس کو ملتے ہو اور تمہاری سرگرمیاں کیا ہیں۔ میں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی ہے لیکن میں اپنی یہ ڈیوٹی پوری نہ کر سکی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں دھوکے میں رکھوں۔ لیکن میرے دل میں تمہاری محبت جو پیدا ہو گئی تھی۔ وہ میری بہت بڑی مجبوری بن گئی۔ میں اپنے افسروں کو تمہارے متعلق جھوٹ موٹ کی رپورٹیں دیتی رہی۔ میں نے تم سے پوچھا کہ تم کہاں رہتے ہو؟ تم نے مجھے جو جواب دیا تھا وہ میں جانتی تھی کہ جھوٹ ہے۔ پھر بھی میں نے تم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ میرا خاوند تمہیں دیکھ کر اس لئے خوش نہیں ہوتا تھا کہ تم اسے اچھے لگتے ہو بلکہ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے پاکستان کے ایک جاسوس کو اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔"

صرف جاسوسوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جاسوسوں کو کس طرح پکڑا جاتا ہے۔ لیکن پبلک کو اس کا علم نہیں۔ بہتر ہے کہ اسے ذرا صاف کر کے بیان کر دیں۔ پڑھنے والے سوچتے ہوں گے کہ میرے متعلق اگر پتہ چل گیا تھا کہ میں جاسوس ہوں تو انہوں نے مجھے پکڑ کیوں نہیں لیا۔ بعض جاسوسوں کو فوراً نہیں پکڑا جاتا۔ بلکہ ان کا خفیہ تعاقب کر کے دیکھتے رہتے ہیں کہ یہ کہاں جاتا اور کس قسم کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اس طرح اس کے پورے رنگ یا گروپ کا سراغ مل جاتا ہے اور سب ایک ہی مرتبہ پکڑے جاتے ہیں۔ میں اس طرح کا جاسوس تھا۔ جہاں بھارتی انٹیلی جنس کو بجا طور پر شک تھا کہ میرے تعلقات بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ ان سب کا سراغ لگانے کے لئے انہوں نے پورنما کو میرے ساتھ لگا دیا لیکن پورنما ہندو بھی تھی۔ پاکستان کی دشمن بھی تھی اور وہ انسان بھی تھی۔ اس کے جذبات پیاسے تھے۔ وہ ہندو کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ لیکن اس کے جذبات فرض پر غالب آ جاتے تھے۔

"میرے خاوند نے بڑی خوشی سے اجازت دی تھی کہ میں اپنے ملک کی خاطر یہ ڈیوٹی انجام دوں۔" پورنما نے کہا۔ "تمہارے متعلق انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ تمہارا اصل مشن کیا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے مشن کا کچھ نہ کچھ تعلق گڑگاؤں کے ساتھ بھی ہے۔ ہمارے دو ہندو افسروں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ان سے تم کیا کیا معلومات لے چکے ہو۔ اب تمہیں گرفتار کرنا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ میں تمہیں گڑگاؤں تک سیر کے بہانے لے چلوں۔ ہمارے افسروں کو معلوم تھا کہ تم گڑگاؤں ضرور جاؤ گے۔ میں تمہیں گرفتار کروانے کے لئے لے جا رہی تھی لیکن مجھے شک ہے کہ وہ تمہیں گرفتار نہیں کریں گے بلکہ تمہیں قتل کر کے کہیں پھینک دیں گے۔"

میں نے اسے کہا کہ بھارت کی حکومت اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ اتنے قیمتی جاسوس کو قتل کروا دے۔ مجھے گرفتار کریں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ میں کیا کیا انفارمیشنز حاصل کر کے پاکستان بھیج چکا ہوں۔

"یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔" پورنما نے کہا۔ "تم نے کئی ایک افسروں کو بیوقوف بنائے رکھا ہے۔ انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا ہے۔ وہ تم سے ذاتی طور پر انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی نیت نہیں بتائی۔ مجھے شک ہے کہ یہ افسر تم سے انتقام لیں گے۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اپنی ڈیوٹی ایک سچے ہندو کی طرح پوری کروں۔ لیکن میں تمہاری محبت کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی۔ تم بھاگ جاؤ۔"

"اور تم؟"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" پورنما نے کہا۔ "میں کہہ دوں گی کہ راستے میں تمہیں کوئی شک ہو گیا تھا اور تم کسی بہانے گاڑی رکوا کر بھاگ گئے ہو۔"

پورنما نے اپنے فرض پر محبت کو غالب کر لیا تھا۔ لیکن میں اپنے فرض کو محبت پر قربان کرنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لئے نہیں بھاگنا تھا

بلکہ بھاگنے کی ضرورت یہ تھی کہ میں نے کچھ اور معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جو پاکستان پہنچنی ضروری تھیں۔ میرے پاس وہیں سے یہ معلومات بھیجنے کا انتظام تھا۔ لیکن یہ ایک راز تھا جو مجھے ذاتی طور پر پاکستان پہنچانا تھا۔ یہاں سے میرے جرم کی ابتداء ہوئی۔ مجھے دو تین روز پہلے ہی وہاں سے نکل آنا چاہئے تھا۔ لیکن پورنما میرے لئے زنجیر بنی رہی۔ میں نے سوچا کہ چلو تین چار دن اور رک جاتے ہیں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

میں نے ارادہ کر لیا کہ نکل جاؤں۔ لیکن مجھے خیال آ گیا کہ ایک لڑکی اپنے آپ کو میری محبت پر قربان کر رہی ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہ جب اکیلی واپس جا کر کہے گی کہ جاسوس بھاگ گیا ہے تو اس پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ اسے ایذارسانی کی اس چکی میں ڈال دیں گے۔ جس میں جاسوسوں کو ڈالا جاتا ہے۔ اپنے فرض کی خاطر مجھے ایک ہندو لڑکی کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن میں بھی بہرحال ایک انسان تھا۔

"نہیں پورنما!" -- میں نے اسے کہا -- "میں تمہیں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ میں تمہارے بغیر اکیلی کیسے زندہ رہوں گی۔" پورنما نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری محبت کی قیمت دینے کا تہیہ کر چکی ہوں۔"

اگر میں پوری تفصیل سے سنانا شروع کر دوں کہ اس نے کیا کہا اور میں نے کیا کہا تو یہ فلمی کہانی بن جائے گی۔ میں صرف یہ بات صاف کر کے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ محبت کی خاطر ایسی قربانی کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن پورنما کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ مڈل کلاس خاندان کی لڑکی تھی۔ جس کی شادی اتنے بڑے افسر کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اس کی خوبصورتی تھی جو اس بوڑھے افسر نے دیکھ لی اور پورنما کے باپ کو معلوم نہیں کتنی رقم دے کر پورنما کو اپنی بیوی بنا لیا۔ ایک تو یہ شخص بوڑھا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس بوڑھے نے پورنما کو محبت کی خاطر بیوی

نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اسے نمائشی چیز بنا کر ساتھ رکھتا تھا اور اپنے بڑے افسروں کو خوش کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ یہ بوڑھا مرکزی حکومت میں سیکرٹری کی سطح کا افسر تھا۔ اس نے پورنما کو بہت بری طرح استعمال کیا۔ ایک تو پورنما کے دل میں انتقام کا جذبہ تھا۔ اور دوسرے اسے ہر انسان کی طرح محبت اور شریفانہ ازدواجی زندگی کی ضرورت تھی۔ وہ محبت اسے مجھ سے ملی میں آپ بتا چکا ہوں کہ وہ انتہائی متعصب ہندو تھی لیکن سچی محبت کی تشنگی اس قدر شدید تھی کہ اس کے دل سے نہ صرف تعصب نکلا بلکہ مذہب بھی اس کے ذہن سے اتر گیا۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ رات کی تنہائیوں اور تاریک ویرانوں میں بھی میری اور پورنما کی محبت پاک رہی۔

پاک محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور ایک ایسا نشہ بھی ہوتا ہے جو انسان کو کسی کام کا نہیں رہنے دیتا۔ پورنما قربانی پر تل گئی تو میں نے سوچا کہ میں تو مرد ہوں مجھے اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے اس سے بڑھ کر قربانی دینی چاہئے۔ اس نے جب یہ کہا کہ وہ میرے بغیر اکیلی نہیں رہ سکے گی تو میرے منہ سے نکلا کہ پورنما تمہارے بغیر میں بھی اکیلا نہیں رہ سکوں گا۔ میں نے اسے سٹیرنگ سے اٹھایا خود ادھر ہو بیٹھا اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں نے گاڑی گھمائی اور دلی میں ایک جگہ گاڑی روک کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر گیا۔ وہاں کے لوگوں سے کچھ باتیں کیں۔ کپڑے تبدیل کر کے معمولی سے کپڑے پہن لئے۔ میں نے انہیں پورنما کے متعلق ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہا کہ میں ساتھ لئے جا رہا ہوں۔

میں نے جو بات نہیں سوچی تھی وہ اس گھر کے ایک بزرگ نے سوچ لی۔ اس نے اپنی بیٹی کا برقعہ مجھے دے کر کہا کہ لڑکی کو اس برقعے میں لے جانا۔ میں واپس آیا۔ برقعہ پورنما کو دیا جو اس نے اسی وقت اوڑھ لیا۔ اب ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کار

نے ہمیں بہت فائدہ دیا۔ ہم ریلوے سٹیشن پہنچے تیسرے درجے کے دو ٹکٹ انبالہ کے لئے خریدے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو رہی تھی۔ لیکن یہ ہمارے لئے بڑی لمبی مدت بنتی جا رہی تھی۔

پورنما کو زنانہ ڈبے میں بٹھایا اور میں مردانہ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی چلی۔ اس نے ہمیں بحفاظت انبالہ پہنچا دیا۔ تھرڈ کلاس کے ہجوم نے ہمیں بڑی اچھی طرح چھپائے رکھا۔ انبالہ اسٹیشن پر اترے۔ تو میرے کہنے پر پورنما نے برقعہ اتار دیا اور وہ چادر اپنے اوپر اوڑھ لی جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس چادر سے اس نے دیہاتی عورتوں کی طرح لمبا گھونگھٹ نکال لیا۔ میں نے اپنا حلیہ اور چلنے کا انداز بھی دیہاتیوں کا سا کر لیا۔ پورنما کو بھی بتایا کہ وہ کس طرح چلے۔

وہاں سے ہم بس میں سوار ہوئے۔ بس میں داخل ہونے کا ہمارا انداز بالکل جاہلوں کا سا تھا۔ اس بس نے ہمیں لدھیانہ پہنچا دیا۔ اصل مسئلہ تو سرحد پار کرنے کا تھا۔ یہ مسئلہ اس لئے ٹیڑھا اور خطرناک ہو گیا تھا کہ سرحدوں کی ناکہ بندی لازمی تھی۔ بھارتی انٹیلی جنس کو رات ہی پتہ چل گیا ہو گا کہ جس جاسوس کو انہوں نے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ جال سمیت لاپتہ ہو گیا ہے۔ ہم جس وقت لدھیانہ پہنچے اس وقت بھارتیوں کو پورنما کے خاوند کی گاڑی بھی دلی ریلوے سٹیشن کے باہر مل چکی ہو گی اور سمجھ گئے کہ ان کا شکار سرحد کی طرف نکل گیا ہے۔

سرحد کی ناکہ بندی کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو میرے لئے یہ مسئلہ اتنا ٹیڑھا نہ ہوتا۔ ایک لڑکی کے ساتھ سرحد پار کرنا۔ تقریباً ناممکن تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس نے اپنی بارڈر فورس کو چوکنا نہ کیا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ معجزہ تھا۔ بارڈر فورس چوکس نہ ہوتی تو پھر ایک چھوڑ میں چار لڑکیوں کو بھی ساتھ لا سکتا تھا۔

ایک بس نے ہمیں امر تسر پہنچا دیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہم سرحد کی طرف چل پڑے۔

یہ علاقہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ 1947ء میں میری عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ جب میں اس علاقے سے گزر کر پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا اور اب سولہ برس بعد بھی نہتا تھا۔ اس وقت بھی دشمن میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اور اب بھی میرے تعاقب میں تھا آپ خود جاسوس بن کر ان علاقوں سے گزر چکے ہیں میں ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ علاقے بیان کئے جائیں۔ پورنما بڑی دلیری سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو میرے اوپر بوجھ نہ بنائے۔ ہم نے آپس میں کوئی جذباتی بات نہ کی۔ پورنما نے ڈر اور خوف کا بالکل اظہار نہ کیا۔

میں نے امر تسر سے چار پانچ روٹیاں اور پکوڑے خریدے تھے۔ یہ ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر کھا لئے تو پیاس نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً آدھ میل اور آگے گئے تو ایک راجباہ سے پانی پیا جو صاف نہیں تھا، ہم جب وہاں سے چلے تو میں نے اندازہ کیا کہ سرحد تھوڑی ہی دور رہ گئی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمیں دریائے راوی بھی عبور کرنا ہے۔ مجھے دریا کی فکر نہیں تھی خطرہ بارڈر سیکورٹی فورس کا تھا۔ میں آپ کو یہ نہیں سنا رہا کہ ہم کس طرح چلتے رہے۔ کتنی تھکان ہوئی اور کیسے کیسے راستوں سے گزرے۔ یہ تو آپ خود جانتے ہیں۔

میں اب آپ کو سرحد پر لے آتا ہوں۔ میرے کان بڑے تیز تھے۔ قدموں کی آہٹ ایک طرف سے سنائی دی تو میں نے پورنما سے کہا کہ وہیں دبک کر بیٹھی رہے خواہ کچھ بھی ہو اپنی جگہ سے نہ ہلے اور میں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ سرحد پر گشتی پہرہ کہاں ہے۔ میں نے اسے سرگوشیوں میں بتا دیا کہ سرحد چوکس ہے۔

پورنما کو دو جھاڑیوں کے درمیان بٹھا کر میں جھک جھک کر اور جو بھی آڑ میسر آئی۔ اس کے پیچھے ہو کر ذرا آگے نکلا کہ خطرے کا جائزہ لوں۔ دو سنتری میرے پانچ چھ گز قریب سے گزر گئے۔ میں وہیں دبکا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد اور سنتری گزرے۔ جن میں سے ایک اپنے ساتھی کو اپنے گھر کی کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے یہ اندازہ کیا کہ چار سنتری آگے نکل گئے ہیں اور میرا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ مجھے اب واپس جا کر پورنما کو ساتھ لانا تھا۔

میں جوں ہی پیچھے کو چلا۔ پورنما کی بڑی خوفزدہ آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا تھا اور وہ دوڑی چلی آ رہی تھی۔ رات تاریک تھی۔ اس کی پکار سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک طرف پورنما کے دوڑتے قدموں کی آہٹیں تھیں۔ دوسری طرف سے بھاری بھر کم بھاگتے ہوئے قدموں کی خوفناک آہٹیں تھیں۔ مجھے "ہالٹ، ہالٹ" کی پکار بھی سنائی دی۔ میں سرحد کی طرف بھاگنے کی بجائے پورنما کی طرف دوڑا۔ میں نے پرواہ نہ کی کہ اب کیا ہوتا ہے میں اور پورنما اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی۔ ہانپتی کانپتی آواز میں اس نے کہا کہ کوئی چیز سر سر کرتی میرے پاؤں کے قریب سے گزر گئی تھی۔ شاید سانپ ہو گا وہ اس سے ڈر گئی تھی۔

اس علاقے میں صرف دیہاتی عورتیں رات کو بے دھڑک گھوم پھر سکتی ہیں۔ دلی شہر کی لڑکی اس علاقے میں سوائے ڈرنے اور بدکنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ پورنما کا خوف بجا تھا۔ میں اسے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر سرحد کی طرف دوڑا۔ آگے سرکنڈے آ گئے۔ میں نے پورنما کو وہاں بٹھا لیا۔ لیکن ہمیں پکڑنے والوں کے قدموں کی آہٹیں اور للکار قریب آ رہی تھیں۔ میں نے جان لیا کہ ہم گھیرے میں آ گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم اگر سرکنڈوں کے اندر چلے گئے تو سرحد

پہرہ دار سرکنڈوں کی تلاشی ضرور لیں گے۔

میں نے ان کی آوازوں سے اندازہ کیا کہ مجھے کدھر سے نکلنا چاہیے۔ میں نے پورنما سے کہا کہ میرے ساتھ پیٹ کے بل رینگتی چلو۔ تھوڑی دور تک ہم پیٹ کے بل رینگتے گئے۔ سرحدی محافظ بالکل خاموش ہوگئے۔ یہ شاید ان کی چال تھی۔ کچھ اور آگے جا کر میں نے پورنما کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور ہم تیز تیز چلنے لگے۔ اچانک پیچھے سے ایک للکار سنائی دی اور ہم دوڑ پڑے۔ لیکن بیک وقت معلوم نہیں کتنی رائفلیں فائر ہوئیں۔ گولیاں میرے قریب سے گزریں اور پورنما جو میرے ساتھ چلتی آ رہی تھی چیخ مار کر رک گئی۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی پھر لڑھک گئی میں بے اختیار اس طرف لپکا اسے گولی لگ چکی تھی۔ اس کے منہ سے صرف اتنی سرگوشی نکلی۔ "تم چلے جاؤ۔" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض خاموش تھی۔ میرے سینے میں ایک راز تھا۔ جو پاکستان تک پہنچانا تھا مجھے بھاگ آنا چاہیے تھے۔ اب میں اکیلا تھا۔ میں شاید رینگتا سرکتا، چھپتا وہاں سے نکل ہی آتا۔ لیکن پورنما کی موت نے میرے دماغ پر برا اثر ڈالا۔ میں یہ بھول کر کہ میں کتنے بڑے خطرے میں ہوں۔ پورنما کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر اس کا سر اوپر اٹھایا اور اپنا گال اس کے گال کے ساتھ لگا دیا اور میں بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔ بھارتی سیکورٹی فورس کے آدمی جب مجھے پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ میں اس وقت بھی ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

اس کے بعد آپ خود جانتے ہیں کہ مجھے وہاں سے گرفتار کر کے کس جہنم میں ڈال دیا گیا ہوگا۔ تفتیش کا وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس میں سے ہر اس جاسوس کو گزارا جاتا ہے جو پکڑا جاتا ہے۔ اذیتوں سے میں بے ہوش ہو جاتا تھا اور جب ہوش آتا تو پھر وہی تفتیش اور پہلے سے زیادہ ایذا رسانی شروع ہو جاتی۔ اس بات کو مجھ تک ہی رہنے دیں کہ

میں نے انہیں کیا بتایا اور کیا نہیں بتایا۔ میں اصل بات جو کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اذیت دینی شروع کر دی۔ میں خود کہتا تھا کہ مجھے یہی سزا ملنی چاہیے تھی۔ میرا جرم یہ نہیں تھا کہ میں پاکستانی جاسوس تھا اور میرا جرم یہ بھی نہیں تھا کہ میں ایک ہندو لڑکی کو اغوا کر کے لایا تھا۔ میرا اصل جرم یہ تھا کہ میں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنے جذبات کا خیال رکھا۔ وہ راز جو میں بھارت سے لا رہا تھا میرے ملک کی امانت تھی۔

1965ء میں رن کچھ میں پاکستان اور بھارت کی لڑائی ہوئی اور پھر جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تب تک میں بھارت کے تین جیل خانے دیکھ چکا تھا اور اذیتیں سہہ سہہ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔

1966ء میں اعلان تاشقند کے بعد جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور ان کے ساتھ خدا نے میری سن لی۔ اور مجھے بھی چند اور پاکستانی قیدیوں کے ساتھ پاکستان کے حوالے کر دیا گیا، میں اپنے گھر آگیا اور مسلسل بیمار رہنے لگا۔ میرے بہت علاج کروائے گئے۔ سب سمجھتے تھے کہ مجھے بھارت میں جو اذیتیں دی گئی ہیں یہ ان کا اثر ہے۔ لیکن یہ صرف میں جانتا تھا کہ یہ کیا اثر ہے؟

میں نے اپنے آپ کو یہ روگ لگا لیا کہ میں نے فرض پورا نہیں کیا۔ جس کے لئے مجھے بھیجا گیا تھا۔ میرا علاج تو نفسیات کا کوئی ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے سینے کا غبار کاغذ پر منتقل کر کے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے تو کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن میرا جسم اندر سے اس قدر کھایا جا چکا ہے کہ میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔

چائے والا

لوگ اسے لنگڑا بھی کہتے ہیں۔ کھوکھے والا اور چائے والا بھی کہتے ہیں اور جو اس کے ماضی سے آشنا ہیں۔ وہ اسے سابق سمگلر بھی کہتے ہیں۔ مگر وہ پاکستان کی داستان شجاعت کے ایک باب کا عنوان ہے۔ جسے کوئی پڑھنا گوارا نہیں کرتا اور جس کے متعلق کوئی کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک کھوکھے میں بیٹھا چائے بیچتا ہے۔ اسے میں جانتا ہوں یا میرے وہ معدودے چند دوست جو بھارت کی جیلوں میں کچھ عرصہ گزار کے آئے ہیں یا اسے بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس، ملٹری انٹیلی جنس اور وہاں کی پولیس جانتی ہے۔

آپ اس مصلحت کو سمجھتے ہوں گے جس کے تحت میں اس کا نام پتہ ظاہر نہیں کروں گا۔ اس کے بجائے میں اسے شریف کہوں گا۔ وہ بھارت کے ضلع ہوشیار پور کے ایک قصبے مکیریاں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ قصبہ وسوہا کے قریب ہے۔ اس کی عمر بارہ سال تھی۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اسے بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ مگر یہ ہجرت خون میں ڈوبا ہوا سفر تھا۔ اس کی ماں کو ہندوؤں نے جولائی 1947ء

میں ہی قتل کر دیا تھا۔ اگست میں اس نے اپنے باپ اور بہن کے ساتھ ہجرت کی۔ یہ پا پیادہ سفر تھا۔ راستے میں اس کے قافلے پر حملہ ہوا تو وہ اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گیا۔ وہ تو قیامت تھی۔ جس میں سے وہ گزرا۔ یہ ایک لمبی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہے کہ وہ کس طرح پاکستان پہنچا۔ حملے کے بعد سفر کے دوران اسے نہ باپ ملا نہ بہن ملی۔

پاکستان میں آ کر بارہ سال کی عمر کا یہ لڑکا محنت مزدوری کرنے لگا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کی جذباتی حالت کیسی ہو گی اور اس نے زندگی کے وہ دن کس طرح گزارے ہوں گے۔ دو سال گزر گئے اور ایک دن سے ایک نابینا شخص نظر آیا۔ جس کی شکل و صورت اس کے باپ سے ملتی جلتی تھی۔ شریف کو اپنا باپ یاد آ گیا۔ یہ اندھا اس کے قریب سے گزرا تو شریف رہ نہ سکا۔ اسے روک لیا۔ وہ اس کا باپ ہی تھا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ شریف نے اپنی بہن کے متعلق پوچھا تو باپ نے اسے بتایا کہ جب قافلے پر حملہ ہوا تھا تو ہندو اور سکھ اس کی بہن کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ باپ اپنی بیٹی کو ڈھونڈتا رہا مگر ناکام ہو کر پاکستان آ گیا۔ اس سے بیٹی چھن چکی تھی اور کمسن بیٹا بچھڑ گیا تھا۔ بچوں کی ماں ہندوؤں کے ہاتھوں پہلے ہی قتل ہو چکی تھی۔ باپ نے رو رو کر اپنی بینائی کھو دی تھی۔ شریف نے عہد کر لیا کہ وہ اپنی ماں کے خون کا اور بہن کا عصمت کا انتقام لے گا۔

اس کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو باپ مر گیا۔ شریف کے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ مگر اسے صحیح راستے میں ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے قتل و غارت اور خونریزی دیکھی تھی۔ اس سے اپنا گھر اور گھر کے تمام افراد چھن گئے تھے۔ اس کی قسمت میں محنت مزدوری لکھی تھی۔ ان حالات نے اسے سمگلر بنا دیا۔ وہ دراصل کسی سمگلر کا نوکر بنا تھا۔ نوکر سے چیلا بنا پھر اچھا خاصا استاد بن گیا۔ یہ 1953ء کا واقعہ ہے۔

جب پاکستان میں سمگلنگ باقاعدہ کاروبار کی صورت میں عروج پر تھی۔ اس وقت بعض وزیر اور بڑے بڑے افسر بھی اس کاروبار کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ان حالات میں شریف کا سمگلروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ البتہ یہ حیران کن تھا کہ اس پیشے میں اس نے ذہانت اور بے خوفی کے مظاہرے شروع کر دیئے۔ وہی سرحد جو اس نے 1947ء میں عبور کی تھی اور پھر یہ سرحد اس کے لئے لوہے کی دیوار بن گئی تھی۔ اب اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ راتوں کو کم اور دن دہاڑے زیادہ بار سرحد پار کیا کرتا تھا۔

سمگلر عموماً سرحد تک رہتے ہیں۔ آگے مال دوسرے گروہ لے جاتے ہیں۔ لیکن شریف ان چیدہ چیدہ سمگلروں میں سے تھا جو خود سرحد پار جاتے اور اپنا مال خود ٹھکانے پر پہنچا کر آتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک کام ہوتا ہے۔ شریف کو اب یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کتنی بار بھارت کے دور اندر تک گیا تھا۔ دلی تک چلے جانا تو کوئی بات ہی نہیں تھی وہ مدراس تک گیا تھا۔ وہ کئی بار اپنے آبائی قصبے کے قریب سے بھی گزرا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر جہاں وہ پیدا ہوا اور جہاں اس نے عمر کے ابتدائی بارہ سال گزارے تھے۔ اس کا خون ابل پڑتا اور اس کے دل میں انتقام کا عزم تازہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار وہ پاکستان میں مال سمیت پکڑا گیا اور اسے ایک سال سزائے قید ہوئی۔ وہ جب جیل سے نکلا تو استاد سمگلر بن چکا تھا۔ جیل میں استادوں نے اسے مزید ٹریننگ دے دی تھی۔ 1965ء میں جب بھارت نے رن کچھ میں حملہ کیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ تو شریف کے اندر وہ انسان بیدار ہو گیا۔ جو بھارت سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ فوراً فوج میں بھرتی ہونے کے لئے چلا گیا۔ مگر اسے سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے فوج نے قبول نہ کیا۔ قانون یہی تھا۔ جرائم پیشہ اور سزا یافتہ آدمی کو فوج میں نہیں لیا جا سکتا۔ وہ بہت مایوس ہوا۔

14

رن کچھ کی جنگ بند ہو گئی۔ لیکن جنگ کے بادل چھائے رہے۔ بھارت کے اس وقت کے وزیراعظم شاستری نے ان الفاظ میں پاکستان کو للکارا۔ "ہم اب اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے۔" بھارتی فوجوں کی نقل و حرکت بتا رہی تھی کہ اب وسیع پیمانے پر جنگ ہو گی۔ بھارت کو اپنی جنگی طاقت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ پاکستان کو ریت کی ڈھیری سمجھتا تھا۔ پاک فوج چوکس ہو گئی۔ چوکس ہونے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام فوج کا ایک شعبہ کرتا ہے۔ اس کام کے لئے ایسے غیر فوجی افراد کو بھی استعمال کیا جاتا ہے جو دشمن کے علاقے سے واقف ہوں اور اس قسم کی اداکاری کر سکیں کہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے ہیں۔

شریف فوج میں بھرتی ہونے کے لئے پریشان اور مایوس پھر رہا تھا۔ وہ انتقام کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ اس نے بھرتی ہونے کے لئے کسی سے بات کی تو اسے بتایا گیا کہ ملٹری انٹیلی جنس کو آدمیوں کی ضرورت ہے۔ وہ گیا تو اسے بتایا گیا کہ دشمن کے علاقے میں جا کر بھارتی فوجوں کی مورچہ بندی اور پوزیشنوں کے متعلق معلومات فراہم کرنی ہے۔ شریف مشرقی پنجاب سے خوب واقف تھا۔ وہ سرحد کا کیڑا تھا۔ اس نے صاف بتایا کہ وہ سمگلر ہے اور دشمن کے علاقے میں کوئی شک پیدا کئے بغیر گھومنا پھرنا خوب جانتا ہے۔ اسے جاسوسی کے لئے رکھ لیا گیا۔

دو چار روز کی ہدایات کے بعد اسے بھارتی علاقے میں بھیجا گیا۔ وہ اس طرف کے دیہاتی کسان کے بھیس میں لاپرواہی سے گھومتا پھرتا رہا اور کامیابی سے واپس آ گیا پھر اس کے ساتھ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک دو آدمی بھیجے گئے۔ انہیں وہ دیہاتی لباس میں لے گیا۔ اس نے نہایت استادی سے سرحد پار کی۔ ایسے حالات میں جب سرحد پر دشمن کی فوج موجود ہو اور باڈر سیکورٹی فورس کی گشت بھی ہو۔ سرحد پار کرنا تقریباً

ناممکن ہوتا ہے۔ شریف نے یہ مشکل آسان کر دی اور وہ دوسرے مشن سے بھی کامیاب واپس آیا۔ دوسری بار اس کے ساتھ فوجی تھے۔ جنہوں نے دشمن کی وہ پوزیشنیں دیکھ لیں جو وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ شریف کی تعلیم کل چھ جماعت تھی اور عملی تجربہ صرف سمگلنگ کا تھا لیکن اس کے اندر جو جذبہ پیدا ہو گیا تھا اس نے اس کی ذہانت بیدار کر دی تھی۔ اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ اتنا زیادہ ذہین آدمی ہے۔ وہ دوسرے مشن میں ہی سمجھ گیا کہ فوج کو کس قسم کی معلومات درکار ہیں اور فوج کا ڈیپلائے کیا ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی فوجی اس کے ساتھ جائے۔ وہ اب خود جانے لگا اور نہایت کار آمد معلومات لانے لگا۔

اس نے ایک ڈھنگ اور اختیار کر لیا۔ وہ یہ تھا کہ اس نے بھارتی فوج کے اکے دکے سپاہیوں کو اغوا یا گمراہ کر کے اپنی فوج کے پاس لانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے کا صرف ایک واقعہ سنا دینا کافی ہوگا۔ ایک روز وہ سرحد پار کے کسی سرحدی قصبے میں اپنے مشن پر گیا ہوا تھا۔ لاریوں کے اڈے پر اس نے دو مرہٹے سپاہی دیکھے جن کی بٹالین سرحد پر مورچہ بند تھی۔ یہ دونوں سپاہی چھٹی کاٹ کر آئے تھے۔ یا کہیں سے ڈیوٹی پر آئے تھے۔ معلوم نہیں انہیں لاریوں کے اڈے پر کیوں اتار گئے تھے۔ بہر حال شریف نے دیکھا کہ یہ سپاہی کسی گاؤں کا راستہ پوچھ رہے تھے۔ ان کی بٹالیں وہاں تھی۔ پنجاب کے علاقے اور زبان سے وہ واقف نہیں تھے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے تھے۔

شریف نے انہیں چائے کی پیالی پر پھانس لیا اور انہیں یہ تسلی دے لی کہ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کی بٹالین کے مورچوں سے واقف ہے۔ انہیں چائے اور گپ شپ میں الجھائے رکھا تاکہ ذرا شام ہو جائے۔ کچھ وقت بعد وہ انہیں ساتھ لے گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ شریف اپنی بھارتی فوج کی بے پناہ تعریفیں کر رہا تھا اور پاکستان کو گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ سپاہی بڑی سادگی میں اس کے ساتھ چلتے آئے اور انہیں

اس وقت اپنی سادگی کا احساس ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ وہ جس پوسٹ میں پہنچا دیئے گئے ہیں وہ پاکستان کے رینجرز کی پوسٹ ہے۔ رینجرز نے ان بھارتیوں سپاہیوں کو فوج کے حوالے کر دیا۔

پھر چھ ستمبر 1965ء کی صبح طلوع ہوئی۔ سرحد پر توپیں گرج رہی تھیں۔ ٹینک دھاڑ رہے تھے۔ مشین گنوں اور رائفلوں نے قیامت کا شور بپا کر رکھا تھا۔ ہندو اٹھارہ سالوں کی تیاری کے بعد پاکستان کو فتح کرنے آیا تھا۔ پہلے روز ہی ہر محاذ پر حملہ روک لیا گیا۔ بھارتی فوج کسی نہ کسی طرف سے آگے بڑھنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ شریف پاک فوج کے کسی ڈویژن یا بریگیڈ کے ساتھ جاسوسی کے لئے موجود تھا۔ اسے اب ایک اور قسم کی ڈیوٹی دی گئی۔ یہ کمانڈو اپریشن تھا۔ دشمن کے مورچے کے پیچھے جا کر کسی بتائے ہوئے ٹارگیٹ کو تباہ کرنا ہوتا تھا۔ کبھی پتہ چلتا تھا کہ کسی گاؤں میں دشمن نے تیل، یا ایمونیشن کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ اسے تباہ کرنے کے لئے کمانڈو پارٹیاں بھیجی جاتی تھیں اور ایسے ہی کچھ اور مشن تھے جن میں شریف کو گائیڈ کے طور پر بھیجا گیا۔

اس نے نہایت جانفشانی اور خوبی سے راہنمائی کی۔ اپنے جانباز فوجیوں کو کمال دلیری سے دشمن کے عقب میں تباہی مچاتے دیکھا مگر اسے افسوس یہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اپنے افسروں سے کہا کہ اسے بھی ہتھیار دیا جائے اس نے جب اپنے جذبات کا اظہار کیا تو اسے سٹین گن دے دی گئی۔ اسے سٹین گن کے استعمال کا تھوڑا سا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں ہندوؤں سے انتقام لے لیا۔ لیکن وہ ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔

ایک شام وہ پاک فوج کی ایک پارٹی کے ساتھ گائیڈ بن کر جا رہا تھا۔ یہ ٹارگیٹ بھی دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں تھا۔ راستے میں ایک پل آ گیا۔ جس کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اس نے پارٹی کو پیچھے چھپا رہنے دیا اور خود دریا پار کرنے کا کوئی اور ذریعہ یا ایسی جگہ

دیکھنے چلا گیا۔ جہاں دریا گہرائی میں نہ ہو۔ وہ سب سے پہلے پل کا جائزہ لینے گیا جوش اور
جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے پل کے قریب جانے کی بہت بڑی غلطی کی تھی۔
جنگ کی حالت میں کوئی پل ایسا نہیں ہوتا جو فوج کی نگرانی میں نہ ہو۔ اسے پل پر روک
لیا گیا۔ اس نے چرب زبانی اور ایکٹنگ سے سپاہیوں کو قائل کر لیا کہ وہ ہندو کسان ہے
اور قریب ہی کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔

اس کی بد قسمتی کہ ایک سکھ حوالدار آ گیا۔ اس نے کہا کہ اس کی تلاشی لو۔ شریف
نے کپڑوں کے اندر سٹین گن چھپا رکھی تھی۔ اس نے بھاگنے کا فیصلہ کیا مگر اس کے
تین طرف سپاہی تھے اور چوتھی طرف دریا۔ اسے زیادہ خیال ان چار جانبازوں کا تھا جو
قریب ہی چھپے تھے۔ اس کے سامنے بیک وقت دو مسئلے تھے۔ ایک اپنے فرار کا اور دوسرا
پاک فوج کے جوانوں کو بچانے کا۔ اس نے اپنے سب سے قریب کھڑے بھارتی سپاہی
کو کسی طرح ذرا پیچھے کر دیا اور بجلی کی سی تیزی سے دوڑ کر دریا میں کود گیا۔ اندھیرے
میں اس کے پیچھے کئی گولیاں فائر ہوئیں۔ جن میں سے ایک گولی اس کے کندھے میں
لگی۔ خوش قسمتی سے ہڈی بچ گئی۔ گولی گوشت میں سے گزر گئی۔ اس نے پروانہ کی اور
ڈبکی لگا کر پل کے نیچے سے گزر گیا۔ روشنی راؤنڈ فائر ہوئے دریا روشن ہو گیا۔ شریف
نے زیادہ سے زیادہ دیر پانی کے اندر رہنے کی کوشش کی اور وہ خطرے سے نکل گیا۔

کیا اس کا یہ کارنامہ معمولی تھا۔ وہ آگے جا کر دریا میں سے نکلا۔ قمیص پھاڑ کر خون
روکنے کی کوشش کی اور اس جگہ واپس آ گیا جہاں وہ چار جوانوں کی پارٹی چھوڑ آیا تھا؟ اگر
اس کا یہ کارنامہ تفصیل سے بیان کیا جائے تو بے شمار صفحات صرف اسی کے لئے درکار
ہوں گے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر یہ بتایا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ وہ انہیں
کسی اور طرف لے گیا اور جب یہ پارٹی اپنا کام کر چکی تو وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ
سے گر پڑا۔ اس کے ساتھی اسے اٹھا کر لے آئے۔

ستمبر 1965ء کی جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن شریف نے ایسے محسوس کیا جیسے یہ اس کی
زندگی کے مشن کی ابتداء تھی۔ اس نے پاک فوج کو جاسوسی کے لئے خدمات پیش کر
دیں۔ جب فوجیں سرحدوں سے ہٹ گئیں تو وہ بھارت کے اندر جا کر جاسوسی کرنے
لگا اسے سرحد پار کرنے اور کرانے کی خصوصی مہارت حاصل تھی۔ 1965ء سے
1970ء تک اس نے کئی بار بھارت جا کر انٹیلی جنس کے لئے بڑی اہم معلومات اور
دستاویزات حاصل کیں۔ دوسرے جاسوسوں کو کئی بار سرحد پار کرائی۔ اس کا ہر مشن
کامیاب ہوتا تھا، مگر 1970ء میں وہ ایک ایسے سکھ جاسوس کے ساتھ چلا گیا جو ڈبل
ایجنٹ تھا یعنی وہ درپردہ دونوں ملکوں کے لئے جاسوسی کر رہا تھا۔ اب شریف اس کے
ساتھ گیا تو اس ڈبل ایجنٹ نے اسے گرفتار کرا دیا۔ یہ حیران کن نہیں کہ پاکستان نے
ایک سکھ کو اپنا جاسوس بنا رکھا تھا ایسا ہر ملک میں ہوتا ہے کہ ایک حریف ملک کے
باشندوں سے ہی جاسوسی کرائی جاتی ہے۔ پاکستان میں آپ کو پاکستانی بھارت کے لئے
جاسوسی کرتے نظر آئیں گے۔

بھارت کی سیکورٹی فورس ایک عرصے سے شریف کے نام سے واقف ہو چکی تھی
اور اسے گرفتار کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ مگر شریف ان کے ہاتھ نہیں
آتا تھا۔ اس سکھ نے اسے بڑے ڈرامائی طریقے سے گرفتار کرایا۔ شریف اسے جانتا تھا
وہ سرحد پار کر کے اس سکھ کے گھر چلا گیا۔ سکھ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنی
جوان بیٹی کو اس کے پاس ایک کمرے میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے باہر سے دروازے
کی زنجیر چڑھا دی۔ شریف نے اسے حفاظتی اقدام سمجھا۔ سکھ اپنی بیٹی کو اس لئے اسکے
ساتھ بٹھا گیا تھا کہ وہ جوان آدمی ہے اس کی بیٹی کے ساتھ باتوں میں مگن رہے گا۔

بہت دیر تک سکھ نہ آیا تو شریف کو شک ہوا۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو
اسے پولیس کھڑی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ جال میں پھنس گیا ہے۔ اس نے سکھ کی بیٹی

سے کہا کہ اس کے باپ نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور اس نے اسے (بیٹی کو) آلہ کار بنایا ہے۔ بیٹی طیش میں آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ پاکستان کا جاسوس ہے اور شریف اسی کام کے لئے پاکستان سے آیا ہے شریف نے اسے کہا کہ وہ کھڑکی سے نکل جائے گا۔ لیکن اسے گولی مار دی جائے گی۔ سکھ کی بیٹی نے اسے کہا--"میں کھڑکی میں سے نکلتی ہوں تم میرے پیچھے نکلو اور میرے پیچھے ہی رہنا۔ وہ مجھے گولی نہیں ماریں گے۔ اگر انہوں نے گولی چلا بھی دی تو پہلے میں مروں گی۔ میرا باپ دھوکہ باز نکلا تو میں تمہاری مدد کروں گی۔ میں پنجاب کی جٹی ہوں"-- لیکن شریف ایک جوان لڑکی سے اتنی قربانی لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔

بھارت کی پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس نے اس سے خوب بدلے لئے۔ اسے اتنی اذیتیں دیں کہ وہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہا۔ اسے مرنے بھی نہ دیا گیا۔ بھارتیوں کو معلوم تھا کہ وہ معمولی قسم کا جاسوس نہیں۔ انہوں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی اور کچھ عرصہ بعد قیدیوں کے تبادلے میں اسے پاکستان بھیج دیا--

آج ہماری تاریخ کا یہ درخشاں باب ایک کھوکھے میں بند ہو گیا ہے۔ اس باب کا ہیرو ہمیشہ کے لئے لنگڑا ہو کر اس کھوکھے میں چائے بناتا نظر آتا ہے اور جب اس کا کوئی گاہک نہیں ہوتا تو وہ سر جھکائے گہری سوچوں میں کھو جاتا ہے۔ شاید اپنے ماضی کو تلاش کرنے لگتا ہے۔

جعل ساز

اس سے پہلی ملاقات نابھہ جیل (بھارت) میں ہوئی تھی۔ پردیس میں ہم وطن ایک دوسرے کو سگا بھائی سمجھتے ہیں اور جب دو ہم وطن دشمن کی جیل میں اکٹھے ہو جائیں تو وہ خون کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

ایک روز ایک خوش شکل، خوش طبع جواں سال قیدی میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے اپنا نام منیر بتایا اور کہنے لگا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اسے کسی نے میرے متعلق بتایا تھا کہ میں جاسوسی کے الزام میں پکڑا گیا ہوں۔ اس نے کچھ خوشی کا اظہار کیا۔ میں چوکنا ہو گیا کیونکہ بعض باتیں جو جاسوسوں سے ایذا رسانی سے نہیں اگلوائی جا سکتیں۔ وہ اس طرح کے آدمیوں کے ذریعے معلوم کر لی جاتی ہیں۔

منیر خاصا گھاگ معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سمجھ گیا کہنے لگا کہ میں آپ سے کوئی راز کی بات معلوم نہیں کروں گا۔ صرف پاکستان کی محبت نے مجھے آپ کے پاس لا بٹھایا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوا ہے؟

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں بڑا پاپی ہوں۔ لیکن اب بغیر کسی جرم کے پکڑا گیا ہوں۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں۔ میں خاصا لکھا پڑھا ہوں۔ لیکن حالات نے مجھے اس طرف دھکیل دیا ہے۔ میرا میدان کچھ اور ہے۔ اب ایک دوست کے ذریعے یہ خیال آیا کہ سمگلنگ کا کاروبار بھی شروع کیا جائے۔ ہوا یوں کہ میرے دوست کی پارٹی مجھے ساتھ لے آئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور ان کے پاس مال کیا ہے۔ مجھے اتنا ہی پتہ ہے کہ ہم نے بارڈر بڑی آسانی سے پار کر لیا اور بھارت میں دور تک آ گئے۔ کسی نے ہمیں للکارا۔ اس کے ساتھ ایک گولی فائر ہوئی۔ میرے ساتھی ادھر ادھر بھاگ گئے۔ میں اکیلا بیوقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ بھارت کی پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے مارا پیٹا۔ میں نے انہیں صاف بات بتا دی اور کہا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کہ یہ لوگ کیا لا رہے تھے۔ میں بالکل نیا آدمی ہوں اور یہ بارڈر کراس کرنے کا جرم ضرور کیا ہے مجھے تین چار جگہوں پر لے گئے۔ ہر جگہ مجھے مارا پیٹا گیا۔ میں نے ہر جگہ یہی بات بڑے صاف الفاظ میں بتائی۔

ان لوگوں کو بہر حال یقین ہو گیا کہ میں نے اس جرم میں شامل ہوتے ہوئے یہ جرم نہیں کیا۔ لیکن وہ اتنا سمجھ گئے کہ میں کوئی کم عقل آدمی نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں جو شاید بھارت کی انٹیلی جنس کا دفتر تھا۔ میری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ایک ہندو میجر نے مجھے کہا کہ میں پاکستان واپس چلا جاؤں باقاعدہ سمگلنگ کروں لیکن مجھے جاسوسی کرنی پڑے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے تھوڑے دنوں کی ٹریننگ دیں گے۔

"میں نے اسے کہا کہ جس طرح میں ہر جگہ اپنا سچا اور ایک ہی بیان دے رہا ہوں۔ اسی طرح میں آپ کو سچ سچ بتا دیتا ہوں کہ میں کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو جاؤں اپنے ملک کو دھوکا نہیں دوں گا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں پاکستان میں مجرمانہ زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ وہ میرا وطن ہے......

میں کسی ہندو سے بھلائی کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ میجر میری صاف گوئی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے مجھے کہا کہ تمہارے خلاف اس کے سوا اور کوئی الزام نہیں ہے کہ تم نے غیر قانونی طور پر سرحد عبور کی ہے لیکن میں تمہیں چھڑا لوں گا اور واپس پاکستان بھجوا دوں گا......

"مجھے میجر کی نیت پر شک ہوا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اذیتیں دینے کے بجائے آپ کیوں نہیں مجھے سزائے قید سنا دیتے؟ میں کس طرح یقین کر لوں کہ آپ مجھ پر اتنی مہربانی بلاوجہ کر رہے ہیں۔ اس نے آہ بھری اور کہنے لگا کہ پاکستان نے مجھ پر جو مہربانی کی ہے میں اس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔ میں ستمبر 1965ء میں شدید زخمی حالت میں تمہارے ملک کا جنگی قیدی بن گیا تھا۔ پاکستانیوں نے میرا علاج اور میری دیکھ بھال اتنے پیار سے کی۔ جیسے میں پاکستان آرمی کا افسر ہوں۔ ورنہ میں تو مر گیا تھا۔ میں بالکل صحیح سلامت اور پہلے سے زیادہ تندرست ہو کر اپنے ملک میں آیا ہوں۔ تمہیں تھوڑے دن جیل کی حوالات میں رہنا پڑے گا۔ میری رپورٹ اوپر جائے گی اور وہاں سے تمہاری رہائی کا حکم آ جائے گا۔

"اتنے میں بارک کا سنتری آ گیا۔ اس نے منیر کو بھگا دیا۔ کیونکہ میرے جرم کے قیدیوں سے دوسرے قیدی زیادہ مل ملا نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد منیر کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخر ایک دن وہ بڑا خوش خوش آیا اور کہنے لگا کہ وہ پاکستان جا رہا ہے۔

اس کے بعد میرے خلاف تفتیشیں ہوتی رہیں۔ مقدمہ چلتا رہا۔ تین چار سال اسی طرح جیل سے کورٹ اور کورٹ سے جیل تک آنے جانے میں گزر گئے۔ بالآخر میں پاکستان واپس آ گیا۔

تقریباً پانچ سال بعد کی بات ہے کہ میں مال روڈ کی فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔

میرے کندھے ہاتھ پر کسی کا ہاتھ آ پڑا۔ میں نے بدک کر دیکھا۔ ایک خوش پوش آدمی نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں اسے نہ پہچان سکا۔ لیکن جب اس نے بات کی تو اتنی مانوس آواز نے پہچان آسان کر دی -- وہ منیر تھا۔

وہ مجھے قریب ہی ایک ہوٹل میں لے گیا۔ میری ذات میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ پوچھتا تھا کہ پھر کسی مشن پر کب جاؤں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کام سے فارغ ہو چکا ہوں اور اب اپنا ہی کوئی ذریعہ معاش ہے۔

"طارق بھائی!" اس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے یہ شکست قبول کر لی ہے جو ہمیں مشرقی پاکستان میں ہوئی ہے؟ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔"

میں نے اسے رسمی سا جواب دیا لیکن میں سوچ یہ رہا تھا کہ اس شخص کو اپنے ملک کی فتح اور شکست کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو خود کہتا ہے کہ میں پاکستان میں مجرمانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ یہ شک بھی تھا کہ یہ شخص میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ کہیں بھارتی جاسوس تو نہیں بن گیا؟ میں براہ راست اس سے ایسی بات پوچھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے بھی آخر جاسوسی کی تھی۔ ٹریننگ لی تھی۔ تجربہ حاصل کیا تھا۔ میں نے اس تجربے کے داؤ پیچ کھیلتے ہوئے اسے اپنا پکا یار بنا لیا۔ جب ہم رخصت ہوئے تو اس نے مجھے اپنے گھر کا پتہ دے کر کہا کہ کل رات کا کھانا میں اس کے گھر کھاؤں گا۔

اگلی شام میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ اسے ٹھونک بجا کر دیکھوں گا کہ اس شخص کی اصلیت کیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے تعارف کرایا۔ وہ سانولے رنگ کی ایک عام سی جوان لڑکی تھی اور وہ بنگالن تھی۔

"طارق بھائی!" منیر نے کہا۔ "یہ لڑکی بنگلہ دیشی نہیں یہ مشرقی پاکستانی ہے۔ مجھے اس کی ذات میں مشرقی پاکستان نظر آتا ہے۔"

اس لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ منیر نے پاکستان کے متعلق پھر وہی جذباتی سی باتیں کیں۔ جیسے وہ پہلے کرتا رہا تھا۔ لیکن میں شک میں پڑا رہا۔

اس کے بعد ہماری تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک روز میں نے پریشان ہو کر اسے کہا۔ "منیر! جس طرح تم نے انڈین انٹیلی جنس کے سامنے بالکل سچا بیان دیا تھا اسی طرح مجھے بھی سچ سچ بتا دو کہ تم ہو کیا؟"

ایسی چند اور باتیں کر کے اس نے مجھے کہا کہ آؤ ذرا ادھر باغ میں چل کر بیٹھتے ہیں باغ میں اس نے جا کر کہا کہ تم نے اچھا کیا ہے جو مجھ سے پوچھ لیا ہے کہ میں کیا ہوں۔

"میں ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ میرے والد ریلوے میں کلرک تھے۔ اتنی محدود آمدنی میں بھی انہوں نے ہم پانچ بہن بھائیوں کو تعلیم دلائی۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں سب سے بڑا تھا۔ میں جب تھرڈ ائیر میں تھا تو ایک روز میں نے اپنے امی اور ابا کو بڑی پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ امی کہنے لگی کہ بیٹا! تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری بہن جوان ہو گئی ہے۔ رشتوں کے پیغام آتے ہیں۔ لیکن ہم کسی کے آگے ہاں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جہیز بنانا تو دور کی بات ہے ہم بارات کو کھانا بھی کھلانے کے قابل نہیں ...... تمہاری اس بان کے بعد دوسری بہن جوانی کو پہنچ رہی ہے۔

"طارق بھائی! ایسے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے میرے اندر کوئی فالتو رگ ڈال دی ہے یا شاید میں بہت حساس ہوں۔ دونوں بہنیں میرے اعصاب پر غالب آ گئیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ پڑھائی چھوڑ دوں گا اور کوئی نوکری تلاش کروں گا۔ میں اپنے ماں باپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ امی ابا نہیں چاہتے تھے کہ میں تعلیم ادھوری چھوڑ دوں۔ لیکن میرے اندر اتنا پختہ عزم ہے کہ اسے تم ڈھیٹ پن بھی کہہ سکتے ہو۔

میں اگلے روز کالج جانے کے بجائے نوکری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اسی شام سے ٹائپنگ بھی سیکھنی شروع کر دی......

"کئی دنوں تک میرا معمول یہ بنا رہا کہ درخواست لکھنی اور کسی دفتر میں جا کر دے دینی اور وہاں سے ٹکا سا جواب لے کر واپس آ جانا...... طارق بھائی! اگر میں تمہیں یہ بتانے لگوں کہ مجھے کیا کیا جواب ملے اور میں نے کیا کیا دیکھا تو تم کہو گے کہ منیر جھوٹ بولتا ہے۔"

اس نے وہ تمام محکمے گنوائے جہاں جہاں اس نے درخواست دی تھی۔ بعض دفتروں سے تو اسے یہ جواب ملا کہ کم از کم کسی وزیر کی سفارش لاؤ۔ دو تین محکموں سے اسے یہ جواب ملا- "پندرہ ہزار روپیہ نقد لاؤ اور آ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

منیر بہت ہی پریشان ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ تو پندرہ روپے بھی دینے کے قابل نہیں۔ اسے بڑے پیار سے کہا گیا کہ پندرہ ہزار تم دو مہینوں میں پورے کر لو گے۔ یہاں نوکریوں کی بولی بولی جاتی ہے۔ یہاں سے منیر کا دماغ پھر گیا۔ دماغ تو پھرنا ہی تھا۔ اس نے آخری دفتر میں جا کر فی الواقعہ روتے ہوئے کہا کہ مجھے چپڑاسی ہی رکھ لو۔ مجھے اپنی دو بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ محکمے کے اس افسر نے منیر سے کہا-- "دیکھو بھئی، میں تو شادی شدہ ہوں۔ میں تمہاری بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔"

"طارق بھائی! میں نے کبھی کسی کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس روز میں قتل پر بھی تیار ہو گیا۔ لیکن اچانک دونوں بہنیں اور بوڑھے ماں باپ میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ میں نے اپنے خون کا گھونٹ بھر لیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں زمین پر چل رہا ہوں یا آسمان پر میں تو یہی کہتا ہوں کہ مجھ جیسوں کی مدد خدا ضرور کرتا ہے۔ جس طرح اس روز میں نے تمہیں راہ جاتے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا۔ اسی طرح میرے کندھے پر ہاتھ پڑا۔ میں نے دیکھا وہ میرا سکینڈ ائیر کا

کلاس فیلو تھا۔ سکینڈ ائیر ہی میں وہ کالج سے بھاگ گیا تھا۔ میری طرح وہ بھی درمیانے درجے کے گھرانے کا لڑکا تھا۔ لیکن میں اس کا سوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ سوٹ کہاں سے اڑایا ہے؟ اس نے کہا کہ ابھی تم مجھ سے یہ بھی پوچھو گے کہ وہ کار کہاں سے اڑائی ہے۔

"اس نے مجھے اپنی کار دکھائی اور وہ مجھے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے یہی ساری کہانی سنا دی جو تمہیں سنائی ہے۔ اس نے کہا کہ تم بیوقوف ہو۔ اگر تم سٹوڈنٹ لیڈر بن جاتے تو تمہارے وارے نیارے ہو جاتے۔ جس سیاسی پارٹی کے ساتھ تم لگ جاتے وہ پیسوں سے تمہاری جیبیں بھر دیتی۔ اس نے مجھے کہا کہ تم جہاں بھی گئے۔ تمہارے ساتھ مجرمانہ بات کی گئی کیا تم سمجھے نہیں کہ شرافت سے یہاں کوئی کام نہیں بنتا؟"

اس آدمی نے منیر کو اپنے ساتھ لگا لیا وہ جانتا تھا کہ منیر میں ایک خاص قسم کی ذہانت ہے۔ ان ہی دنوں حکم آیا تھا کہ سو روپے اور پچاس روپے کے نوٹ بنکوں میں جمع کروا دیے جائیں۔ یہ شخص منیر کو ایک بنک کے سامنے لے گیا۔ وہاں لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ نوٹ تبدیل کروانے آئے تھے۔ اس شخص نے منیر کو بتایا کہ کچھ لوگ سورج نکلنے سے پہلے یہاں آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ دنوں سے آ رہے ہیں۔ سارا دن قطار میں کھڑے ہو کر گزار جاتے ہیں۔ ان کی باری نہیں آتی۔

یہ شخص منیر کو ایک قطار کے آخر میں لے گیا اور ایک سفید ریش بزرگ سے پوچھا کہ ان کے پاس کتنے نوٹ ہیں۔ بزرگ نے بتایا کہ سو سو اور پچاس پچاس کے نوٹ ملا کر کل بارہ سو روپے ہیں۔ منیر کے سابق کلاس فیلو نے اس بزرگ سے کہا کہ آپ کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔ یہ ایک ہزار روپیہ مجھ سے لے لیں اور بارہ سو

میرے حوالے کریں۔ بزرگ نے پریشان یا حیران ہونے کے بجائے دعائیں دیں اور
کہنے لگے کہ اس عمر میں چار روز سے آ رہا ہوں۔ وہ بزرگ قطار سے نکل آئے۔ بارہ سو
روپیہ ان کے حوالے کیا اور منیر کے دوست نے ایک ہزار روپیہ دس دس کے نوٹوں
کی شکل میں اسے دے دیا۔ وہ بزرگ دعائیں دیتے چلے گئے۔

منیر کا دوست اسے بنک کے اندر لے گیا۔ ایک کلرک کے آگے سو سو اور پچاس
پچاس کے نوٹ رکھے۔ کلرک نے دو منٹ میں دس دس کے نوٹ اس کے حوالے کر
دیئے۔ باہر آ کر اس نے منیر کو بتایا کہ کلرک نے اپنے پچاس روپے کاٹ لئے ہیں۔

"طارق بھائی!" اس نے کہا۔ "جتنے دن یہ نوٹ تبدیل ہوتے رہے۔ میں دو تین
ہزار کماتا رہا۔ میرے اس دوست نے مجھے ایک روز دعوت دی کہ چلو تمہیں بہشت
بھی دکھاتے ہیں۔ وہ مجھے طوائفوں کے بازار میں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ
میں یہ جرم اپنی عیاشی کے لئے نہیں کر رہا۔ میری جیب میں یہ ساری رقم حرام کی ہے۔
لیکن میں اسے حرام کاموں میں ضائع نہیں کروں گا۔ میں تمہیں سچی بات بتاتا ہوں کہ
شراب اور طوائف بازی تو دور کی بات ہے۔ میں سگریٹ تک نہیں پیتا......

"اس دوست نے جس کا میں نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ایک اور راستہ بتا دیا۔
اس نے مجھے کہا کہ ملٹری کورٹوں کا ایک میجر ہے میں ایک آدمی تمہارے پاس لاؤں گا
اور اسے یہ بتاؤں گا کہ تم اس میجر کے چچازاد بھائی ہو اور وہ میجر تمہارے اشاروں پر ناچتا
ہے۔ پھر میں تمہیں اس شخص کے سامنے کہوں گا کہ ان پر ایک کیس بن گیا ہے جو
تمہارے رشتہ دار میجر کے پاس ہے تم مجھ پر اور اس پر غصہ جھاڑنا کہ تم ایسا غلط کام نہیں
کرو گے۔ پھر میں تمہاری منتیں کروں گا اور آخر میں تمہیں دو تین ہزار روپے دوں گا۔
تم یہ نوٹ پھینک دینا اور کہنا میں پانچ ہزار سے کم نہیں لوں گا......

"مختصر یہ کہ اگلے ہی روز پانچ ہزار روپے میری جیب میں آ گئے۔ سائل کے

جانے کے بعد میں نے اڑھائی ہزار روپے اپنے دوست کو دے دیئے۔ سائل کو ہم نے
پوری تسلی دی کہ وہ بری ہو جائے گا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ بری ہوا بھی تھا یا نہیں میں
تو کسی میجر کو جانتا پہچانتا نہیں تھا......

"میں نے دونوں بہنوں کی شادی کر دی اور جہیز ایسا دیا کہ لوگ حسد کی نظروں
سے دیکھتے تھے۔ میرے ابا امی اور بہنیں مجھے لعنت ملامت کرتی رہیں کہ میں کہیں ہاتھ
مار رہا ہوں۔ میں انہیں جھوٹی قسمیں کھا کر بتاتا تھا کہ میں میوہ منڈی اور سبزی منڈی
میں دلالی کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میرے اندر ایک فالتو رگ تھی۔ وہ
بیدار ہوئی تو میں استاد بن گیا۔ ملٹری کورٹوں کے چھ سات ملزموں سے میں نے
مجموعی طور پر پچپن ہزار روپیہ اینٹھا۔ آخر ایک بار پکڑا گیا اور ایک سال سزائے قید
ہوئی اور آٹھویں مہینے میں جیل سے نکل آیا لیکن اب میں ایسے تھا۔ جیسے میں سکول سے
نکل کر یونیورسٹی میں گیا اور آخری ڈگری حاصل کر کے نکلا۔ تم نے خود جیلوں میں
دیکھا ہے کہ جیل جرائم کی یونیورسٹی ہے۔ وہاں مجھے بھی استاد مل گئے اور انہوں نے
ایسے ایسے ہاتھ سکھائے کہ میں حیران رہ گیا۔

"میں نے جیب تراشی، اٹھائی گیری، ڈکیتی وغیرہ کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے جعل
سازی اور دھوکہ دہی زیادہ پسند آئی۔ میں جب جیل سے نکل کر آیا تو ایک پٹرول پمپ
کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ایک کار پٹرول پمپ میں آ کر رکی۔ ایک لڑکا پٹرول ڈالنے
لگا وہ اپنے میں مگن تھا کار والا اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے پاس چلا
گیا ہاتھ اس کے آگے کیا اور پوچھا۔ "کتنا ڈلوا رہے ہیں صاحب؟" اس نے کہا چار گیلن۔
اس کے ساتھ ہی اس نے دس دس کے کچھ نوٹ مجھے پٹرول پمپ کا آدمی سمجھ کر
میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

"ان دنوں سیمنٹ نہیں ملتا تھا۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ ان کے پاس پیسہ تھا بلکہ

فالتو پیسہ تھا۔ لیکن انہیں سیمنٹ نہیں ملتا تھا۔ یہ فراڈ اپنی جان پہچان کے لوگوں کے ساتھ چلتا ہے۔ میری جان پہچان خاصی ہو چکی تھی۔ میں کسی ایک آدمی کو پھانس کر اس سے سیمنٹ کی پوری قیمت وصول کر لیا کرتا تھا ظاہر ہے کہ سیمنٹ تو اسے ملتا نہیں تھا اور میرا کمال یہ تھا کہ اسے مطمئن رکھوں کہ سیمنٹ مل جائے گا اس کاروبار میں گالیاں کھانی پڑتی تھیں۔ طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ جتنی گالیاں منہ پر مجھے ملتی میں ویسی ہی گالیاں اس فرضی آدمی کو دے دیتا جسے میں ظاہر کرتا تھا کہ اسے رقم دے دی ہے۔

"گالیاں کھا کھا کر میں مکمل طور پر ڈھیٹ ہو گیا۔ جیل میں ایک اور فراڈ کی بھی تربیت حاصل کی تھی۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ عدالتوں میں ملزموں کا جو ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے لائے جاتے ہیں۔ کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ ان میں اکثر پردیسی ہوتے ہیں یا ان کے تعلقات محدود ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ضمانت پر رہا نہیں ہو سکتے۔ ایک مدت سے بوگس ضمانت کا کاروبار چل رہا ہے جو کراچی سب سے زیادہ ہے، ملزم کے ساتھ سودا بازی کر لی جاتی ہے اور جائیداد کے جعلی کاغذات اور رجسٹریاں وغیرہ عدالت میں پیش کر کے مجھ جیسا کوئی فراڈیا ملزم کو ضمانت پر رہا کروا دیتا ہے۔

"میں نے یہ کام شروع کر دیا۔ ملزم کی حیثیت کے مطابق اس سے فیس کمیشن لے لی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کاروبار کو یوں آگے چلایا جاتا ہے کہ دوسرے تیسرے مہینے بوگس ضامن ملزم کو جا کر کہتا ہے کہ میرے کاغذات جعلی ثابت ہو گئے ہیں میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں کہ تمہاری ضمانت منسوخ کروا کے کہیں بھاگ جاؤں۔ ملزم دوبارہ جیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مقدمے کئی سال چلتے ہیں۔ وہ ہاتھ جوڑتا ہے اور مزید رقم پیش کرتا ہے۔ اس طرح بوگس ضامن بلیک میلنگ جاری رکھتے ہیں۔

میں نے اس کاروبار سے بھی خوب کمایا اور یہ رقم چھوٹے بھائیوں کی تعلیم پر خرچ کرتا رہا۔ مجھے پتہ چلا کہ جعلی افیم اور چرس بھی بنائی جا سکتی ہے۔ جو دوسرے ملکوں کو

سمگل کی جاتی ہے۔ مجرموں کی دنیا میں میرا ایک مقام بن چکا تھا۔ ان لوگوں سے پتہ چلا کہ جعلی افیم چرس وغیرہ کس طرح بنائی جاتی ہے۔ میں نے کچھ مقدار بڑی محنت کر کے تیار کر لی۔ لیکن میں سمگلنگ کے ہنر سے بالکل ناواقف تھا۔ میرے ایک دو دوستوں نے ایک پارٹی کے ساتھ تعارف کروا دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ بھی کھلاڑی تھے۔ میرے جعلی مال پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ وہاں سے جب میں واپس آیا تو میرے ابا! امی مجھ سے بیگانے ہو چکے تھے۔ ابا نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ تم اس گھر میں رہو گے۔ تو میں تمہیں اپنا بیٹا ہرگز نہیں سمجھوں گا۔ تمہارے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کروں گا اور اگر اس گھر سے ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ گے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ پھر میں بہنوں کے گھر گیا۔ انہوں نے مجھے رو رو کر کہا کہ تم کس دنیا میں چلے گئے۔ دونوں بہنویوں نے مجھے اپنے اپنے گھر کی پیش کش کی لیکن میں اپنے قابو سے نکل چکا تھا......

میں اب کہیں بھی جا کر آباد ہو سکتا تھا۔ لیکن میں اپنی وہ جڑ نہیں کاٹ سکتا تھا جو میرے گھرانے میں تھی۔ میں گھر سے رشتہ نہ توڑ سکا۔ مجھے گھر گئے ہوئے دو تین دن ہو گئے تھے ایک دوست ملا۔ اس نے مجھے بڑا شرمسار کیا کہ لوگ تمہارے باپ کی بے عزتی کر رہے ہیں اور تم عیش موج کر رہے ہو۔ میں یہ سن کر بڑا پریشان ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ مالک مکان نے کوئی غنڈہ بھیجا تھا۔ جس نے میرے باپ کی بے عزتی کی اور یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ دو دن کے اندر مکان خالی کر دو یا موجودہ کرائے سے دوگنا کرایہ دو، ورنہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا۔

"میں بھاگم بھاگ اپنے گھر گیا۔ ابا سے پوچھا کہ وہ کون تھا۔ ابا نے مجھے گالیاں دیں اور کہا کہ تم اگر حلالی ہوتے تو آج میری بے عزتی نہ ہوتی۔ باپ کو بیٹوں پر ناز ہوتا ہے میں دو دن گھر رہا۔ ابا سے کوئی بات نہ کی۔ تیسرے دن وہی غنڈہ ہمارے گھر آیا۔ میں

باہر نکلا۔ وہ شاید مجھے جانتا پہچانتا تھا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ میں نے اسے کہا کہ مالک مکان سے تم نے کتنے پیسے لئے ہیں۔ اس نے کوئی تین چار سو روپے کی رقم سنائی۔ میں نے اسے کہا کہ تم یہ پسند کرو گے کہ تین چار سو روپوں کے پیچھے تمہاری کوئی ٹانگ یا بازو ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جائے؟ وہ بھی آخر غنڈہ تھا۔ کچھ تو تو میں میں ہوئی اور وہ چلا گیا۔ میری بھی یاری ایسے ہی غنڈوں کے ساتھ تھی۔ میں نے چار پانچ غنڈے ساتھ لئے پہلے اس غنڈے کے گھر گیا اور اسے باہر بلا کر مارنے پیٹنے کے بجائے زبانی کہا کہ آئندہ میرے گھر کا رخ نہ کرے۔ وہاں سے میں ان غنڈوں کو ساتھ لے کر مالک مکان کے گھر گیا۔ اس شخص کا میں کوئی ادب لحاظ نہیں کرنا چاہتا تھا، میں نے گلی میں کھڑے ہو کر اسے گالیاں دے کر للکارا۔ وہ باہر آیا اور اندر بھاگ گیا۔ محلے کے لوگ جمع ہو گئے میں نے انہیں بتایا کہ اس شخص نے کیا حرکت کی ہے اور میں اسے نہیں چھوڑوں گا میں نے محلے والوں سے کہا کہ اسے باہر نکالو اور یہ وعدہ کرے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

باہر آنے کے بجائے اس نے ہمیں اندر بلا لیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ میری اور بے عزتی نہ کرو۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ میں نے اسے کہا کہ اسے ایک پیسہ فالتو کرایہ نہیں ملے گا اور اس نے غنڈے بھیجے یا مقدمہ دائر کیا تو اس کا گھر اسی رات لٹ جائے گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ کرایہ لینے بھی وہاں نہ جائے۔ کرایہ اسے یہیں مل جایا کرے گا، میں نے گھر جا کر ابا سے کہا کہ آئندہ وہ کسی کو کرایہ نہ دے۔ میں خود کرایہ پہنچایا کروں گا۔

"اس مالک مکان کو ٹھکانے لگا کر ہم واپس آ رہے تھے۔ تو میرے ایک غنڈے دوست نے کہا کہ یہ کاروبار بڑا اچھا ہے۔ تین چار سو روپیہ وصول کرو۔ کسی شریف کرایہ دار کو دھمکیاں دو۔ مکان خالی کروالو۔ میں نے کبھی غنڈہ گردی نہیں کی تھی۔ لیکن یہ کاروبار پسند آیا۔ میں نے چند دنوں میں چار پانچ مالکان مکان ڈھونڈ نکالے۔ ہر ایک کے

ساتھ کچھ اس طرح کی باتیں کیں کہ آپ کتنا کرایہ لے رہے ہیں؟ انہوں نے جو کرایہ بتایا میں نے اس سے دوگنا بتا کر کہا کہ آپ مکان خالی کروالیں۔ ہم آپ کو بڑا موٹا کرایہ دار دلائیں گے۔ ہر مالک مکان نے یہی مشکل بتائی کہ کرایہ دار مکان خالی نہیں کرتے۔ میں پانچ ہزار بتا کر کہتا کہ یہ رقم دے دو اور پرسوں تک مکان خالی لے لو......

"مالک مکان تو چاہتے ہی ہیں کہ ہر مہینے کرایہ بڑھایا جائے۔ بعض پرانے کرایہ داروں کو کئی کئی ہزار روپیہ پیش کرتے ہیں کہ وہ مکان خالی کر دیں۔ میری پیشکش انہیں بڑی اچھی لگتی اور صرف ایک مہینے میں میں نے کرایہ داروں کو غنڈوں سے ڈرا دھمکا کر پانچ مکان خالی کروا لئے اور پچیس ہزار روپیہ مل گیا۔ میرے ساتھ تین غنڈے تھے۔ یہ رقم ہم چاروں نے تقسیم کر لی۔

"اتنے بڑے شہر میں ہزارہا مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ میں اسی کو کاروبار بنانا چاہتا تھا۔ ایک روز ایک مالک مکان نے مجھے کہا کہ دس بارہ سال سے میرے ایک مکان میں بنگالی خاندان رہتا ہے وہ غریب سے لوگ ہیں۔ کرایہ نہیں بڑھاتے اور مکان بھی نہیں چھوڑتے۔ اس نے کہا کہ آپ تین ہزار روپے لے لیں اور وہ مکان خالی کروا دیں۔ میں ان کا پتہ لے کر وہاں گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ کتنے پانی میں ہیں اور کیا غنڈہ گردی کی ضرورت ہے یا نہیں چھوٹا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھا سا بنگالی باہر آیا۔ میں نے اسے کہا کہ تم مکان کیوں نہیں خالی کرتے۔ میں کل شام تک تمہیں یہاں نہ دیکھوں......

بوڑھے نے مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ مجھے چارپائی پر بٹھا کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ پہلے تو اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے پھر اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور اس کی آنکھوں سے بنگال کی ندیوں کی طرح آنسو بہنے لگے۔ اس نے کہا کہ چھوٹی سی دکان ہے جو میرے کنبے کو بڑی مشکل سے روٹی کھلا سکتی

ہے۔ سب سے بڑی مصیبت میرے سر پر یہ ہے کہ میری ایک بیٹی جوان ہے میں اسے صرف زندہ رکھ سکتا ہوں۔ اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ میں کہتا ہوں مجھے تھوڑا عرصہ اور اسی کرایے پر رہنے دو۔ شاید بیٹی کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دینے کے قابل ہو جاؤں۔

"میں نے اسے کہا کہ تم اپنے وطن کیوں نہیں گئے؟ اب تو تمہارا اپنا وطن بن گیا ہے۔ اس نے میری ٹانگ پر اپنا ہاتھ اس طرح دبایا جیسے اس کی انگلیاں میرے گوشت میں اتر جائیں گی۔ اس نے جذبات سے کانپتی آواز میں کہا کہ میرا وطن یہ ہے۔ میری اور میرے خاندان کی قبریں اسی مٹی میں بنیں گی۔ تم جسے بنگلہ دیش کہتے ہو وہ میرا دیش نہیں۔ وہ دیش ہندو نے بنایا ہے۔

اگر تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو تو میں پھر بھی اسی مٹی پر تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا اس نے پھر میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگا کہ مجھے پردیسی سمجھ کر نہ دھتکارو میری جوان بیٹی کے حال پر رحم کرو......

"جس طرح پاکستان کے ایک افسر نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہاری بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا تو میرے اندر جو آتش فشاں پھٹ پڑا تھا وہی پھر پھٹ پڑا میں نے بوڑھے بنگالی سے پوچھا۔ کہاں ہے تمہاری بیٹی؟ اس نے آواز دی اور ایک سانولی سی لڑکی کمرے میں آئی۔ وہ کوئی اتنی خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں مشرقی پاکستان کی لاش اور اس کے باپ کی غربت نظر آ رہی تھی۔ میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر بوڑھے سے کہا کہ میں تمہاری بیٹی کو بیاہ کر لے جاؤں گا......

"بوڑھے کا سانولا رنگ لال ہو گیا۔ وہ سمجھا شاید میں کوئی بدمعاشی کی بات کر رہا ہوں یا اس کی غریبی پر طنز کر رہا ہوں۔ میں نے بہت سی باتیں کہہ سن کر اس کے وہم اور شک شبہے دور کر دیئے۔ پانچ چھ دنوں بعد میرا اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح ہو گیا میں نے اس مکان کے مالک سے کہا کہ آئندہ اس بوڑھے کو پریشان نہ کرے۔ جب میری

مالی پوزیشن بہتر ہو گی تو میں خود ہی کرایہ بڑھا دوں گا۔

"بوڑھے کی ایک چھوٹی سی منیاری کی دکان تھی۔ میرے پاس کافی رقم تھی۔ میں نے ایک بڑی دکان کرایے پر لے لی اور بوڑھے کو جو میرا سسر بن چکا تھا۔ اپنے ساتھ لگا لیا۔ اللہ نے کرم کیا کہ میری طرف ایک نیکی پر میرے گناہ معاف کر دیئے اور میرا کاروبار چل نکلا۔ اب بڑی خوشحالی کی زندگی گزر رہی ہے اور میں شریفوں کی زندگی میں واپس آگیا ہوں۔"

بے نام سی عقیدت

میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں، جہاں انسان کو واقعی خدا یاد آ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے وہ گناہ بھی جو کبھی اس نے بڑے فخریہ انداز میں کئے تھے۔ میری عمر ستر سال کے قریب تو ہو گی جن میں سے جوانی کے کم از کم بیس سال جیلوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ایک وہ دور تھا۔ جب بڑے بڑے بدمعاش میرا نام سن کر سہم جایا کرتے تھے۔ ممکن ہے آج لوگ اس بات پر یقین نہ کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری غیر موجودگی میں پولیس کو کبھی میرے علاقے میں گھسنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

آپ کہتے ہوں گے یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے اور کیسی غلط باتیں کرتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے انگریز کا دورِ غلامی دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت کے بدمعاش آج کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ جس گاؤں یا شہر میں ایک بدمعاش ہوتا تھا اس گاؤں اور شہر کے لوگ رات کو لمبی تان کر سو جایا کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا جان و مال بالکل محفوظ ہے اور اس بدمعاش کے ہوتے کسی کی جرأت نہیں کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

میرا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ نام میں رکھا ہی کیا ہے انسان کا کردار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے نام والوں کو اپنی ضرورت کے لئے معمولی معمولی سے

لوگوں کے سامنے جھکتے دیکھا ہے اور بڑے گمنام سے لوگوں میں مجھے ایسا کچھ نظر آیا ہے کہ وہ مجھے دنیا کے عظیم ترین انسان لگے۔

میں نے ایک عام سے زمیندار گھرانے میں جنم لیا۔ ہمارا گاؤں ادھر سرحد کے پار پنجاب کا ایک مشہور گاؤں تھا۔ اسے آپ چھوٹا سا قصبہ ہی سمجھ لیں۔ بعض دیہات آج بھی آپ کو ایسے ملیں گے جن کی ناموری کی وجہ قتل و غارت گری یا چوری چکاری ہوتی ہے۔ بزرگ جانتے ہیں کہ کئی دیہات انہی چوروں اور ڈاکوؤں کے نام پر آباد ہو گئے تھے۔

میرے والد ایک مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ گاؤں کے واقعات سے الگ تھلگ وہ بڑے اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے تھے جبکہ ہمارے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکھوں کے گھر مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ کوئی معمولی گھٹیا قسم کے سکھ نہیں تھے بلکہ "ذیلدار" سکھ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان لوگوں کی عزت تھی اور دولت کی بھی ان کے ہاں ریل پیل رہتی تھی۔ ان سکھوں کے مقابل جو مسلمان زمیندار تھے وہ بھی کسی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ بھی سرکار دربار میں ایک مقام رکھتے تھے اور حکومت کی چمچہ گیری میں سکھوں سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ علاقے میں جو بھی نیا تھانیدار آتا وہ مسلمان ہوتا۔ سکھ ہندو یا عیسائی ہر دو فریقین اس کی دعوت بڑے وسیع پیمانے پر ترتیب دیتے۔

پولیس کا آنا جانا یوں بھی ہمارے علاقے میں لگا رہتا تھا کیونکہ ہمارے یا ارد گرد کے کسی گاؤں میں کوئی نہ کوئی واردات ہوتی ہی رہتی تھی۔ لیکن کیا مجال جو کبھی پولیس کسی کے گھر گئی ہو۔

ہمارے گرد اگرد دیہاتوں کے چور اور بدمعاش عموماً پناہ لینے کسی سکھ یا مسلمان کے

گھر چھپے رہتے تھے اور پولیس جب کبھی مخبری پر چھاپہ مارتی تو کبھی اس گھر کی طرف نہیں آتی تھی۔ گاؤں کے باہر ہی کسی سکھ ذیلدار یا مسلمان جاگیردار کی حویلی پر پولیس آکر بیٹھ جاتی اور وہیں مطلوبہ شخص کو بلایا جاتا۔ اب یہ ان لوگوں کی صوابدید پر ہوتا کہ وہ مطلوبہ شخص کو کب اور کہاں پیش کریں گے؟ یا نہیں کریں گے۔

اچھے برے لوگ دنیا کے ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں لیکن آج کی طرح اس دور میں بھی پولیس کا محکمہ کچھ زیادہ ہی بدنام تھا وہ لوگ جو من گھڑت اور جھوٹی کہانیاں لکھ کر انگریز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملادیتے ہیں دراصل ذہنی طور پر ابھی تک انگریز کی غلامی کررہے ہیں۔ ان پڑھے لکھے جاہلوں کو یہ علم نہیں کہ انگریز نے پولیس کو صرف اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے بے تحاشا اختیارات دے رکھے تھے۔ جو لوگ انگریزوں کے منظور نظر تھے وہ ہر طرح اپنی من مانیاں کرتے تھے اور پولیس کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے نزدیک بھی پھٹک سکے۔

ہمارے گرد اگرد دیہاتوں میں کئی بے چارے غریب لوگ انگریزوں کے پروردہ زمینداروں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔ لیکن کسی کو ان کے قتل کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ اگر کسی تھانیدار نے زیادہ ایمانداری کا مظاہرہ کیا تو اس بیچارے کی نوکری سے چھٹی ہو جاتی تھی۔

میں یہ باتیں اپنی نئی نسل کے نوجوانوں کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ انہیں آزادی کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔ آج آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ یہ ٹھیک ہے پولیس عوام سے بسا اوقات زیادتیاں کر جاتی ہے لیکن عدالتیں تو اپنی ہیں۔ کہیں نہ کہیں انصاف تو مل ہی جاتا ہے۔ انگریز کے دور میں انصاف صرف ان کے لئے تھا جو اس کی حکومت کے لئے کتے کی طرح وفادار رہتے تھے۔ ورنہ تو کئی غریب اور انگریز دشمن نوجوانوں کی جوانیاں جیلوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

میرا چچا اس علاقے میں "جٹا بدمعاش" کے نام سے مشہور تھا، والد کے بالکل برعکس وہ اس علاقے کا مانا ہوا "تھامو" تھا۔ تھامو اس بدمعاش کو کہا کرتے تھے جس کے پاس چھوٹے چھوٹے بدمعاش چوری چکاری کے جانور برائے فروخت یا چھپانے کے لئے لایا کرتے تھے۔ یہ چچا والد سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔

میرے والد نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ میں چچا کے سائے سے بھی بچا رہوں لیکن ایک تو چچا نے شادی نہیں کی تھی دوسرے اس وجہ سے کہ میں اپنے والد کا پہلوٹھی کا بیٹا تھا اور دنیا میں میرے والد اور چچا تھے ہی دو بھائی۔ ہماری کوئی پھوپھی نہیں تھی۔ میرے چچا کو مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ میں نے بمشکل آٹھ جماعتیں پاس کیں۔ وہ بھی والد کی سختی اور مسلسل نگرانی کی وجہ سے گھر پر وہ خود مجھے قرآن پاک پڑھاتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے کہ میں زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزاروں۔ لیکن مجھے جب کبھی موقع ملتا اپنے چچا کے پاس بہادروں اور بدمعاشوں کی کہانیاں سننے بیٹھ جاتا۔

چچا کی محبت رنگ لائی اور ایک روز میں بھی اس کے ساتھ واردات پر چلا گیا۔

پہلی رات جب میں چچا کے ساتھ چوری کی واردات پر گیا تو میری عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ ہم لوگ شام ڈھلے اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے۔ چچا نے اس سے پہلے مجھے اس فن کے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ وہ تو مرد ہی نہیں جس نے پانچ دس چوریاں نہ کی ہوں۔ اس سے پہلے چچا مجھے مزے لے لے کر اپنے گھیرے میں آنے اور پھر ان لوگوں کو چکمہ دے کر نکل جانے کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ کسی بڑے نامی گرامی چور یا بدمعاش کا ذکر کرتا تو بالکل اس طرح جیسے کسی بڑی اعلیٰ ہستی کا بیان کر رہا ہو۔

تمام راستے وہ مجھے ایسے ہی واقعات سناتا آیا۔ ہم نے پیدل ہی قریباً بیس میل راستہ

دو ڈھائی گھنٹے میں طے کر لیا۔ میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ اس زمانے میں یہ کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور لوگ عموماً پیدل چلا کرتے تھے۔

ہم لوگ جس جگہ پہنچ کر رکے وہاں دور ایک گاؤں کے دھندلے دھندلے نقوش دکھائی دیئے۔ اندھیرے میں اتنی دور تک ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اکا دکا جلنے والے دیئے یا لالٹین کی لو یہ احساس دلا رہی تھی کہ یہ کوئی گاؤں ہے۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ سکھوں کا ایک مشہور گاؤں ہے۔

اس گاؤں کے سردار اردگرد کے علاقے میں ہمارے گاؤں کے سرداروں کی طرح ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حال ہی میں ان لوگوں نے ایک قیمتی گھوڑی خریدی تھی جس کی اطلاع میرے چچا کو اس کے مخبروں نے پہنچا دی تھی۔ میرا چچا معمولی قسم کا وارداتیا تو تھا نہیں۔ وہ عموماً بڑے ہاتھ مارا کرتا تھا۔ اور ایسا قیمتی شکار تو اس نے کبھی چھوڑا ہی نہیں تھا۔

ہم دونوں گاؤں کے باہر کماد کے کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ چچا مجھے یہاں بھی بڑے بڑے بدمعاشوں کی وارداتیں سناتا رہا۔ بڑے چور اور بدمعاش ایسی وارداتیں بچوں کے ساتھ نہیں کیا کرتے۔ نہ ہی وہ جلدی کسی پر اعتماد کرتے ہیں لیکن میرے چچا کی جہاندیدہ نظروں نے یا تو مجھ میں چھپے "دلیر آدمی" کو دیکھ لیا تھا یا وہ پہلی ہی واردات میں میری جھجک ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ ایک مرتبہ سننے بیٹھ جاؤ تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے وقت گزاری کے لئے مجھے اپنے ایک "ڈاکے" کی کہانی سنانی شروع کر دی۔ اور بتاتا رہا کہ کس طرح وہ اپنے ساتھیوں سمیت گاؤں والوں کے گھیرے میں آ کر نکل گیا تھا۔ ان باتوں میں ہمارے دو ڈھائی گھنٹے ضائع ہو گئے۔ لیکن کیا مجال جو مجھے وقت کا ذرا سا بھی احساس ہوا ہو۔

کہانی کے اختتام پر چچا نے کہا۔۔ "بچہ تگڑا ہو جا۔۔ ہم روانہ ہونے والے ہیں۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دور میں ہمارے علاقے میں امام دین گوہاولنگی اور دپے ڈاکو کی کہانیاں لوگ گا گا کر سنایا کرتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس لمحے میں خود کو کسی ایسی ہی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔

چچا نے بھی اس حویلی کا نقشہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا، جہاں سے ہم نے گھوڑی کھولنی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ سکھ علاقے کے مانے ہوئے زمیندار ہیں۔ گھوڑی کی حفاظت کے لئے انہوں نے حویلی میں پہرے دار بھی یقیناً رکھے ہوں گے۔

اس زمانے میں آتشیں اسلحہ اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی اسے بزدلی سمجھا جاتا تھا کہ کسی کو چھپ کر گولی مار دی جائے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈانگ کو جس کے ایک سرے پر لوہے کی میخیں گاڑی گئی تھیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا۔ چچا نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے تھپکی دی اور ہم دونوں اللہ کا نام لے کر کھیتوں سے باہر نکل آئے۔

سردیوں کا آغاز تھا اور رات کے اس پہر کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی سردی پڑنے لگتی تھی۔ مجھے اپنا سارا وجود تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے اچانک بخار چڑھ آیا ہو۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ ہم چلتے گئے۔ چچا آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا۔ ہم گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اکا دکا روشنیاں جو دور سے جھلملاتی نظر آ رہی تھیں اب دم توڑ چکی تھیں۔ گاؤں کے دوسرے کونے سے چوکیدار کی آواز "جاگتے رہو" کبھی کبھی ضرور سنائی دے دیتی تھی لیکن چچا کو جیسے اس آواز کی پرواہ ہی نہیں تھیں۔

اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر میری طرف دیکھا۔ شاید میری حالت کا جائزہ

لینا چاہتا تھا۔ میں چچا سے آنکھیں ملتے ہی مسکرا دیا اور چچا خوش ہو گیا۔ ہم دونوں اس سلسلے میں خاص احتیاط برت رہے تھے کہ ہمارے پاؤں کی چاپ بالکل سنائی نہ دے۔

اچانک میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ چوکیدار کی آواز کہیں قریب ہی سے سنائی دے رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہمارے بالکل نزدیک آ گیا ہو۔ چچا نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اس کے نزدیک آ گیا اور سرگوشی کرنے کے انداز میں کہا۔

"چوکیدار قریب آ گیا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ چلے چلو۔" چچا نے مجھے تسلی دی اور میرا بازو پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔

میں گھبرایا تو واقعی نہیں تھا۔ لیکن کچھ پریشان ضرور ہو گیا کہ اس طرح چوکیدار کے نزدیک آنے کے باوجود آخر چچا رک کیوں نہیں جاتا۔ جلد ہی میری گھبراہٹ دور ہو گئی جب میں نے چوکیدار کو ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ڈنڈا پکڑے اپنے نزدیک آتے دیکھا۔

اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور اس طرح بے جھجک ہماری طرف آ رہا تھا جیسے ہم چور نہیں۔ اس کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔ میں نے ڈانگ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا اور پاؤں آگے پیچھے کر کے جم کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی پر حملہ کرنے والا ہوں۔ چچا نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

اب تو میں واقعی چکرا کر رہ گیا۔

چوکیدار نے ہمارے قریب آ کر لالٹین سمیت اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر میرے چچا کو سلام کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گاؤں کی ایک ویران سی سمت کو چلنے لگا۔ اس دوران وہ "جاگتے رہو" بھی کہتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں اس کے تعاقب

میں چل رہے تھے میں سمجھ چکا تھا کہ یہ چوکیدار میرے چچا کا "اپنا آدمی" ہے۔

ہم دونوں اس کے تعاقب میں گاؤں کے ایک قدرے ویران گوشے میں جا کر رک گئے۔

"سناؤ چونی لال۔ کیا حالات ہیں؟" چچا نے اس کی طرف دیکھا۔

"سرکار سب اچھا ہے۔ سب ٹھیک......"

اس نے بڑی دھیمی آواز میں چچا کو بتانا شروع کیا کہ گھوڑی کہاں بندھی ہے اور اس کے گرد کتنے محافظ ہیں۔ میں بظاہر دونوں کی گفتگو سے لاتعلق کھڑا رہا۔ لیکن میرے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے چونی لال ڈھلتی عمر کا ایک گندمی رنگ اور دہرے بدن کا لیکن خاصا چالاک بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا انداز گفتگو بتا رہا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی قسم کا "چوکیدار" ہے۔ مجھے علم نہیں وہ میرے چچا کا واقف کیسے بنا۔ لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی کہ وہ چچا سے اپنا حصہ پہلے ہی مانگ رہا تھا۔

"چونی لال۔" چچا کی قدرے غصیلی آواز سنائی دی۔ "تم مجھے آج سے نہیں پچھلے دس سال سے جانتے ہو۔"

"مم...... میرا یہ مطلب نہیں تھا مہاراج جی!" -- چونی لال گھگھیایا۔

تھوڑی دیر تک وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر چونی لال ہاتھ باندھتے ہوئے چلا گیا۔ وہ ہماری مخالفت سمت "جاگتے رہو" کا شور مچاتا جا رہا تھا اور مجھے اس گاؤں والوں کی بے بسی پر ہنسی آ رہی تھی کہ جن کی بربادی کا سامان ان کا اپنا محافظ کر رہا تھا۔

چونی لال کی روانگی کے چند منٹ بعد ہی چچا نے مجھے "آ بچہ" کہہ کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

میں اپنے چچا کے ساتھ ہی اس حویلی کے دروازے کے پاس پہنچ گیا جہاں ہم نے

واردات کرنی تھی۔ حویلی کے مکین گہری نیند سو رہے تھے۔ دیہاتوں کی حویلیوں میں شاید ہی کوئی دروازے پر رات کو کنڈی لگاتا ہو۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اندر داخل ہوئے۔ چونی لال نے جو میرے چچا کا مخبر تھا پہلے ہی سے یہاں کے سارے حالات بتا دیئے تھے۔ ایک بڑے کمرے کے سامنے جس کا دروازہ بند تھا چچا نے مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی ڈیوٹی سمجھ گیا تھا۔ مجھے اس کمرے سے اچانک اٹھ کر باہر آنے والوں سے نمٹنا تھا اور چچا نے گھوڑی کھولنی تھی۔

میں دروازے سے ہٹ کر قدرے آڑ میں کھڑا ہو گیا اور چچا اس کمرے کے پچھلی طرف چلا گیا۔ اسے گئے قریباً تین چار منٹ ہو گئے تھے اور میں چچا کی لاکھ ہلا شیری کے باوجود دھڑکتے دل سے دونوں ہاتھوں میں اپنی ڈانگ سنبھالے باہر کھڑا تھا۔ سردی کے باوجود یہ عالم تھا کہ میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگی تھیں۔

میری چھٹی حس نے اچانک ہی کسی خطرے کی نشاندہی کی اور میرے سامنے والا دروازہ کھلنے لگا۔ یہ میرے امتحان کا وقت تھا۔ یا تو میں گھبرا کر ہمت ہار دیتا اور یہ لوگ مجھے پکڑ کر پہلے میرے بازو اور ٹانگیں مار مار کر توڑ ڈالتے۔ اس کے بعد پولیس کے حوالے کر دیتے۔ یا پھر میں چچا کی ٹریننگ کے مطابق ہمت سے کام لیتا اور حالات کو سنبھال لیتا۔

میں نے دوسرا راستہ اپنایا اور دروازہ کھول کر جیسے ہی ایک آدمی باہر نکلا اس کے سر پر میری زوردار ڈانگ کی ضرب لگی۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ یہ شخص شاید یونہی کسی ضرورت کے تحت باہر آیا تھا۔ ابھی تک انہیں یہ شک نہیں ہوا تھا کہ ان کے ہاں چور گھس آئے ہیں۔ اس نے گرتے گرتے دروازہ تھام کر سہارا لینا چاہا لیکن میری ضرب بڑی بھرپور اور زوردار تھی۔ وہ دروازے سے ٹکرا کر گرا تھا۔ دھڑام کی زوردار آواز پر اندر موجود

لوگ بیدار ہو گئے۔ میں اب خاصا دلیر ہو چکا تھا۔ ایک آدمی نے اندر سے زوردار آواز میں مجھے للکارا لیکن میں اُس کے سامنے آنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

میرے پیچھے آہٹ ہوئی اور مڑ کر دیکھا تو چچا گھوڑی کی لگام تھامے باہر دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ چاند کی شفاف روشنی میں اس نے ایک آدمی کو کمرے کے دروازے کے نزدیک گرا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اور مجھے چوکس دیکھ کر حالات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اندر موجود لوگوں نے پہلے اٹھ کر لالٹین جلائی تھی اور ہمارے پاس یہاں سے نکلنے کے لئے اتنا ہی وقت تھا۔ چچا نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھوڑی پر بیٹھ چکا تھا میں بھی چھلانگ لگا کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

دروازے سے گزرتے ہوئے میں نے گردن موڑ کر دیکھا دو سکھ لاٹھیاں اٹھائے برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی کی زوردار آواز سنائی دی۔

"گھوڑی نکل گئی۔"

اس کے ساتھ ہی ہم بھی نکل گئے۔ لیکن میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ ہمارے پیچھے وہاں کیا طوفان بدتمیزی برپا ہو گا۔

گھوڑی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ میں گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر اپنے چچا کی کمر تھامے بیٹھا تھا۔ میرا چچا تو مانا ہوا "سوار" تھا۔ لیکن اس طرح میرے لئے سواری ممکن نہیں تھی۔ ہم نے گاؤں سے نکلنے کے لئے غلط راستہ افراتفری میں منتخب کر لیا۔ چچا کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہمارے پیچھے شور بلند ہو رہا تھا۔ اور اب سارا گاؤں کسی بھی لمحے بیدار ہو سکتا تھا۔

"بچہ! تو گھبرانا نہیں۔ ابھی "وار" میرے پیچھے آئی گی۔ یہ ابھی کم عمر کی گھوڑی ہے۔ شاید دو سواروں کے ساتھ "وار" سے نکل نہ سکے۔ میں تجھے چونی لال کے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ کل رات وہ تجھے یہاں سے نکال کر میرے پاس پہنچا دے گا۔"۔ چچا

نے گردن موڑ کر مجھے کہا اور میرے ردعمل سے آگاہ ہوئے بغیر ہی گھوڑی کو ایک دوسرے راستے پر موڑ دیا۔

میں کیا جواب دیتا۔ گاؤں میں شور برپا ہو رہا تھا۔ یہ تو میں بھی سمجھتا تھا کہ چند منٹ کے بعد ہی سکھوں کے ملازم اپنے گھوڑوں۔ گھوڑیوں پر ہمارے تعاقب میں آئیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ امر بڑی زبردست سبکی کا باعث ہو گا کہ کوئی سرداروں کی گھوڑی کھول کر لے گیا۔

میرا چاچا کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھا وہ بڑا گھاگ چور تھا اور ہر کام پلاننگ سے کرتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کہاں چوری کرنے جا رہا ہے۔ کسی بھی ناگہانی آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے تمام ہنگامی بندوبست کر رکھے تھے۔ گاؤں کی ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہوئے اس نے پورے زور سے گھوڑی کی لگامیں کھینچیں اور گھوڑی اچانک پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔

میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ الٹ کر نیچے جا گرا۔ چاچا نے گھوڑی کو سنبھال کر سیدھا کھڑا کیا۔ میرے زمین پر گرتے ہی جو شخص مجھے اٹھانے کے لئے لپکا وہ چونی لال تھا۔!!

یہ شیطان شاید منصوبے کے مطابق یہیں ہمارا منتظر تھا۔ چاچا نے اسے بمشکل ایک دو فقرے میرے متعلق کہے اور صورت حال سمجھا دی۔

"بے فکر ہو جا چوہدری۔ میرے جیتے جی کوئی بچے کی طرف میلی نظر سے بھی نہیں دیکھ سکے گا۔" چونی لال نے چاچا کی تسلی کرا دی۔

"رب راکھا بچہ"۔ چاچا کے منہ سے نکلا اور اس نے گھوڑی بھگا دی۔

مجھے گرتے وقت تو کچھ زیادہ احساس نہیں ہوا لیکن اٹھ کر کھڑا ہوا تو یوں لگا جیسے میری ٹانگ اور بازو ٹوٹ چکے ہوں۔ اچانک ہی درد کی ٹیس اٹھی تھی۔ چونی لال کو اس

16

بات کا علم نہیں تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف گھسیٹنے لگا۔

میرے لئے اس بات کا تصور ہی بڑا ہولناک تھا کہ میرا کوئی بازو یا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ جان بچانے کا خوف اور پھر تازہ تازہ چوٹ اس وقت تو مجھے احساس نہ ہوا۔ لیکن جیسے ہی گاؤں کے ایک کونے میں الگ سے بنے مکان میں مجھے داخل کر کے چونی لال نے کنڈی لگائی تو اچانک درد کی ٹیسیں میرے بدن سے اٹھنے لگیں۔

یہ مکان جس میں ہم داخل ہوئے تھے ایک کمرے ایک رسوئی اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل تھا۔ چونی لال نے مجھے برآمدے میں ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے "کون؟" کی آواز آئی۔

"میں ہوں بٹی جلدی کر!" چونی لال نے بڑی دھیمی لیکن قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور چاند کی روشنی میں میری نظر جس شکل پر پڑی۔ اس نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ یہ مہندر تھی چونی لال کی بیٹی۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنی دادی کی وہ کہانی یاد آ گئی جو اس نے بچپن میں مجھے کئی دفعہ سنائی تھی۔ یہ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ ایک جادوگرنی خوبصورت لڑکی کا روپ دھار کر ویران راستے پر کھڑی ہو جایا کرتی تھی اس کے حسن کو جو کوئی نظر بھر کے دیکھتا پتھر کا ہو کر رہ جاتا۔

مجھے یوں لگا جیسے مہندر وہ جادوگرنی ہے اور میں اجنبی مسافر۔

چاند کی شفاف اور چمکیلی روشنی میں اس کی بڑی بڑی سیاہ رنگ کی آنکھیں جو اس کے سارے چہرے پر پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے اپنے کلیجے میں دھنستی محسوس ہوئیں۔

"مہندو! یہ نکا چوہدری ہے۔ خیال رکھنا اس کا"۔۔ اس نے اپنی بیٹی سے مختصر سی

بات کی۔

گھبراہٹ تو مہندر کے نزدیک بھی شاید نہیں پھٹکی تھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میری اچانک آمد یہاں معمول کی کوئی کارروائی تھی۔

"فکر نہ کر چاچا۔۔تو نکل جا۔۔" اس نے واپس مڑتے اپنے باپ سے کہا۔

"چنگا چوہدری جی۔ گاؤں جاگ رہا ہے۔ میں ذرا ادھر کی فکر کروں۔ آپ بے فکر ہو جائیں یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

اس دوران گاؤں میں "چور"۔"چور" کا شور بلند ہونے لگا تھا۔ چونی لال تیزی سے باہر کی سمت لپکا۔ مہندر اتنی ہی پھرتی سے اس کے پیچھے دوڑی۔ اس نے باہر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ مجھے اب گاؤں کے لوگوں کی مختلف آوازوں کے ساتھ چونی لال کی زوردار آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

"وہ ادھر۔ادھر نکل گیا ہے۔ابھی اس طرف گیا ہے۔" وہ زور زور سے چلا کر کسی کو بتا رہا تھا۔ شاید اچانک ہی کوئی اس سے ٹکرا گیا تھا۔

میں اس دوران ہونقوں کی طرح مہندر کے سراپے کا جائزہ لیتا رہا جو اب میری ہی طرف واپس آ رہی تھی۔ مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مہندر مجھ پر سحر بن کر طاری ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک آ کر وہ ٹھہر گئی۔ بالکل ایسے جیسے اچانک کائنات کی گردش تھم جایا کرتی ہے۔

"چوہدری جی اندر آ جاؤ۔" اس نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔

اس طرح اچانک جھکنے سے اس کے جسمانی خطوط کچھ ایسی بے باکی سے واضح ہوئے کہ میں سہم کر رہ گیا۔ میرا دل یکدم بڑے زور سے دھڑکا اور یوں لگا جیسے ابھی سینے کا پنجر توڑ کر من پنچھی پھڑک کر باہر آن گرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گاؤں کی وہ گلی مختلف گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے لرزنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وار میرے چچا کے تعاقب میں اس کے پیچھے نکلی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چاہا کہ اٹھ جاؤں۔ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلا ہی تھا کہ اچانک میرے منہ سے "ہائے" نکل گئی۔ مہندر جو دروازے کی طرف مڑ رہی تھی۔ میری اچانک "ہائے" پر میری طرف گھوم گئی۔

"کیا ہوا چوہدری جی۔۔کیا ہوا......" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

مجھے کچھ شرم سی محسوس ہوئی کہ ایک مرد ہوتے ہوئے اس لڑکی کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔

"کچھ نہیں۔کچھ نہیں....." میں نے درد سے بے حال ہونے کے باوجود کھسیانا سا ہو کر کہا اور اپنے زور سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس طرح اچانک کھڑے ہونے سے مجھے تکلیف تو بے حد ہوئی لیکن اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ میری ہڈیاں سلامت تھیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ہڈی ٹوٹی ہوتی تو میں یوں اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکتا۔

"چلو"۔میرے منہ سے نکلا۔

لیکن۔۔مہندر بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے وہیں جم کر کھڑی رہی۔ شاید اس نے درد کی اذیت برداشت کرتے ہوئے چہرے کی قدرتی طور سے بدلتی ہوئی رنگت کو دیکھ کر میری اندرونی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بغیر کچھ کہے وہ میرے نزدیک آ گئی۔

قد میں وہ قریباً میرے برابر ہی تھی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنے کندھے پر رکھ دیا۔ اس طرح شاید مجھے سہارا دے کر اندر تک لے جانا چاہتی تھی۔

اس کے اچانک قرب کے احساس نے میرے وجود کو پگھلا کر رکھ دیا۔ میں سحر زدہ سا قریباً لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم سے خارج ہونے

والی برقی رو اب مجھے اپنی شریانوں میں دوڑتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے وجود میں انگارے تڑپ رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی بھرپور عورت کو اتنے اچانک اور اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ یہ تجربہ میرے لئے بڑا ہی جان لیوا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے مجھے اسی بستر پر سہارا دے کر بٹھا دیا جہاں شاید تھوڑی دیر پہلے وہ لیٹی ہوئی تھی چھت خاصی اونچی تھی۔ دیواروں میں بنے روشندانوں اور کھلے دروازے میں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

اندھیرے میں جلد ہی میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اس کمرے کی اندرونی دیوار میں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ لگا دکھائی دے رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس میں سے ایک اور کمرے کا راستہ بھی جاتا تھا۔ مہندر نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

دیوار میں بنے ایک طاقچے میں دھری لالٹین کو اس نے نزدیک رکھی دیا سلائی سے روشن کیا اور لالٹین کی لو اتنی گھٹا دی کہ اندر ماحول تو دکھائی دے لیکن باہر سے لاکھ کوشش کرنے پر بھی اندر کچھ نظر نہ آ سکے۔

مجھے جسم کا درد بے حال کئے دے رہا تھا۔ لالٹین جلا کر مہندر میری طرف آئی اور بڑی بے تکلفی سے میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر حیران ہی تو رہ گیا۔

"کہاں چوٹ لگی ہے" اس نے بڑی ہمدردی سے دریافت کیا۔

"کہیں نہیں۔ خیر ہے۔ خیر ہے۔" میرے منہ سے نکلا۔

"چوہدری کیا لڑکیوں کی طرح باتیں کر رہے ہو، اس میں شرمانے والی کیا بات ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے میرے بازو کو بڑے آرام سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر قدرے بلند کیا۔ پھر اسے آہستہ آہستہ کبھی نیچے اور کبھی اوپر کر کے شاید اس امر کا جائزہ لینے لگی کہ ہڈی تو کہیں ٹوٹ نہیں گئی۔ مجھے اس طرح بازو کو حرکت دینے سے تکلیف تو بہت ہوئی لیکن ضبط کئے رہا۔

مہندر نے اس کے بعد یہی عمل میری ٹانگ سے دہرایا۔ پھر اس نے خود ہی فیصلہ بھی دے دیا۔

"ہڈی پر ضرب لگی ہے اور شاید ماس بھی کہیں سے پھٹ گیا ہے۔ کوئی بات نہیں ابھی آرام آ جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

میری حالت اس سحر زدہ معمول کی سی تھی جو اپنے عامل کے اشاروں کا محتاج ہو کر رہ گیا ہو۔ میں یہ بات بالکل بھول چکا تھا کہ گاؤں والے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ بس ایک مہندر تھی جو میری تمام حسیات پر چھا گئی تھی۔

اس کی واپسی بمشکل چار پانچ منٹ بعد ہی ہو گئی۔

مہندر نے ایک ہاتھ میں دودھ کا گلاس پکڑ رکھا تھا جس میں وہ ہلدی پھٹکری اور گھی وغیرہ ملا کر لائی تھی۔ ان دنوں دیہاتوں میں یہی بہترین طریقہ علاج ہوا کرتا تھا۔

"لے پی لے چوہدری" --- اس نے گلاس مجھے تھما دیا۔

اس کی مسیحائی نے میرے زخم بڑی حد تک مندمل کر دیئے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس "نسخہ" سے زیادہ اس احساس نے کہ مہندر میرے لئے دودھ لے کر آئی ہے۔ مجھے تندرست کر دیا تھا دودھ مجھے تھما کر باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو ایک لیپ سا اس نے مٹی کے کٹورے میں بنا کر رکھا ہوا تھا۔

اس نے میرے "نہ نہ" کرنے کے باوجود میرے بازو اور ٹانگ پر اس لیپ کی مالش کر دی۔ چند منٹ بعد ہی میرا درد اس طرح کافور ہو گیا۔ جیسا کبھی چوٹ لگی ہی نہیں تھی۔ مہندر بڑی کامیاب "مسیحا" تھی۔

یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے مالش کے خاتمے پر مجھے لیٹ جانے کو کہا اور ایک رضائی مجھ پر ڈال دی۔

"چوہدری! اپنے جسم کو ہوا نہ لگنے دینا۔" اس نے مجھے کہا اور خود باہر چلی گئی۔ شاید وہ ہاتھ دھونے گئی تھی۔

واپس آکر اس نے دوبارہ اندر سے کنڈی لگالی اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا اب تک اس کا سلوک میرے ساتھ بالکل ایسا تھا جیسے میں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہوں۔ لیکن اس مرتبہ جب وہ اندر آئی تو اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔

"چوہدری اب آرام سے سوجا، بے فکر ہو کر، یہاں کوئی تیری گرد کو بھی نہیں چھو سکتا۔" اس نے مجھے کہا اور خود بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

آپ لوگ ذرا سوچیں میں نوجوان لڑکا تھا اور وہ چڑھتی جوانی کا شاہکار۔ یہاں بالکل تنہائی تھی اور چونی لال کی حیثیت میرے نزدیک ایک پالتو یا تنخواہ دار کتے سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے وہ یہاں نہیں آسکتا اور آج تو اس کا صبح کے وقت آنا بھی مشکل تھا، کیونکہ صبح ہوتے ہی اس گاؤں کا کھوجی گھوڑی کا کھرا اٹھا لیتا اور چوکیدار کو اس کے ساتھ کھرے کے تعاقب میں جانا تھا۔

میرے والد نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں اپنے چچا کے شر سے بچا رہوں۔ لیکن چچا نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ میں کوئی بڑا پارسا آدمی نہیں تھا ایک معمولی سا انسان تھا جو کسی بھی لمحے ٹھوکر کھا سکتا تھا۔

میرے جسم نے اس کے ہاتھوں کا لمس جذب کر لیا تھا۔ میرے بدن میں انگارے تڑپ رہے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں لہو کے بجائے آگ دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ مہندر کو مخاطب ہی کر سکوں۔ ابھی میرے بدن میں اتنی قوت تھی کہ میں اپنے شیطانی ارادے کو پایہ تکمیل پہنا سکوں۔ لیکن ایک عجیب سا تقدس ایک بے نام سی عقیدت تھی کہ جس نے مجھے اس کی سمت بڑھنے سے

روکے رکھا۔

ابھی تک مہندر نے لالٹین بجھائی نہیں تھی۔ لیکن بغیر مطلب یا ضرورت کے اس نے ایک بات بھی مجھے نہیں کہی تھی۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک کروٹیں بدلتا اور خود سے لڑتا رہا۔ خدا جانے مہندر کو میری اندرونی کشمکش کا احساس ہو گیا یا پھر وہ بھی شاید اسی المیے سے گزر رہی تھی جس کا میں شکار ہو چکا تھا۔

مجھے اس کے لحاف کی حرکت محسوس ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے چوہدری نیند نہیں آرہی کیا؟" اس نے بڑی بے باکی سے کہا، لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ خاصی ہمت صرف کرنے کے بعد ہی میری سمت یہ فقرہ اچھالا ہے۔

تب میری زبان میں بالکل لکنت نہ آئی اور بے اختیار منہ سے نکل گیا-- "ہاں! مہندر تم نے میری نیند بھگا دی ہے۔ میں اپنی چوٹ کی تکلیف محسوس نہیں کر رہا لیکن......" اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

مہندر اچانک ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف یہی قدم کسی غیر اختیاری فعل کا محتاج ہو کر میں نے اٹھایا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکا دیئے اور میری طرف ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگی۔ اس کی آنکھیں مجھے ہیروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتی اور اپنے اندر دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔

"چوہدری جی!" چند لمحے کی اذیت ناک سکوت کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ بڑے آدمی ہیں آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

خدا جانے مجھے کیا ہوا یوں جیسے کسی نے اچانک ہی مجھے چارپائی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا ہو۔ میں ہپناٹزم زدہ سا چلتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا اور اس کا بازو تھام لیا۔ مہندر نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

"مہندر!" کوئی میرے اندر سے بولنے لگا۔ "تم کیا ہو۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارے ہی لئے اس گاؤں میں آیا تھا۔"

مہندر کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا۔ پھر وہ نارمل ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ الگ کر دیا اور بولی۔ "چوہدری! اگر مرد ہونا تو پھر اس ہاتھ پکڑے کی لاج رکھنا۔ آج تک کسی کی جرأت نہیں ہوئی کہ میرا ہاتھ پکڑے معلوم نہیں میں نے تمہیں ایسا کیوں کرنے دیا ہے۔ لیکن اب ایسا ہو ہی گیا ہے تو اس کی شرم رکھنا۔ جاؤ اب لیٹ جاؤ، اس طرح اچانک گرم سرد ہونا تمہارے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

میرا جواب سنے بغیر وہ اپنی چارپائی پر میری طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئی۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اچانک گھٹن سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ میرے اندر جس طوفان نے ہلچل مچار کھی تھی وہ پر سکون ہو کر ٹھہر گیا۔

میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت ہی نہیں کی اور چپ چاپ لیٹ گیا۔ لیٹنے کے بمشکل پانچ دس منٹ بعد مجھے نیند آ گئی اور صبح تک لمبی تان کر سوتا رہا۔

گاؤں میں مجھے صبح نماز کے وقت والد صاحب اٹھا دیا کرتے تھے۔ یہ میری عادت بن چکی تھی کہ میں رات کو کتنی ہی دیر سے سوؤں صبح میں فجر کے وقت جاگ اٹھتا تھا لیکن اس روز جب مجھے مہندر نے جگایا تو روشندان سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اس نے مجھے تسلی دی کہ ایسی کوئی گھبرانے والی بات نہیں۔ میں نے اٹھ کر پہلے سے گرم کئے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ بازو میں درد کا احساس ابھی باقی تھا۔ البتہ میری ٹانگ اب بالکل درست ہو چکی تھی۔ میں نے دن کی روشنی میں جب مہندر کا چہرہ دیکھا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی رات والی کیفیت طاری ہونے لگی۔

مہندر نے میرے لئے دودھ گرم کیا اور انڈوں کے ساتھ زبردست میرے حلق

میں اتار دیا۔ خدا جانے یہ اس کی ادائے بے نیازی تھی یا وہ میری آتش شوق کو مزید بھڑکانا چاہتی تھی کہ اس نے صبح بالکل یوں ظاہر کیا جیسے رات کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ کچھ بولتی یا نہ بولتی میری یہ خواہش ضرور تھی کہ مہندر میری آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شام کے بعد بہر حال مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔

صبح ناشتے پر تھوڑی دیر کیلئے چونی لال آیا اور ہمیں صرف یہ اطلاع دے کر چلا گیا کہ کھوجی نے کھرا اٹھا لیا ہے اور میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اس نے اپنی بیٹی کو میرے متعلق دوبارہ تاکید کر دی تھی۔

ایک بات تو ظاہر تھی کہ کسی چور کو چھپانے کا مہندر کے لئے یہ پہلا تجربہ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن یہ بات میرے لئے ضرور حیران کن تھی کہ چونی لال اس پر اتنا اعتماد کیوں کرتا ہے۔ ایک مرحلہ پھر ایسا آیا کہ مجھے اپنی اس الجھن کا جواب بھی مل گیا۔

چونی لال گیا تو میں نے مہندر سے کہا۔

"مہندر! میں رات کو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے بھول نہ جانا۔"

"چوہدری" اس نے بڑے مضبوط لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ مہندر نے آج تک کسی کو وچن نہیں دیا، پرماتما جانے میرے دل پر تو نے کیسا جادو کر دیا ہے کہ میں......"

وہ خاموش ہو گئی۔

"آج اتوار ہے -- میں بدھ کی رات کو پہلے پہر تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے اسے گاؤں کے باہر ایک پرانے مندر کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔

"میں آجاؤں گی چوہدری۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں چونی لال کی بیٹی ضرور ہوں لیکن چوری کا مال نہیں کہ جس کا جی چاہے مجھے اٹھا کر لے جائے۔" اس کے لہجے کی مضبوطی اس کے کردار کی عظمت کی غماز تھی۔ میں حیران رہ گیا کہ ایسی باتیں مہندر

کو کس نے سکھائی ہیں۔

دوپہر تک ہم دونوں نے جی بھر کے باتیں کیں۔ اس کی رات والی باتوں میں پائی جانے والی پختگی ختم ہو چکی تھی اور اب وہ میرے لئے ایک معصوم لڑکی بن چکی تھی۔ اس نے احتیاطاً مجھے کمرے کے اندر موجود دوسرے کمرے میں چھپائے رکھا۔ یوں تو وہاں کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی عورت مہندر کو ملنے آجاتی۔

دوپہر تک چونی لال واپس آگیا۔

"بڑا چالاک کھوجی ہے چوہدری جی!" اس نے مجھے آتے ہی باخبر کیا۔ "اس نے کھیتوں کے بیچوں بیچ کھرا اٹھا کر اسے پکی سڑک تک پہنچا دیا ہے۔ چوہدری جٹے نے اسے اچھا خاصا چکر دیا تھا۔ تمام کھیتوں میں کھرا بکھیرا تھا اس میں گھوڑی کا، پھر وار کی گھوڑیوں کے کھرے بھی تھے۔ لیکن وہ تو بڑا استاد آدمی ہے۔ بڑے سردار کے آدمی اسے رات ہی لینے چلے گئے تھے۔ یہاں سے دس میل دور گاؤں ہے اس کا اور صبح ہونے سے پہلے لے آئے۔" پھر وہ خود ہی ہنس پڑا۔

"لیکن کیا یاد کرے گا وہ بھی میرا نام بھی چونی لال ہے۔ میں نے چوہدری جٹے کے گاؤں کی طرف ان لوگوں کا دھیان ہی نہیں جانے دیا۔"

کہنے کو تو چونی لال نے یہ کہہ دیا تھا یہ الگ بات کہ جب شام ڈھلے وہ مجھے ہمارے گاؤں کی حدود کے باہر چھوڑنے گیا تو وہاں ذیلداروں کے ڈیرے پر پنچائیت موجود تھی۔ میں اس طرف جانے کے بجائے چکر کاٹ کر گھر چلا گیا۔

گھر پہنچا تو والد بڑی بے چینی لیکن غصے سے میرے منتظر تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ان کا پارہ مزید چڑھ گیا اور انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے ایک ڈنڈا اٹھا کر مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ اگر ماں اس روز ہمارے درمیان نہ آجاتی تو ممکن ہے آج میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ ہی نہ بچتا۔ میرے والد کو چچا نے تو ہرگز یہ نہیں بتایا

ہوگا کہ وہ مجھے واردات پر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرے والد نے میرے رات باہر گزارنے سے یہ اندازہ لگایا تھا۔

والد کی مار نے ایک مرتبہ پھر میرا سویا درد جگا دیا۔ یہاں کوئی مہندر میرے لئے دودھ کا پیالہ اور مالش کی دوا تو لے کر کھڑی نہیں تھی۔ ماں کو یہ علم نہیں تھا کہ میں پہلے ہی زخمی ہوں۔ اس نے یہی سوچا ہوگا کہ باپ کی ظالمانہ مار نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ ماں نے مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ چچا کی صحبت سے دور رہوں۔ لیکن وہ بیچاری یہ جان سکی کہ اب معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ میں نادانستگی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ جہاں سے اب واپس لوٹ آنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

دوپہر کے بعد جب والد کھیتوں پر جا چکے تھے تو چچا میری خبر گیری کے لئے آگیا۔ میرے لئے اس کے دل میں جو بے پناہ محبت تھی وہ اس کی آنکھوں اور چہرے میں سمٹ آئی تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ مجھے چوٹ لگ گئی ہے، دو ڈھائی گھنٹے وہ میرے قریب بیٹھا میری تیمارداری کرتا رہا۔

چچا کی زبانی مجھے علم ہوا کہ اس گاؤں کے کھوجی نے کھرا پکی سڑک تک پہنچا دیا تھا حالانکہ اس نے گھوڑی کو سارے گاؤں میں اس طرح گھمایا اور بھگایا تھا کہ اس کے تعاقب میں آنے والوں کے ساتھ ہی اس کی گھوڑی کا کھر بھی گم ہو جائے۔ لیکن کھوجی بڑا ہوشیار ہے۔ یہ تو خدا کا شکر ہوا کہ چونی لال نے کوئی لالچ نہیں دیا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چونی لال ہی کو پھنسا دیتا۔

بہرحال قصہ مختصر اس پکی سڑک کے بعد ان لوگوں کا خیال صرف ہمارے ہی گاؤں تک جا سکتا تھا۔ اب انہوں نے یہاں پنچایت بھیجی تھی۔

اس دور میں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا پولیس بھی براہ راست کسی ملزم کی ماں بہن کو تنگ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سکھ بھی ہمارے علاقے کے ذیلداروں کے پاس آئے

تھے۔ انہیں امید تھی کہ سکھ ہونے کے ناطے ہمارے گاؤں کے سکھوں سے انہیں
کوئی مدد مل جائے گی۔ لیکن ہمارے گاؤں کے سکھوں نے انہیں بتادیا کہ وہ ان کے کہنے
پر یقین نہیں کریں گے۔

انہوں نے اس گاؤں کے مشتبہ آدمیوں کو اپنے طور پر بلا کر ان سے درخواست کی
تھی کہ وہ گھوڑی واپس موڑ دیں۔ میرے چچا نے اقرار کر لیا تھا کہ گھوڑی اس نے نکالی
ہے لیکن یہ کہہ دیا تھا کہ وہ "بانہیں" نہیں موڑے گا۔

کچھ بھی ہو اب معاملہ گاؤں کی عزت کا تھا ہمارے گاؤں کے سرداروں نے پہلے تو
چچا کی منت سماجت کی پھر اسے کہا کہ کر دے۔

چوری اور سینہ زوری (یعنی ڈاکہ) میں دھوکہ دہی کی واردات کے اجزاء شامل کر
لئے جائیں تو اغوا کی واردات جنم لیتی ہے۔ یہ ایک فری اسٹائل جرم ہے جس میں کوئی
شخص کسی بھی زندہ یا مردہ چیز کو اپنے باپ کا مال سمجھ کر اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ہوائی جہاز
اس معاملے میں بڑا بد قسمت ٹھہرا۔ اب تک بے شمار ہوائی جہاز اغوا ہو چکے ہیں ہو رہے
ہیں اور شاید ہوتے بھی رہیں گے کیوں جہاں اغوا کو روکنے والی تنظیمیں پوری ریسرچ کر
رہی ہیں وہاں جہاز کو اغوا کرنے والے بھی نت نئے طریقوں سے وارداتوں کو کامیاب
بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جہاز کا اغوا مطالبات منوانے کا ایک کامیاب ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ ذریعہ مزید فائدہ
مند ثابت ہوا تو شاید دنیا کا ہر شخص ہائی جیکر بن جائے۔ معمولی معمولی بات کو منوانے
کے لئے لوگ جہاز کا اغوا کرنا شروع کر دیں گے۔ بیوی روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہے تو شوہر
کسی ہوائی جہاز کو اغوا کر کے مسافروں کے بدلے اپنی سسرال سے بیوی کی رہائی
کا مطالبہ کرے گا۔ شوہر اگر دوسری شادی رچا رہا ہے تو بیوی کسی جہاز کا اغواز کر کے اس
شادی کو روکنے کا مطالبہ کرے گی، شوہر اپنی دوسری بیوی کے حسین جلوؤں میں گم

پلاسٹک کے پھولوں کا سہرا باندھے نکاح نامے پر انگوٹھا لگانے کی تیاری کر رہا ہو گا کہ
اچانک حکومت کی طرف سے نہایت فلمی قسم کے احکامات صادر ہوں گے۔

"ٹھہرو، یہ شادی نہیں ہو سکتی؟ کیونکہ اس شادی سے چار سو بیس مسافروں کی
جان اور کروڑوں روپے کا جہاز خطرے میں ہے۔"

شادی کی رسومات اچانک رک جانے سے عین ممکن ہے کہ دولہا کی سانس بھی رک
جائے مگر ایسی شادی کو روکنا لازم ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ہوائی جہاز کی اس پرواز
میں -دو وزیر- دو سفیر- دو مشیر اور دو فقیر سفر کر رہے ہوں۔ وزیر سفیر اور مشیر تو خیر
بدلتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن پہنچے ہوئے فقیروں کو منزل پر پہنچانا نہایت ضروری ہے۔

اگر ہائی جیکنگ اسی تیز رفتاری سے ہوتی رہی تو وہ وقت بھی بہت جلد آئے گا۔
جب ایک ہی پرواز پر متعدد ہائی جیکر سوار ہو جائیں گے۔ ایک ہائی جیکر کپتان کو ہینڈز
اپ کرائے گا تو دوسرا پیچھے سے آ کر پہلے ہائی جیکر کی گردن پر اسٹین گن رکھ دے گا۔
تیسرا دور کھڑا ہو کر اعلان کرے گا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی خربوزہ نہیں بلکہ اصلی
گرنیڈ ہے۔ ایک ہائی جیکر جہاز کو مشرق کی طرف لے جانے کا اعلان کرے گا تو دوسرا
مغرب کی طرف رخ موڑنے کا حکم دے گا اور تیسرا ہائی جیکر اٹھ کر مجبوراً اعلان کرے
گا۔ "خواتین و حضرات توجہ فرمائیے۔ مسافروں سے التماس ہے کہ وہ تمام مسافر جو اس
پرواز کو اغوا کرنے کی نیت سے سوار ہوئے ہیں۔ فوراً کاک پٹ میں پہنچ جائیں تاکہ
باہمی مذاکرات کے بعد جہاز کے رخ کا تعین کیا جا سکے۔"

ہوائی جہازوں کا اغواء روکنے کے لئے ہزاروں جتن کئے جا چکے ہیں مگر ہوائی جہاز
ہیں کہ اغوا ہونے سے باز ہی نہیں آتے۔ مسافروں کی مکمل جانچ پڑتال کے بعد بھی بم
اور گرنیڈ جہاز کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو جہازوں کا اغوا روکنے کے لئے صرف یہی
ترکیب رہ گئی ہے کہ تمام مسافراں ایک نیکر اور بنیان یا پیراکی کا لباس پہن کر جہاز میں

داخل ہوں اور ہر مسافر کو اپنے اپنے علاقے کے تھانیدار سے یہ سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا لازمی قرار دیا جائے کہ یہ شخص یا اس شخص کے خاندان کے کسی فرد نے پہلے کسی ہوائی جہاز کے اغوا کی واردات میں شرکت نہیں کی ہے۔ نیز یہ شخص نہ تو اپنی زندگی سے بیزار ہے اور نہ ہی دل میں کوئی ایسی آرزو رکھتا ہے جو جہاز کے اغوا کے بغیر پوری نہ ہو سکے۔ یہ شخص ایسا رزق بھی نہیں کھاتا جو کسی پرواز میں کوتاہی پیدا کرنے کے بعد حاصل ہو۔

یقین کامل ہے کہ اگر سرٹیفکیٹ اصلی ہوا اور بغیر رشوت کے حاصل کیا گیا تو جہازوں کے اغوا کے امکانات صفر فی صد رہ جائیں گے اور ہائی جیکر یہ کاروبار چھوڑ کر سڑکوں کے کنارے جوتے پالش کرنے کا دھندا اپنانے پر مجبور ہوں گے۔

وہ ان سے پیسے لے کر گھوڑی واپس موڑ دے لیکن چچا نے انہیں بتایا کہ گھوڑی اب اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ ہمارے گاؤں کے سردار یہ سمجھتے تھے کہ چچا سچ بول رہا ہے۔

انہوں نے دوسرے گاؤں سے آنے والوں سے کہا کہ وہ ان کا نقصان پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن یہ لوگ بضد تھے کہ وہ پیسے نہیں لیں گے اور یا نہیں واپس لیں گے۔ انہوں نے جب پنچایت ہی میں میرے چچا کو دھمکیاں دیں تو ہمارے گاؤں کا سردار بوٹا سنگھ جو سکھوں میں بڑا معزز سمجھا جاتا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسرے گاؤں سے آنے والے ذیلداروں کے سربراہ اشیر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا۔۔"اشیر سیہاں! میرے سامنے تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم میرے گاؤں کے کسی آدمی کو دھمکی دے رہے ہو۔ چپ چاپ واپس لوٹ جاؤ۔ اب ہم نقصان بھی پورا نہیں کریں گے اور "یا نہیں بھی نہیں موڑیں گے۔"

ذیلدار اشیر سنگھ بڑا زمانہ شناس آدمی تھا۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی اور محسوس

کر سکتا تھا کہ اگر اس نے اب مزید کوئی غلط بات کہہ دی تو یہ لوگ اس کی ٹھکائی بھی کریں گے۔

اس نے سردار بوٹا سنگھ سے کہا۔"بوٹا سیہاں! میں تو سکھ بھائی سمجھ کر تمہارے پاس چلا آیا تھا۔ اگر تم نے بھی ان لوگوں کا ساتھ دینا ہے تو...... خیر میں دیکھ لوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ہمراہ آنے والے بھی اس کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ بات اب گاؤں کی عزت پر آ گئی تھی۔ بوٹا سنگھ نے میرے چچا سے کہہ دیا کہ اب مردانگی اس میں ہے کہ وہ گھوڑی واپس نہ موڑے۔

بوٹا سنگھ چچا کو یہ بات نہ بھی کہتا تو بھی گھوڑی کبھی واپس نہ جاتی۔ اپنے چچا کو جانتا تھا آج تک اس سے کوئی مائی کا لال کسی بھی قسم کی برآمدگی نہیں کر سکا تھا۔ اب تو خیر بات ہی اور تھی۔

چچا میری تیمارداری کو آیا تھا۔ کافی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میرے علاوہ تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن تو بیاہی ہوئی تھی اور یہاں سے دور ایک اور گاؤں میں رہ رہی تھی۔ دو بڑے بھائی والد کے ساتھ کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹاتے تھے اور ایک مجھ سے چھوٹا تھا۔ والد صاحب کو ساری زندگی یہی دکھ رہا کہ وہ اپنی تمام اولاد کو اس ماحول سے محفوظ رکھنے کے باوجود مجھے نہ بچا سکے۔

رات کو وہ آئے تو مجھے پھر سمجھانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ شیطان جب انسان پر غلبہ پالے تو پھر ایسی نصیحتیں کسی کام نہیں آیا کرتیں۔ الا یہ کہ کوئی ٹھوکر ہی آدمی کو سنبھالا دے سکے۔

میں نے مہندر سے اتوار کے روز ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہفتے کے دن تک میری تمام توانائیاں واپس آ چکی تھیں اور میں خود کو پھر سے تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس دوران مجھے یہی امید تھی کہ پولیس کسی بھی لمحے آئے گی اور چچا کو گرفتار کر کے لے

جائے گی۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ پولیس آتی اور چچا کو لے جاتی تھی۔ اس کے ریمانڈ لئے۔ لیکن آج تک مال برآمد نہ ہونے کی وجہ سے میرا چچا ہمیشہ حوالاتی ہی رہا۔ اسے کبھی سزائے قید نہیں سنائی گئی تھی۔

اشیر سنگھ نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اردگرد کے سو پچاس دیہاتوں میں اس کا بڑا نام ہے اور اگر پولیس جٹے سے گھوڑی برآمد نہ کروا سکی تو اس نام کو بٹہ لگے گا۔ اس نے یہ معاملہ خود ہی نمٹانے کی ٹھان لی تھی۔

اس دوران چچا نے مجھے پھر سے اگلی واردات کے لئے تیار کر لیا تھا۔ پہلی واردات پر میرا طرز عمل اسے بڑا پسند آیا تھا اور مکمل اور بہادر چور کو بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے چچا سے زمانے بھر کی باتیں کیں لیکن اشارتاً بھی مہندر کا ذکر نہ کیا۔

چچا نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ گھوڑی اس نے کہا پہنچادی ہے۔ شاید اسے یہ ڈر رہا ہو گا کہ اگر پولیس مجھے بھی پکڑ کر لے گئی یا میرا ریمانڈ لے لیا گیا تو میں تشدد برداشت نہیں کر سکوں گا اور پولیس کو بتا دوں گا۔ یہ بات تو پنچایت ہی میں اشیر سنگھ نے بتا دی تھی کہ جٹا اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ لیکن ہمارے دیہاتوں میں بدمعاشی کے مروجہ اصولوں کے مطابق نہ تو بوٹا سنگھ نے دریافت کیا کہ وہ "کوئی اور" کون تھا؟ نہ ہی چچا نے بتایا۔

اتوار کا دن میں نے مہندر کو ملاقات کے لئے یونہی نہیں کہہ دیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں "سائیں سونا" کا عرس ہفتے کے روز شروع ہو رہا تھا اور میرے پاس اس عرس میں شمولیت کی آڑ میں یہاں سے غائب ہونے کا موقع موجود تھا۔

میں اتوار کی شام ہی کو میلے میں شمولیت کے لئے گھر سے نکل گیا۔ میلہ خاصا بھرا ہوا تھا۔ گردا گرد دیہاتوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں آئے ہوئے تھے۔ تھیٹر وغیرہ لگے تھے۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل گیا۔ میں اندازے کے مطابق وقت

مقررہ سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ لیکن خوشی سے میرا رواں رواں ناچنے لگا۔ جب میں نے مندر کے ایک کونے میں کھڑی مہندر کو دیکھا۔ شاید اس نے چھپ کر مجھے اس طرف آتے دیکھا تھا اور پہچاننے پر سامنے آ گئی تھی۔ ہم دونوں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ میری اور میں اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ میں ابھی تک اس سے کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا تھا۔

رات قدرے اندھیری تھی لیکن مہندر کا وجود اپنی مکمل تپش کے ساتھ روشنی بن کر میری رگوں میں اترنے لگی تھی جو اس روز رات کے وقت ہوئی تھی۔ اس لمحے میرے اندر نجانے کیسے ایک شیطانی خیال پیدا ہونے لگا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بے اختیار مہندر کی طرف بڑھے۔ لیکن وہ بڑے اطمینان سے ایک طرف ہٹ گئی۔

"چوہدری! شاید تم نے اس رات کا وعدہ بھلا دیا ہے۔" اس نے کہا اور میں لرز کر رہ گیا۔ میرے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کی طرح جھک گئے۔

"نہیں مہندر!" میں نے بڑی مضبوطی سے کہا۔ میں مرد ہوں جو قول دیا پورا کروں گا۔ مجھے معاف کر دینا۔ بھٹکنے لگا تھا۔ تم نے مجھے سنبھال لیا۔

"چوہدری! میرا واسطہ زندگی میں بڑے بڑے جبروؤں سے پڑا ہے۔ بھگوان جانے میں کیوں تیری طرف کھنچتی چلی جا رہی ہوں۔ لیکن خدارا میرے اعتماد کو کبھی دھوکہ نہ دینا۔" ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "دیکھو چوہدری! میں تیرے لئے اپنا دھرم بدل لوں گی۔ لیکن یاد رکھ جب تک میرے ساتھ پھیرے نہیں لگوائے گا میرا جسم تجھ پر حرام ہے۔"

"بس مہندر! خدا کے لئے اب اور کچھ نہ کہنا۔" میں نے اسے کہا۔

ہم دونوں کوئی بہت پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے جذبات بخوبی جان اور سمجھ سکتے تھے۔ مہندر نے میری پشیمانی کو محسوس کر لیا تھا۔ جو ایک پچھتاوا سا

مجھے اس بے اختیار حرکت کے سبب لاحق تھا۔اس نے مجھے اس کی اذیت سے نجات دلانے کے لئے میرا دھیان دوسری طرف لگادیا۔

مہندر مجھ سے اپنے اور میرے گاؤں کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے اسے ساری کہانی سنادی۔اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ مہندر نے مجھے بتایا کہ اس دوران اس کا باپ چونی لال میرے چچا سے مل کر اسے آگاہ کر چکا ہے کہ اشیر سنگھ اس کے خلاف کیا منصوبے بنا رہا ہے۔

چچا نے ان تمام واقعات کی مجھے خبر نہیں ہونے دی تھی نہ ہی اس نے چونی لال کی ملاقات مجھ سے کروائی تھی، یہ تمام باتیں ہم اس لئے کر رہے تھے کہ مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا ورنہ مجھے قطعات ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔

میں تو چاہتا تھا کہ ہم دونوں صرف اپنے متعلق باتیں کریں۔اپنے متعلق سوچیں اور بس۔

قریباً آدھی رات ہماری باتوں کی نذر ہو گئی۔

تب مہندر نے مجھے وقت کا احساس دلایا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ بھی طوعاً کرہاً مجھ سے الگ ہو گی ورنہ تو اس کا جی نہیں چاہتا تھا ہمارے اختیار میں ہوتا تو دونوں اسی طرح بیٹھے بیٹھے ساری زندگی باتیں کرتے رہتے۔

"چاچا عموماً اس وقت گھر کا ایک چکر لگایا کرتا ہے۔"اس نے مجھے کہا--"اور مجھے نہ دیکھ کر وہ پریشان ہو جائے گا۔"

خود مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ چچا جو میرے ساتھ ہی میلے میں آیا تھا مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب دوبارہ ملاقات کی کیا صورت ہو گی۔اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے انگلی مروڑتے ہوئے بولی۔

"جب مجھے یاد کرو گے۔جہاں بلاؤ گے آجاؤں گی۔"

میں میلے سے اس کے لئے مٹھائی لے کر آیا تھا۔ لیکن وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ جاتے ہوئے مہندر وہ مٹھائی ساتھ لے گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے مٹھائی بڑی چھپا کر رکھنی پڑے گی مجھے پریشانی اس بات کی تھی کہ اب میرا چچا تو اس گاؤں میں آنے سے رہا کہ میں اس کے ساتھ یہاں آکر مہندر سے مل لیا کروں گا۔ نہ ہی میرے پاس کوئی ایسا پیغامبر تھا کہ جس کے ذریعے اسے کوئی اطلاع کر سکتا۔ بہر کیف یہ مسئلہ مہندر کا نہیں میرا تھا۔

میں نے پچھلے دو دنوں میں میلے میں آکر لوگ داستانیں گانے والوں سے ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں سن لی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ سچے عاشقوں کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ پھر میری مردانہ غیرت نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا کہ اگر مہندر ایک لڑکی ہو کر میرے ایک اشارے پر ہر جگہ آنے کے لئے تیار ہے تو میں اس پر اپنی کمزوری کیوں ظاہر کروں۔

"مہندر! میں خود تم سے ملنے آؤں گا۔"اس لمحے مجھے اپنی آواز بالکل اجنبی اور بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔"دنیا کی کوئی طاقت مجھے اور تمہیں ملنے سے روک نہیں سکے گی۔"

اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود میں اسے گاؤں تک چھوڑنے گیا۔ گاؤں کے باہر کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک ہم رک گئے۔ تمام راستے ہم دونوں بالکل خاموش رہے تھے۔ مہندر نے میری طرف دیکھا شاید کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں الگ ہو جانا چاہئے۔ لیکن بیچاری کی زبان نہ کھل سکی۔

میں نے ہی ہمت کی--"اچھا مہندر......اللہ بیلی۔"

میرے منہ سے نکلا تو وہ اچانک میری طرف گھومی اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے اس کی حرکت نے ششدر رہی تو کر دیا۔ محسوس کر سکتا تھا کہ مہندر کے دل پر کیا گار

رہی ہے۔ بڑی آہستگی سے میں نے اسے خود سے الگ کیا۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں تیرتی نمی نے مجھے تڑپا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔

"چوہدری! مجھے بھول نہ جانا۔" کہہ کر وہ میری طرف دیکھے بغیر واپس مڑی اور تیزی سے گاؤں کی سمت چلی گئی۔

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ میں حد نظر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر بوجھل قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

میلہ اپنے جوبن پر تھا۔

میں سر جھکائے گھر پہنچا۔ گھر میں سب لوگ سو رہے تھے۔ والدہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ میں میلے سے واپس آیا ہوں۔ چپ چاپ اپنی چارپائی پر لیٹ کر میں مہندر کے خیالوں میں کھو گیا۔ نجانے کب مجھے نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو باہر دھوپ صحن میں اتر آئی تھی۔ چچا تھوڑی دیر کے بعد ہی آ گیا۔ "کہاں غائب ہو گئے تھے اس نے آتے ہی سوال کیا۔

میں نے بہانہ بنا دیا کہ ایک تھیٹر دیکھنے چلا گیا تھا اور وہاں سے واپس آ کر سو گیا۔

"کمال ہے"۔ چچا نے کہا۔ "یہی تھیٹر تو میں نے بھی دیکھا تھا تم کہاں تھے۔"

میں نے پھر ایک بہانہ کر دیا۔ والد صاحب اور بھائی کھیتوں پر جا چکے تھے۔ چچا نے موقعہ غنیمت جانا اور مجھے اگلی واردات کے لئے تیار کرنے لگا، اس مرتبہ چچا نے مجھے جو واردات بتائی وہ مجھے کسی اور ہی شک میں ڈال گئی۔ ہم نے نزدیکی قصبے میں سرکاری خزانہ لوٹنا تھا۔ اس کے لئے کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔

ان دنوں پنجاب میں فرنگی کے خلاف زیر زمین تحریکیں بھی سرگرم عمل تھیں۔ انگریز افسران کے قتل اور کبھی کبھی سرکاری خزانے لٹنے کے واقعات سننے کو ملتے رہتے تھے۔ جس طرح کی واردات چچا مجھے بتا رہا تھا۔ وہ مجھے اسی سلسلے کی ایک کڑی محسوس

ہوئی لیکن میں نے اشارتاً بھی اس کا ذکر چچا سے نہ کیا۔ البتہ میرا تجسس ان لوگوں کو دیکھنے کے لئے خاصا بڑھ گیا جو اس واردات میں ہمارے ساتھی بننے والے تھے۔

"بچہ! یہ بھیڑ بکریاں تو معمولی چوڑ بھی کھول لیتے ہیں۔ جوان آدمی بڑا ہاتھ مارتے ہیں۔ لمبا ہاتھ۔ تو تگڑا ہو جا۔" اس نے مجھے ہلا شیری دلائی اور میں تگڑا ہو گیا۔

پانچویں روز رات گئے جب میں اور چچا اپنے ڈیرے پر سو رہے تھے تین اجنبی ہم سے ملنے آ گئے۔ ایک میری عمر کا سکھ تھا اور باقی دونوں نے اپنے نام مسلمانوں والے بتائے۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا وہ کون تھے۔ چچا نے ان سے میرا تعارف کروایا اور انہیں میری پچھلی واردات بھی سنائی۔ یہ لوگ گھوڑیوں پر بیٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے چچا کو کچھ سمجھایا اور ہم نے اگلی شام کو آپس میں ملاقات کے لئے ایک جگہ طے کر لی۔

روانگی سے پہلے وہ ہمیں دو ریوالور اور خاصی گولیاں دے گئے۔ ہم دونوں چچا بھتیجا انہیں چھوڑنے کے لئے گاؤں سے باہر تک گئے تھے۔

"بچہ! اس کھلونے کا استعمال بھی سیکھ لے۔ ہر جگہ ڈانگ ہی کام نہیں آتی۔ یہ طمنچہ بھی کبھی کبھی بہت ضروری ہو جاتا ہے۔" واپسی پر جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو چچا نے مجھے بتایا۔

شام ڈھلنے سے پہلے پہلے اس "کھلونے" سے اچھی طرح کھیل چکا تھا۔ مجھے ریوالور ہاتھ میں پکڑ کر یوں محسوس ہونے لگا جیسے سکندر اعظم میرا ہی نام ہے اور یہ ساری دنیا کسی بھی لمحے میرے قدموں تلے آ کر روندی جائے گی۔

شام ڈھلے ہم دونوں چچا بھتیجا گھوڑیوں پر سوار اسی سمت اڑے چلے جا رہے تھے جدھر ہمارے دوست ہمارے منتظر تھے۔ ریوالور اور گولیاں ہم نے کپڑوں کے نیچے چھپا رکھی تھیں ان دنوں زیادہ تر لوگ گھوڑیوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اس لئے کسی نے ہم پر شک بھی نہ کیا۔

مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہم نے راتوں رات کم از کم چالیس میل کا سفر تو ضرور طے کیا ہوگا۔ ہم صبح ہونے تک جس قصبے میں پہنچے وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ قصبے کے باہر ہی ان تینوں میں سے ایک ہمارا منتظر تھا۔

وہ ہمیں قصبے کے باہر کھیتوں کے وسیع سلسلے میں بنی ایک حویلی میں لے آیا۔ میں نے اتنا لمبا سفر گھوڑی پر پہلی مرتبہ طے کیا تھا۔ اس لمبے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ یہاں ہمارے لئے آرام دہ بستروں کا بندوبست موجود تھا۔ میں تو بستر پر گر کر ہی بے سدھ ہو کر لیٹ گیا اور دنیا جہان کی کوئی خبر مجھے نہ رہی۔

صبح جب ایک شخص نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تو دھوپ نکل آئی تھی۔ چچا کسی "کام" سے گیا ہوا تھا۔ مجھے بڑی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ نہا کر جب میں دوبارہ وہاں پہنچا تو میرے لئے بھارتی ناشتہ تیار تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور جب فراغت ہوئی تو چچا بھی "کام" سے لوٹ آیا۔

اس کی آمد ایک اور اجنبی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے وہاں آتے ہی سب اکٹھے ہو گئے میرا چچا اور وہ اجنبی اس گاڑی کا پروگرام معلوم کرنے گئے تھے اور چچا کو وہ بطور خاص "موقعہ دکھانے" لے گئے تھے۔ ان کی گفتگو سے مجھے اس بات کا تو پکا یقین ہو گیا کہ یہ لوگ کسی باقاعدہ گروہ کے ارکان ہیں اور میرے چچا کو اس گروہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

"بچہ! تگڑا ہو جا، آج سہ پہر کو جانا ہے۔" اس نے اپنے معمول کے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے چچا! میں تیار ہوں۔" میں نے کہا۔

دوپہر کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ کھانے کے اختتام پر چچا نے وہاں موجود تین اور آدمیوں کو اور مجھے سمجھایا کہ ہم نے کیا کیا کرنا ہے اور اچانک اگر کوئی مصیبت

آجائے تو کس نے کدھر جانا ہے۔ اس کے بعد ہم سب لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ ہماری منزل اس قصبے سے قریباً ڈھائی میل دور ایک سڑک کا موڑ تھی۔

مقررہ وقت سے قریباً دس پندرہ منٹ پہلے ہی ہم وہاں پہنچے تھے۔ سڑک کے دو رویہ گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن میں چھپے ہم اس سرکاری کار کے منتظر تھے جس میں خزانہ آرہا تھا۔

جس جگہ ہم لوگوں نے ناکہ بندی کی تھی اس کے ساتھ ہی جو موڑ گھومتا تھا اس پر میرے چچا کے ساتھیوں نے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اسے بند کر دیا تھا۔ شاید انہیں یقین تھا کہ اس سڑک سے اور کوئی ٹریفک نہیں گزرے گی۔

میرے لئے یہ دوسری اور انتہائی خطرناک واردات تھی۔ ہم لوگ دن دیہاڑے سرکاری خزانے پر ڈاکہ مار رہے تھے جس میں یقیناً مسلح محافظ بھی موجود ہوں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بڑا خوفزدہ تھا۔ یہاں ان لوگوں کے سامنے بزدلی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ بڑا جان لیوا اور اذیت ناک تھا۔

خدا خدا کر کے ہماری مراد بر آئی جب یہاں سے ساٹھ ستر گز دور ایک درخت پر چڑھے ہمارے ایک ساتھی نے ہوا میں زور زور سے رومال ہلا کر ہمیں اس بات کا سگنل دیا کہ کار آرہی ہے۔

"بچہ تگڑا ہو جائے۔" چچا نے جو میرے ساتھ ہی موجود تھا میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے تھپکی دی۔

ہم نے اپنے ریوالور فائرنگ کے لئے بالکل تیار کر لئے اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گئے۔ کار اب مجھے بھی نظر آنے لگی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ کار درمیانی رفتار سے آرہی تھی۔ جب وہ اچانک اس موڑ پر گھومی تو ڈرائیور نے

آگے رکاوٹ دیکھ کر اتنی تیزی سے بریک لگائے کہ سب حیران ہی رہ گئے۔

ڈرائیور سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ ہم نے کیا اور ہوا میں فائرنگ کرتے ہوئے کار کو گھیرے میں لے لیا۔ چچا نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اگلا دروازہ کھولا اور اندر موجود ایک انگریز کی طرف ریوالور تان لیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دو ہندوستانی سکھ سپاہی بیٹھے تھے۔ لیکن وہ اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ اپنی رائفلیں ہی نہیں سنبھال سکے تھے۔ ڈرائیور ایک جاٹ تھا۔

ہم نے انہیں نیچے اترنے کا حکم دیا۔ چاروں ہاتھ اوپر اٹھائے باہر نکل آئے۔ انگریز بڑا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمیں انگریزی نما اردو میں گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ ابھی اس کے منہ سے بمشکل دو تین گالیاں ہی نکلی تھیں جب میرے چچا اور ہمارے ساتھ موجود سکھ کے ریوالوروں نے قریباً ایک ساتھ شعلے اگلنے شروع کر دیئے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان لوگوں کے دل میں انگریز کے خلاف زبردست نفرت موجود ہے۔ انہوں نے چار چار فائر انگریز پر کئے اور وہ زمین پر گرتے ہی دم توڑ گیا۔ دونوں ہندوستانی سپاہی بڑے خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

ہم نے ان کی مشکیں ان کی پگڑیوں سے کس کر باندھ دیں اور انہیں جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ انگریز کی لاش گھسیٹ کر ہم نے ان کے قریب ہی جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ مجھے حیرانگی یہ ہوئی تھی کہ کسی نے ابھی تک کار کے ڈرائیور کو کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر یہ حیرانگی بھی جلد ہی دور ہو گئی جب میں نے اسے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پتھر ہٹاتے دیکھا۔

یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ہمارا ساتھی ہے!

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ اسی کار میں سوار اڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر جو واردات کے مقام سے قریباً دو ڈھائی میل دور تھی ہم نے کار کھڑی کر دی۔ ڈرائیور

نے ایک چابی سے پچھلی ڈگی کھول دی جہاں تین تھیلے نوٹوں کے بھرے ہوئے تھے۔

ایک چچا نے اور باقی تینوں ساتھیوں نے اٹھا لئے۔ ڈرائیور کو ایک طرف لے جا کر چچا نے کچھ سمجھایا وہ سر ہلاتا رہا۔ پھر کار بھگا کر لے گیا۔ وہ شاید کار کو ٹھکانے لگانے لے جا رہا تھا۔

ہم لوگ قریبی کھیتوں کے سلسلے میں گھسے اور قریباً ایک گھنٹہ بعد اس جگہ پہنچ گئے جہاں گھوڑیاں بندھی تھیں۔ چچا نے وہ تھیلا کھولا اور نوٹوں کی درجنوں گڈیاں میرے اور اپنے کپڑوں میں ٹھونس کر باقی ان لوگوں کو تھما دیں۔ وہ چاروں آپس میں کچھ صلاح مشورہ کرتے رہے۔

قریباً دس پندرہ منٹ بعد ہی ہم لوگ وہاں سے الگ الگ سمتوں کو چل دیئے۔ میں اور چچا شام ڈھلے گاؤں پہنچ گئے۔ یہ نوٹ، ہم نے ڈیرے میں پہلے سے موجود خفیہ جگہوں پر چھپا دیئے۔

سات آٹھ روز بعد ایک رات پھر سب لوگ ڈیرے پر جمع ہوئے۔ معلوم ہوا کہ پولیس نے اردگرد کے تمام بدمعاش گرفتار کر رکھے ہیں۔ لیکن ہمارے نام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ صبح تک وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے بالکل علم نہ ہو سکا کہ لٹے ہوئے خزانے کی باقی رقم کدھر گئی ہے۔

والدین مجھ پر کیا کنٹرول کرتے اب تو وہ بیچارے خود مجھے اپنی عزت کے لئے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں میری دھاک ہمارے اردگرد کے سو پچاس دیہاتوں پر بیٹھ چکی تھی۔ اس دوران میں نے درجنوں پولیس ریمانڈ کاٹے تھے۔ لیکن اپنے چچا کا صحیح جانشین ہونے کا ثبوت دیا اور کبھی پولیس کو ایک پھوٹی کوڑی بھی برآمد نہ کروائی۔

اس دوران میں نے اپنی اور مہندر کی باقاعدہ ملاقاتوں اور پیغام رسانی کا ایک ذریعہ

بھی تلاش کر لیا تھا اور وہ تھی حنیفاں!

حنیفاں کا سیدھا سا تعارف تو یہ ہے کہ وہ دائی تھی اور ہمارے دس پندرہ دیہاتوں میں قریباً ہر کوئی اسے جانتا پہچانتا تھا۔ لیکن اس کی ایک خاص قابلیت کا علم عام لوگوں کو نہیں تھا۔ صرف میری دنیا کے لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ پولیس کے لئے مخبری کا کام بھی کرتی تھی اور کبھی کبھی یہ مخبری دوطرفہ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ یوں کہ حنیفاں دونوں پارٹیوں کا وزن کرتی جس کا پلڑا بھاری ہوتا اسی طرف جھک جایا کرتی تھی۔

حنیفاں کے پاس گھروں کے اندر کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں۔ کسی کا پیغام کسی تک پہنچانا اس کا پیشہ تھا۔ بدمعاش لوگ اس سے عموماً یہ کام لیا کرتے تھے کسی بیچاری غریب لڑکی کو تاڑ لیتے اور حنیفاں کی معرفت اسے بہلا پھسلا کر اس بدمعاش تک لے آتی بعد میں جو کچھ ہوتا اس کو سب ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

ایک روز جب میں ایک واردات سے واپس آیا تو حنیفاں مجھے راستے ہی میں مل گئی۔ اس دنیا میں تھوڑا سا عرصہ گزارنے کے بعد میری جھجک ختم ہو چکی تھی اور میں ہر کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔

حنیفاں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آخر کب تک یوں رات کے اندھیرے میں مہندر کے گھر جاتا رہوں گا۔ اس دوران اشیر سنگھ کے آدمی یہ جان چکے تھے کہ میں جٹے کا نہ صرف بھتیجا ہوں بلکہ اب اس کا ایک بازو بھی بن چکا ہوں۔ ہماری آپس میں دشمنی تھی۔ اگر کسی کو یہ شک بھی ہو جاتا کہ میں مہندر سے ملتا ہوں تو وہ میری جان لئے بغیر نہ ٹلتے یہ بھی ممکن تھا کہ میرے بجائے مہندر بھی ان کا نشانہ بن جاتی تھی۔ صرف یہ علم ہونے پر وہ مہندر کے ذریعے مجھے یہاں بلا کر اپنے جال میں پھانس سکتے ہیں۔ وہ مہندر کی جان کو آجاتے اور میں جانتا تھا کہ مہندر مر جاتی لیکن کبھی ان کی بات نہ مانتی اور مجھے دھوکے سے بلانے پر رضامند نہ ہوتی۔

انکار کی صورت میں اسے جس انجام سے دوچار ہونا پڑتا اس کا تصور ہی میرے لئے بڑا اندوہناک تھا۔

یہی کچھ سوچ کر میں نے حنیفاں کو آج پہلی مرتبہ مخاطب کیا۔ میں ایسی گھٹیا عورتوں کو تو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے پہلے خود حنیفاں کئی دفعہ مجھے کہہ چکی تھی کہ اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤں۔ میں اس "خدمت" کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور حنیفاں بھی یہ جانتی تھی کہ اس کے لئے مجھے اپنا احسان مند بنانا ضروری ہے۔

"مائی حنیفاں" میں نے اسے آواز دی۔

"جی سرکار" اس کی باچھیں تو اسی آواز پر کھل گئیں کہ میں نے آج پہلے اسے مخاطب کیا ہے۔

"شام کو ڈیرے پر آنا۔"

"آؤں گی مائی باپ ضرور آؤں گی۔ اکیلی آؤں یا......" اس نے بڑا بے ہودہ سا اشارہ کر کے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"اکیلی آنا۔ اور زیادہ باتیں کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

شام کو میں ڈیرے پر اکیلا ہی تھا۔ چاچا کل سے ایک مہم پر نکلا ہوا تھا۔ وہ شام ڈھلتے ہی آگئی میں نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے اسے بتا دیا کہ میرا مدعا کیا ہے۔

"واہ چوہدری جی کیا نگینہ تلاش کیا ہے۔" وہ اپنی عادت کے مطابق بات کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"حنیفاں اس بات کا خیال رہے کہ آج کے بعد کبھی میرے سامنے کوئی گندی بات مہندر کے متعلق زبان پر نہ لانا اور ہاں یہ بھی سن لو اگر یہ بات تمہارے علاوہ کسی دوسرے تک پہنچ گئی تو تم......" میں نے بات نامکمل چھوڑ دی تھی لیکن مائی حنیفاں سمجھ

چکی تھی کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔

اسے حیرانگی تو ضرور ہو رہی ہو گی کہ مجھ ایسا انسان کسی لڑکی سے پاکیزہ محبت بھی کر سکتا ہے اور لڑکی بھی اچھوت قوم کی ہندو لڑکی ہے۔

"تم نے صرف میرا پیغام کبھی کبھی لے کر جانا ہے اور بس اس کے علاوہ اس سے کبھی ملنے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ حنیفاں مائی ہم کسی کا حق نہیں مارتے تمہیں تمہاری خدمت کا انعام ضرور دوں گا لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ کبھی مہندر کو کریدنا نہیں۔"

مائی حنیفاں بڑی مکار عورت تھی۔ میرا موڈ دیکھ کر وقتی طور پر چپ ہو رہی میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑا انعام تھا۔ حنیفاں نے پہلے تو نہ نہ کی پھر نوٹ پکڑ لیا۔

میں جس زندگی میں قدم رکھ چکا تھا اس میں کسی بھی لمحے موت میرا گلہ دبوچ سکتی تھی۔ والد نے مجھ سے ایک طرح ناطہ توڑ لیا تھا اور ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر میں مہندر سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بدل رہے تھے۔ بھلے میں چور ڈاکو بن چکا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کی سیاست سے میں بھی اپنے دیہات کے دوسرے لوگوں کی طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

میرے والد صاحب اپنے گاؤں میں مسلم لیگ کے سالار تھے اور ہم نے سکھوں کی دشمنی مول لے کر بھی ایک بڑا جلسہ اس علاقے میں مسلم لیگ کا کروا دیا تھا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ میں الجھ کر رہ گیا۔ جبکہ دوسری طرف مہندر پچھلی دو تین ملاقاتوں سے کچھ بدلی بدلی دکھائی دینے لگی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس میں وہ پہلے والی دلیری نہیں رہی۔

جوں جوں اس کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بزدل بنتی جا رہی تھی۔ پہلی بار جب وہ حنیفاں کے پیغام پہنچانے پر مجھ سے ملنے آئی تو اس نے بڑی عجیب سی خواہش کا

اظہار کر دیا۔

"چوہدری مجھے آج ہی مسلمان ہونا ہے۔" میں بھونچکا رہ گیا۔

میں محسوس ہی نہ کر سکا کہ جس روز سے میری اور مہندر کی ملاقات ہوئی تھی اس نے اپنے ہمسائے میں واقع مسلمان مولوی کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ ان مولوی صاحب کا ذکر وہ اکثر مجھ سے کیا کرتی تھی۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اسلام کی حقانیت سے اتنی جلدی متاثر ہو جائے گی۔ پچھلی دو ملاقاتوں سے اس نے یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب جیسے بھی ممکن ہو میں اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔

میں حیرت سے اس کا منہ جھانکنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔ "چوہدری میں نے تمہیں نہیں بتایا میرا باپ میری شادی کہیں طے کر رہا ہے میں اسلام دھرم کو دل سے قبول کر چکی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے موت بھی آئے تو مسلمان ہو کر مروں--"

مہندر کی اس بات نے مجھے خاصا جذباتی کر دیا۔ لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی یہ خواہش کیسے پوری کروں۔ اس نے غالباً میری دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر بولی۔ "چوہدری! میں نے مولوی صاحب سے بھی کہا تھا۔ لیکن وہ ذیلداروں کے خوف سے مجھے کلمہ نہیں پڑھا سکے اب تم بھی......"

"مہندر! خدا کے لئے...... ایک لفظ بھی آگے نہ بولنا۔"- میں نے اسے کہا۔

میں اب مہندر سے ملنے کے لئے گھوڑی پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور یوں بھی اب میرے لئے ہر طرف خطرات تھے۔ میں نے مہندر کا بازو پکڑا اور اسے گھوڑی پر سوار کروا دیا۔ خود میں اس کے پیچھے بیٹھا اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ میرے ذہن میں ابھی کچھ واضح نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہمارے نزدیک گاؤں کھوکھر پور کی مسجد گاؤں کے ایک کونے پر بنی ہوئی ہے اور وہاں کے مولوی صاحب بڑے اللہ والے تھے۔ گاؤں

کے نزدیک میں گھوڑی سے اتر گیا۔ لیکن مہندر کو اوپر بٹھائے رکھا۔ میں گھوڑی کی لگام پکڑے پیدل چلتا مسجد تک آ گیا۔ سارا گاؤں گہری نیند سو رہا تھا۔ چوکیدار کا دور دور تک نام ونشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گھوڑی میں نے مسجد سے ملحق مولوی صاحب کے حجرے کے باہر کھڑی کی اور دروازے پر دستک دی۔ مولوی صاحب ابھی سوئے نہیں تھے وہ پہلے سمجھے کہ ہم مسافر ہیں اور رات کو پناہ لینے آئے ہیں۔

انہوں نے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ میرے ساتھ ہی مہندر بھی بے جھجک اندر داخل ہو گئی۔

"مولوی صاحب!" میں نے ان کے استفسار کرنے سے پہلے کہا۔ "یہ لڑکی جو میرے ساتھ آئی ہے ہندو لڑکی ہے اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنا چاہتی ہے، اسے مسلمان کر لیجئے۔" مولوی صاحب نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ "تم کون ہو؟"

میں نے انہیں اپنا تعارف کروایا۔ اب میرے چچا کے ساتھ میرا نام بھی مشہور ہونے لگا تھا۔ مولوی صاحب پہچان گئے۔

"اسلام اس نے قبول کرنا یا تم نے؟" انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"اس نے" میں نے مہندر کی طرف اشارہ کیا۔

"تم باہر نکل جاؤ۔ میں اس سے تنہائی میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے مجھے سختی سے کہا۔

"لیکن......" میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔

"اگر تم باہر نہ گئے تو میں سمجھوں گا کہ تم اس لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لائے ہو اور اب ایک کے بعد دوسرا بڑا جرم کرنے لگے ہو۔ دیکھو چوہدری! تم بدمعاش ہو گے۔

ڈاکو ہو گے لیکن میں سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ مجھے کوئی دھونس دھمکی نہ دینا۔ میں کسی کو زبردستی کلمہ پڑھا کر اپنے خدا کے سامنے ظالم اور گناہگار نہیں ٹھہرنا چاہتا۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہ کوئی آج کل کے مولوی نہیں تھے۔ بڑے دبنگ اور اللہ والے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کے سامنے گردن جھکانا تو سیکھا ہی نہیں تھا انہوں نے سچ کہا تھا واقعی وہ کسی غنڈے بدمعاش سے ڈرنے والے نہیں تھے۔

میں باہر نکل آیا، قریباً پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد بالآخر انہوں نے دروازہ مجھ پر کھولا۔ وہاں مہندر موجود نہیں تھی۔

"میں مطمئن ہوں۔ وہ میری بیوی کے پاس ہے۔ میری بیوی اسے غسل اور وضو کروا کر لائے گی۔" انہوں نے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی۔

مزید پانچ چھ منٹ گزر گئے۔ سامنے والے دروازے سے ایک بوڑھی عورت مہندر کا بازو تھامے اندر داخل ہوئی۔ یہ مولوی صاحب کی بیوی تھی۔ اس نے مہندر کو ہمارے سامنے والی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

"بیٹی! ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ تم پر جبر نہیں ہے۔ ہمارے دین میں کسی پر جبر نہیں کیا جاتا۔" مولوی صاحب نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"مولوی صاحب! میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ خدا کے لئے میرے صبر کو نہ آزمائیے۔" مہندر کی آواز میں جانے کیا سوز تھا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔

اس کے باوجود مولوی صاحب اور ان کی بیوی نے بار بار مہندر سے اقرار کروایا کہ وہ دل سے اپنی مرضی سے کسی کے جبر کے بغیر یہ فیصلہ کر رہی ہے۔ تب انہوں نے "الحمد للہ" کہا اور قرآن پاک کچھ آیات پڑھ کر ان کا ترجمہ مہندر کو سمجھایا۔ ان آیات میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید پانچ سات

منت مہندر کو اسلام کی حقانیت اور قوانین سمجھانے پر لگائے اور آخری مرتبہ پھر اس کی رضامندی طلب کرنے کے بعد اسے کلمہ پڑھوا کر مسلمان کر دیا۔

میرے علاوہ شاید مولوی صاحب بھی حیران ہی رہ گئے کہ اس نے کلمہ پہلے سے یاد کر رکھا تھا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا کلمہ بھی خود ہی پڑھ گئی۔ یہ اس کی اسلام سے محبت کی انتہا تھی۔ اس نے مولوی صاحب کو بتایا کہ اس نے عربی کا ابتدائی قاعدہ بھی پڑھ لیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس کا اسلامی نام مریم بی بی رکھا اور ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

شاید آپ لوگوں کو اس بات کا یقین نہ آئے کہ جب مہندر مریم بننے کے بعد باہر آئی تو میں نے اس کے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹتی محسوس کی تھیں۔ بخدا ایسا پرنور چہرہ میں نے زندگی میں اس کے بعد پھر کبھی نہ دیکھا۔ اس لمحے میرا دل اس کی عقیدت سے بھر چکا تھا۔ مجھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ میرے پیچھے بیٹھی۔ ہم نے تمام راستے کوئی بات نہ کی اور میں اسے اس کے گاؤں تک لے آیا۔

مریم نے گھوڑی سے اتر کر کہا۔ "چوہدری! اب میں وہ ہندو لڑکی نہیں رہی۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو خدا کے لئے تم بھی دل سے مسلمان ہو جاؤ۔ یہ زندگی چھوڑ دو اور مجھے نکاح کر کے لے جاؤ۔ بخدا میں تمہارے ساتھ بھوکی رہ کر بھی تمام زندگی تمہاری خدمت میں گزار دوں گی۔ اب میرے باپ کا گھر میرے لئے جہنم بنا رہے گا۔ وہاں بدمعاش لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں......" وہ خاموش ہو گئی۔

اس کی نظریں جھک گئیں۔ مجھے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "تم نے میرا ہاتھ ہمیشہ اپنانے کے لئے پکڑا تھا۔ اگر مرد کے بچے ہو تو یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ اگلی مرتبہ جب آؤ گے تو مجھے ہمیشہ لے

جانے کے لئے آنا۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی اور میں مبہوت سا محبت اور وفا کی اس عظیم دیوی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بخدا اس لمحے میں اپنے دل میں اس کے لئے جو جذبات محسوس کر رہا تھا آج بھی ان کا تصور میرے مردہ تن میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔

رات قریباً آدھی بیت چلی تھی۔ میں نے نور کے اس ہالے کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا جب وہ اندھیرے کی چادر میں گم ہو گئی تو میں بوجھل قدموں سے واپس لوٹا اور اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر اسے ایڑ لگا دی۔

اس روز واقعی یہ عزم کر کے لوٹا تھا کہ اگر والدین مریم سے شادی کے لئے نہ مانے تو میں اسے بیاہ کر کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ جلد یا بدیر آخر وہ میرے ماں باپ تھے مان ہی جاتے۔ مجھے علم تھا کہ چچا آج کل ایک لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں ہے اور یہ کام بھی انہی لوگوں کے اشارے پر ہم کر رہے تھے جن کا بھید میں اپنی لاکھ کوشش کے باوجود نہیں پا سکا تھا۔

یہ لوگ بالکل اچانک چچا سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ ان کی آمد میرے لئے اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ میں یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں۔ ایک دو مرتبہ میں نے چچا کو کریدنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے میرے لاکھ بضد ہونے کے باوجود مجھے ٹال دیا۔

"بچہ! ابھی تیرے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں تو ان چکروں میں نہ پڑا کر --" وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کرتا۔

اس روز جب میں مریم سے مل کر واپس ڈیرے میں پہنچا تو چچا کو اچانک اپنا منتظر پایا۔ چچا پچھلے دو دنوں سے غائب تھا اور آج اچانک واپس آ گیا تھا۔ حالانکہ اس نے ایک روز بعد واپس آنا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ یہاں ہے تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔

"بچہ! واردات تو تم کر کے آ نہیں رہے، چکر کوئی اور ہے۔ سچ سچ بتاؤ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو۔" چچا نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے مجھے سیدھا سوال پوچھ لیا۔ "دیکھو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم اپنے باپ کے ساتھ تو جھوٹ بول سکتے ہو، میرے ساتھ نہیں بولو گے۔ اس لئے تم جو بھی کہو گے میں یقین کر لوں گا۔ میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچانا۔ بعد میں اگر کبھی مجھے تمہارا جواب غلط معلوم ہوا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے مجھے کتنا دکھ ہو گا۔"

چچا مجھے اگر یہ سب کچھ نہ بھی کہتا تو بھی میں اسے سچ سچ بتا دیتا کیونکہ اس کے اور میرے تعلقات کچھ ایسے تھے کہ میں اس کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی آج میرا دل اتنا بوجھل تھا کہ میں شدت سے کسی ہمراز کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے اسے بلا کم و کاست ساری کہانی سنا دی۔ چچا کے ذہن میں تو چونی لال کی بیٹی ہی نہیں رہی تھی اور اس واقعے کو بھی اب تین سال ہو چلے تھے۔ اس نے میری کہانی پر کوئی تبصرہ نہ کیا صرف اتنا کہا کہ اب جو وعدہ تم نے مریم سے کیا ہے مرد بن کر اسے پورا کرنا۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے مجھے کہا کہ وہ کل میرا تعارف ان لوگوں سے کروائے گا جن سے ملنے کا مجھے ایک عرصے سے اشتیاق ہے۔ چچا نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ وطن کی آزادی کے لئے فرنگی کے خلاف زیر زمین جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔

تب میں جوان اور خاصا گرم جوش تھا۔ اتنی عقل نہیں تھی کہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کچھ سوچ سکتا۔ اگر ذہن میں کوئی سوال پیدا بھی ہوتا اور چچا سے پوچھ ہی لیتا تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ابھی بچہ ہے۔ یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں۔

اگلے دن چچا کے کہنے کے مطابق وہ لوگ آ گئے۔ آج دو آدمی آئے تھے۔ ان

دونوں نے میرے ساتھ خاصی بے تکلفی سے باتیں کیں اور مجھے سمجھایا کہ ان کے مقاصد بڑے عظیم ہیں وہ ملک آزاد کروانے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ ہمارا ارادہ ایک ٹرین کے ذریعے جانے والی کرنسی کو لوٹنے کا تھا۔ ہمیں علی الصباح ان لوگوں کے ساتھ اس مشن پر روانہ ہونا تھا۔

انہوں نے ایک پستول اور خاصی گولیاں مجھے رات ہی کو دے دی تھیں۔ دونوں نے مجھے نام بتائے وہ یقیناً غلط ہوں گے۔ پھر بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ وہ تھے شرما اور خان۔ یعنی ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ حالانکہ میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں مونے سکھ تھے۔

ہم چاروں ٹرین کے ذریعے دوسرے ضلع میں شام گئے پہنچ چکے تھے۔ اگلی رات کو یہ واردات ہونی تھی۔ ان لوگوں نے اس بات کا بندوبست کر لیا تھا کہ جو ٹرین ہمارا نشانہ بننے والی تھی۔ اسے راستے میں ایک مطلوبہ مقام پر سگنل ڈاؤن کر کے روکنا ہے۔ اس سگنل کا کانٹا بدلنے والا بھی ان کا اپنا آدمی تھا۔

ہم اگلے روز شام سات بجے تک دو دو کی ٹولیوں میں مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں چھ ساتھی اور موجود تھے۔ لیکن یہ سب میرے لئے اجنبی تھے۔ وہ دونوں خان اور شرما ان میں شامل نہیں تھے۔

ریلوے لائن سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ دور ایک جگہ وہ کار ہمارے ساتھیوں نے چھپا رکھی تھی۔ جس میں بیٹھ کر ہمیں ایک خاص مقام تک جانا تھا۔ اس کے بعد یہ کار بھی چھوڑ دینی تھی۔ اس زمانے میں اکا دکا لوگ ہی کار رکھ سکتے تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کار بھی چوری کی ہو گی۔

ہمیں فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق یہ چار پانچ ڈبوں پر مشتمل ٹرین تھی اور سرکاری خزانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس پر منتقل کیا جا رہا تھا۔ مجھے بتایا تو نہیں گیا تھا

لیکن اس بات کے قوی امکانات موجود تھے کہ اس ٹرین میں ان لوگوں کا کوئی آدمی بھی موجود ہو۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے ہمیں سگنل ملا کہ ٹرین وقت مقررہ پر آ رہی ہے۔ پھر ٹرین نظر آ گئی۔ میں اور چچا اکٹھے ہی بیٹھے تھے۔ چچا نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر حسب عادت مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ جواب میں میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے یقین دلایا کہ میں تیار ہوں۔

ٹرین منصوبے کے مطابق روک لی گئی۔ ہم لوگوں نے گھیرا بھی ڈال لیا۔ لیکن خلاف توقع ٹرین کے دو ڈبے فوجیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ بات ہمارے علم میں نہیں تھی کہ عین وقت پر ان لوگوں کو ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر مارنا چاہا تھا۔

یہ سب تربیت یافتہ فوجی تھے۔ ہم نے ان پر فائرنگ شروع کر دی اور چاہا کہ اس فائرنگ کی آڑ میں نکل جائیں لیکن انہوں نے ہماری کوشش ناکام بنا دی۔ وہ ہماری فائرنگ کے دوران ہی بڑی تیزی سے ہمارے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے معرکے میں ہمارے تین ساتھی مارے گئے۔ میرے چچا کے بازو میں گولی لگی تھی۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن قسمت اچھی تھی کہ گرفتار ہو گیا۔ ہمارا ایک ساتھی بچ کر نکل گیا تھا بعد میں وہ بھی پکڑا گیا۔

وہ لوگ چچا کو تو ہسپتال لے گئے اور مجھے سی آئی ڈی کے ایک تفتیشی مرکز میں لے آئے۔ اس سے پہلے میں درجنوں بار تھانوں میں آ جا چکا تھا۔ لیکن سٹاف میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ مجھے چچا نے ایک بات بتائی تھی کہ "بچہ تھانے میں کبھی "ہاں" نہ کرنا اور جیل میں کبھی "ناں" نہ کرنا۔"

میں اس دنیا کے اسرار و رموز سمجھنے لگا تھا اور جانتا تھا کہ اگر میری زبان سے یہ

بات نکل گئی کہ میرا تعلق کسی زیر زمین تحریک کے ساتھ ہے تو یہ لوگ مجھے جیتے جی مار ڈالیں گے۔ اگر زندہ بچ کر جیل پہنچ ہی گیا تو بھی اول یہ لوگ کسی انگریز کا مردہ مجھ پر ڈال کر پھانسی پر لٹکا دیں گے نہیں تو 20 سال تو پکی سزا ہے--!

تین مہینے تک وہ لوگ میرے ریمانڈ لیتے رہے۔ وہ مجھ سے یہی بات منوانا چاہتے تھے کہ میرا تعلق کسی زیر زمین تحریک کے ساتھ ہے۔ لیکن میرا ایک ہی بیان رہا کہ میں تو معمولی سا چور اچکا ہوں۔ زیادہ دولت کے لالچ میں آ گیا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ میرے ساتھ لوگ کون تھے۔

تین ماہ بعد جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں میری ملاقات تین ماہ بعد چچا سے ہوئی وہ بھی میرے جتنا ریمانڈ ہی کاٹ چکا تھا۔ اس دوران ہماری کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی حالانکہ جس سٹاف میں میں ریمانڈ کاٹ رہا تھا وہیں میرا چچا بھی موجود تھا۔

ان تین مہینوں میں اگر کسی چیز نے مجھے ستایا تھا تو وہ تھی مریم کی یاد-! جب کبھی رات کو میں زخموں سے بے حال اپنے سیل میں لیٹا نیند کی گود میں سماتا تو بے اختیار مریم میرے خوابوں میں چلی آتی۔ میں یہ سوچ کر ٹوٹ ٹوٹ جاتا کہ آخر وہ کیا سوچتی ہو گی؟ میری ایسی مسلسل غیر حاضری اور وہ بھی اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد-- وہ میرے متعلق خدانخواستہ کوئی غلط اندازہ قائم نہ کر لے۔

اس زمانے کی جیلیں سخت ہوتی تھیں اور عموماً امیر غریب کے لئے ایک سی ہی ہوتی تھیں۔ آج کی جیلوں کی طرح نہیں کہ جو غریب ملزموں کے لئے جہنم اور امیروں کے لئے "جائے آرام" بنی ہوئی ہیں۔ کیا مجال جو چڑیا بھی اندر پر مار سکے۔ ہمارے گھر والوں کو تین ماہ تک ہماری ہوا نہ لگنے دی گئی اس کے بعد وہ لوگ جیل میں ہماری ملاقات کو آ گئے۔

میرے چچا کا بیان بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔ کیس چلنے لگا۔ اس دوران میں اور

چچا ایک ہی حوالات میں بند رہے۔ جب کبھی میں اچانک کہیں کھو جاتا تو چچا میرا دکھ جان لیتا۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ دکھی ہو جاتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے اس طرح خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔

بچہ! کاش میں اس واردات پر تمہیں ساتھ نہ لے جاتا۔ مجھے کبھی کسی بات نے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا تمہارے دکھ نے کیا ہے۔

سال ڈیڑھ سال ہم تاریخیں بھگتتے رہے۔ اس دوران بمشکل دو مرتبہ چچا نے کسی ذریعے سے میرا پیغام مریم تک پہنچایا۔ اس نے جواب میں مجھے کہلا بھیجا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ اس نے کہا تھا کہ زندگی کے آخری سانس تک میرا انتظار کرے گی۔ پھر مجھے کوئی بھی ایسا پیغامبر میسر نہ آسکا جس کے ذریعے میں مریم کو اپنا پیغام بھیج سکتا۔ سرکار نے ہم پر تین چار قتل ڈال دیئے تھے اس دوران 1946ء آ گیا۔

1946ء کے قریباً تیسرے یا چوتھے مہینے ہمیں عمر قید کی سزا ملی آزادی کے دن نزدیک آنے کی وجہ سے ان دنوں قیدیوں کو کالے پانی نہیں بھیجتے تھے۔

والد صاحب نے ہمت نہ ہاری اور ہائی کورٹ میں ایک بہت بڑا وکیل کروادیا۔ پانچ مہینے تاریخیں پڑتی رہیں اور ہماری قید ہائی کورٹ نے کم کر کے صرف تین تین سال رہنے دی۔ جیل میں میری حالت ماہی بے آب جیسی تھی۔ تین چار مہینے اور گزر گئے۔

میرا چچا اس دوران چپکا نہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے فرار کے منصوبے بنائے۔ بالآخر ایک دن فرار کے لئے طے پا گیا۔ میری بدقسمتی دیکھئے کہ فرار سے ایک روز قبل جیل میں مشقت کرتے ہوئے چچا کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ دو تین گھنٹے کی اذیت ناک تکلیف کے بعد دم توڑ گیا۔

اس حادثے نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی۔ ملک آزاد ہوا تو میری باقی قید معاف ہو گئی اور رہائی بھی مل گئی۔ قافلے ہر دو اطراف آ جا

رہے تھے۔ میں دیوانہ وار رات کی تاریکی میں اپنے گاؤں جا پہنچا۔ رات کا وقت گاؤں کے باہر دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں گاؤں کے باہر پہلے ڈیرے پر پہنچا۔

یہ سکھوں کا ڈیرہ تھا--!

یہاں میری ملاقات اپنے بچپن کے دوست اقبال سنگھ سے ہو گئی۔ اقبال سنگھ پہلے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر بے اختیار مجھے گلے لگا کر رونے لگا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں تو کبھی کا اجڑ چکا اور تمام مسلمان پاکستان چلے گئے ہیں۔

اقبال سنگھ نے بتایا کہ وہ لوگ خود قافلے کو بحفاظت پاکستانی سرحد تک پہنچا کر آئے تھے جو ہمارے اس گاؤں سے چالیس پینتالیس میل دور تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ چوہدری تو گاؤں نہ جانا وہاں پاکستان کے مہاجر سکھ آئے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں ایسی جھوٹی سچی کہانیاں سنائی ہیں کہ لوگ اب مسلمانوں سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

میں نے کہا اقبال سیہاں تو میرا بچپن کا یار ہے مجھ پر ایک احسان کر دے۔ مجھے گھوڑی لا دے میں نے اس سے وعدہ کیا کہ گھوڑی اسے واپس کر کے پھر پاکستان جاؤں گا۔ اقبال سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"چوہدری تو بھی کیا یاد کرے گا کسی سکھ سے یاری تھی۔" اس نے تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر کہا "میرا انتظار کر۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اقبال سنگھ پر اعتماد تھا کہ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ وہ جعلی سکھ نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ گھوڑی کے علاوہ میرے لئے کپڑے اور روٹی بھی لے آیا۔ اس نے بضد ہو کر مجھے دو چار لقمے زہر مار کروائے اور آدھی رات کو اپنے گاؤں سے نکل آیا۔ میں نے اپنے سر پر سکھوں کی طرح پگڑی باندھ رکھی تھی۔ میری ڈاڑھی کے بال

بڑھے ہوئے تھے اور اقبال سنگھ کی کرپان میرے پاس تھی۔ کوئی بھی مجھ پر مسلمان ہونے کا شک نہیں کر سکتا تھا۔

دم رخصت اقبال سنگھ میرے گلے لگ کر رو پڑا۔ ہم دونوں پیدل ہی گاؤں کے باہر تک آئے۔ "چوہدری تجھے تیرے خدا کی قسم ہے واپس ادھر نہ آنا۔ یہ گھوڑی لے کر پاکستان چلا جا۔" اس نے آخری مرتبہ مجھ سے روہانسی آواز میں کہا۔

"اقبال سیہاں زندگی بھر تیرا یہ احسان نہیں بھولوں گا --- اللہ بیلی" --- کہہ کر میں نے گھوڑی کو ایڑی لگا دی۔

چونی لال کے گاؤں تک پہنچا تو صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

اس گاؤں کے جلے ہوئے مسلمانوں کے مکانات مجھے دور ہی سے یہاں کے حالات سمجھا رہے تھے۔ لیکن مجھے مریم کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے گھوڑی چونی لال کے گھر کے باہر روکی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں دیوار پھلاند کر اندر داخل ہو گیا پھر دروازہ کھول کر میں نے گھوڑی کو اندر کر لیا اور کنڈی لگا دی۔

اس دروازے نے مجھے کئی بھولی ہوئی کہانیاں یاد دلا دی تھیں۔

سامنے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کرپان میں نے ایک ہاتھ میں مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ ایک چارپائی پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا میں نے چادر اٹھا کر پرے پھینک دی تو وہ شخص ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں اسے بمشکل پہچان سکا وہ چونی لال تھا۔

چونی لال ہڈیوں کا ڈھیر بن چکا تھا اور شکل سے برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید مجھے نہیں پہچانا تھا اور مجھے کوئی لٹیرا ہی سمجھ رہا تھا۔

"یہاں کچھ نہیں رکھا تمہارے لئے۔" اس نے کھانستے کھانستے دیوانوں کی طرح میری طرف دیکھ کر کہا۔

"چونی لال مہندر کہاں ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

جواب میں چونی لال نے دیوانوں کی طرح قہقہہ لگایا اور بولا مر گئی۔ مر گئی۔ مر گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ پاگلوں کی طرح اونچی اونچی آواز سے انہی الفاظ کی تکرار کرتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہیں ان کی آواز سن کر کوئی یہاں آ نہ جائے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا منہ زبردستی بند کر دیا۔ پھر اچانک ہی چھوڑ دیا۔ اس پر دوبارہ کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اسی طرح کھانستے کھانستے مر جائے گا۔

میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اس دوران چونی لال کھانستے کھانستے نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ چارپائی پر گرا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

میں باہر نکل آیا۔ سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آنے والا ٹھٹھک کر رک گیا۔ کوئی ڈھلتی عمر کا ہندو تھا۔ میں نے اس کے کسی استفسار سے پہلے ہی کہا۔

"میں چونی لال کا بھانجا ہوں۔ ہم لوگ کل ہی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ آج ماما کی خبر لینے آیا تھا۔ لیکن......"

"بیٹے پرماتما جانے یہ اب تک زندہ کیوں ہے۔ اس کی بیٹی نے تو اسے جیتے جی مار ڈالا۔ ایک بیٹی ہی تو تھی بے چارے کی۔"

"کیا ہوا مہندر کو؟" اچانک ہی میرے منہ سے نکلا۔ میرا دل دہل گیا تھا۔

"بیٹا وہ ملیچھ ہو گئی تھی۔ تین سال ہوئے کسی ملیچھ ہی کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہرے اوم۔ ہرے اوم۔" اس نے اپنے کانوں کو چھوا اور آگے بڑھ گیا۔ شاید مندر جا رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پوری طاقت سے میرے دل پر گھونسہ مارا ہو۔ یہاں ہر لمحے مجھے جان سے جانے کا خطرہ تھا۔ کسی کو بھی میرے سکھ ہونے پر شک گزر سکتا تھا۔ خصوصاً ذیلداروں کا تو بچہ بچہ میرے خون کا پیاسا تھا۔ پھر وہ لوگ ایسا سنہری موقع

کیوں ضائع جانے دیتے۔

اگر اقبال سنگھ کی گھوڑی میرے پاس نہ ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے میں پاکستان پہنچ بھی سکتا یا نہیں۔ میں دیوانہ وار کھیتوں کے بیچوں بیچ گھوڑی بھگاتا رہا۔ راستے میں کسی نے میرا حلیہ دیکھ کر مجھ سے باز پرس نہ کی۔ میری بھوک پیاس تو جیسے مر چکی تھی۔ گرتا پڑتا شام گئے تک میں سرحد سے چار پانچ میل دور تک پہنچ چکا تھا۔ اس دوران راستے میں دو تین جگہ رک کر میں نے صرف پانی پیا اور کچھ نہیں کھایا۔

یہاں پہنچ کر میں نے پگڑی وغیرہ اتار دی اور اپنی اصلیت پر لوٹ آیا۔ رات ڈھل رہی تھی جب میں نے سرحد پار کی۔ سرحد کے پار رضاکاروں نے کیمپ قائم کر رکھا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے ستم رسیدہ سمجھ کر میری ہر ممکن دلجوئی کی۔ یہاں سے مجھے یہ بھی علم ہو گیا کہ ہمارے دیہاتوں کے لوگ کس کیمپ میں ہو سکتے ہیں۔ اقبال سنگھ کی گھوڑی سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے بادل نخواستہ یہ گھوڑی سرحدی علاقے کے ایک زمیندار کے پاس اونے پونے داموں فروخت کر دی۔

میں بڑا بددل اور مایوس ہو کر والدین اور عزیز واقارب کو ڈھونڈنے ایک کیمپ کی طرف چلا گیا۔ کیمپ کیا تھا؟ انسانی تباہی و بربادی کا منہ بولتا ثبوت۔ مجھے یہاں کچھ شناسا چہرے بھی دکھائی دیئے۔ لیکن میرے والدین ان میں شامل نہیں تھے۔ یہاں سے دوسرے کیمپ کی طرف چل دیا کیمپ کے باہر ہی ایک کونے میں مجھے ایک عورت سر جھکائے اپنی طرف پیٹھ کئے بیٹھی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی میرے خون میں جیسے یک لخت بجلی سی دوڑ گئی۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا۔

وہ مریم تھی---!

"مریم!" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں اس کے نزدیک پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔

مریم نے سر اوپر اٹھایا اور میری طرف اس طرح بے یقینی کے عالم میں دیکھا جیسے

کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔

"تم۔ تم زندہ تھے۔" اس کے منہ سے بمشکل اتنا ہی نکل پایا اور وہ لڑکھڑا گئی۔

میں نے اسے سنبھالا دیا اور پانی کا گھونٹ نزدیک ہی دھرے پانی کے گھڑے میں سے لے کر اس کے منہ میں ٹپکایا۔ مریم بیہوش تو نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی اس کے اوسان بھی بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ڈھل کر سفید ہو رہا تھا اور شکل سے برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اسے حوصلہ دے کر بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کہانی سنا رہی تھی تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے میرے کلیجے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ ہمارے نزدیک دیہاتوں میں یہ افواہ بڑے منظم طریقے سے پھیلا دی گئی تھی کہ مجھے سزائے موت ہو گئی ہے اور دوسرے دہشت پسندوں کے ساتھ پھانسی بھی لگا دی گئی ہے۔

میں جان سکتا تھا کہ ایسی افواہ پھیلانے والے کون لوگ ہو سکتے تھے۔ مریم نے بتایا کہ اس کے باپ نے ایک جگہ زبردستی اس کی نسبت طے کر دی تھی۔ اس نے جب اپنے باپ کو بتایا کہ وہ تو کبھی اسلام قبول کر چکی ہے تو چونی لال نے یہی سمجھا کہ لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

لیکن---وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کا دماغ خراب نہیں ہوا بلکہ ٹھیک ہو گیا ہے اس نے سچائی کو پا لیا تھا اور اب اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے نزدیکی دیہات کا مسلمان لڑکا جگو ان دنوں بڑا نام پیدا کر رہا تھا اور ایسے لوگوں کا چونی لال کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جب مریم کو اپنی نسبت کہیں زبردستی طے پا جانے کا علم ہوا تو اس نے جگو کو ہی اپنا بہترین سہارا سمجھا۔

اس نے ایک روز جگو کو اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنا دی۔ جگو اس کے کردار کی

عظمت سے بہت متاثر ہوا۔اس کو بھی یہی اطلاع تھی کہ میں پھانسی پا چکا ہوں وہ مریم کو سہارا دینے پر تیار ہو گیا اور ایک روز مریم اس کے ساتھ نکل گئی۔

یہ لوگ دوسرے ضلع میں جا کر رہنے لگے۔ تقسیم کے وقت جب ان کے قافلے پر حملہ ہوا تو جس کا جدھر منہ اٹھا وہ بھاگ گیا۔ مریم بھی افراتفری میں کسی اور طرف نکل گئی۔ وہ بے چاری دو روز تک بھوکی پیاسی ایک کھیت میں چھپی رہی۔ اس امید پر کہ شاید اس کا خاوند وہاں آ جائے لیکن اس کا خاوند نہ آیا۔

گرتی پڑتی وہ پاکستان پہنچ گئی اور اب یہاں کیمپوں میں اپنے خاوند کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

مجھے امید تھی کہ اب مریم مجھ سے یہی کہے گی کہ جگو چونکہ مر چکا ہے اس لئے وہ میرے ساتھ شادی کے لئے تیار ہے۔ لیکن اس نے کہا۔۔"چوہدری عورت زندگی میں ایک ہی مرتبہ شادی کرتی ہے میرا دل گواہی دیتا ہے چوہدری کہ میرا خاوند مرا نہیں۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا بھی تو باقی زندگی اس کی یاد میں گزار دوں گی۔"

مریم کی اس بات نے میرے دل میں اس کی عقیدت کئی گناہ بڑھا دی تھی۔ یہ ہندو لڑکی اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی اتنی ہی عظیم تھی۔ میں نے مریم کی اس بات سے آگے اس سے کوئی بات نہ کی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے دل سے میری محبت نہیں نکالی۔ جس طرح میں اسے بھول نہیں سکا تھا اس نے بھی مجھے بھلایا نہیں تھا۔

میں اس وفا اور عقیدت کی دیوی کے سامنے سے اٹھ کر آ گیا۔ ایک اور کیمپ سے بالآخر اپنے گھر والوں کا سراغ بھی مل گیا۔ وہ لوگ ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ میں اپنے والدین سے ملا تو جیسے پچھلے تمام زخم ہرے ہو گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

میری زندگی میں اب کوئی مقصد۔ کوئی لگن رہ ہی نہیں گئی تھی۔ ڈیڑھ دو سال میں نے اس گاؤں مین اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار دیئے۔ اس دوران مجھے اپنے پرانے ساتھی بھی آہستہ آہستہ ملنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے مجھے اپنے ڈھب پر لگا لیا۔ میری زندگی میں اب سوائے جرائم کے اور رہ ہی کیا گیا تھا۔

والدین بضد رہے کہ میں شادی کر لوں لیکن یہاں کس کو میرے دل کا حال معلوم تھا۔ میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ کوئی وجہ بھی نہ بتائی۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ میں جب کسی سے بھی شادی کروں گا اسے کبھی سکھ نہیں دے سکوں گا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو دکھی رکھوں۔۔اپنی طرح!

میں نے ایک دوسرے علاقے میں اپنی رہائش اپنے ایک دوست کے گھر میں رکھ ہوئی تھی۔ کبھی کبھی والدین سے ملنے آ جایا کرتا تھا۔ ان دنوں سمگلنگ کا کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ ہم لوگ بڑے سمگلروں کے کارندے بنے ہوئے تھے۔ مجھے کسی کے لئے کام کرنا پسند نہیں تھا۔ لیکن مجبوری تھی اس دوران میرے پاس اتنی دولت جمع ہو چکی تھی کہ میں خود اپنا گروہ بنا سکتا تھا۔

ایک روز میں نے اپنے طور پر مال سرحد کے دوسری طرف پہنچانا چاہا۔ کسی نے مخبری کر دی اور میرے ساتھی مال سمیت پکڑے گئے۔ اس حادثے نے مجھے سیخ پا کر دیا۔ آج تک کسی کو میرے خلاف شکایت کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ یہ کون مائی کا لال تھا جس نے میرا سارا مال ہی پکڑوا دیا۔

میرے شب و روز اب اسی چکر میں گزرنے لگے تھے کہ اس مخبر کو سزا دوں۔ پندرہ بیس دن میں مفرور رہا کیونکہ پولیس ہر جگہ میری تلاش میں چھاپے مار رہی تھی۔ ان پندرہ بیس دنوں میں اس نامعلوم مخبر کے خلاف میرے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ مزید بڑھتی رہی۔ بالآخر میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے علم ہو گیا کہ جس

گاؤں کی حدود میں میرا مال پکڑا گیا تھا یہ اسی گاؤں یعنی رنکیل پور کے نمبر دار ملک شریف کا کارنامہ ہے۔

اگلے روز رات کے دوسرے پہر میں پستول سمیت اس نمبر دار کے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں بہر حال ایک تربیت یافتہ چور بھی رہا تھا اور کسی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کے گھر میں داخل ہو جانا میرے لئے بچوں کے کھیل سے بھی زیادہ آسان تھا۔

نمبر دار اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسری چارپائی پر ایک عورت اور بچہ سو رہے تھے میں نے اپنا منہ سر کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں ہی دکھائی دے سکتی تھی۔ میں نے نفرت اور غصہ سے کھولتے ہوئے اس کی چارپائی کو ٹھوکر ماری تو نہ صرف وہ بلکہ اس کی بیوی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

ان لوگوں کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرے تو ہاتھ سے پستول گرتے گرتے رہ گیا۔

یہ جگو اور مریم تھے۔ ان کا بچہ اس سارے ہنگامے سے بے خبر میٹھی نیند سو رہا تھا۔

"کو کو کون ہو تم -- کیا چاہتے ہو" جگو نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس دوران مریم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ غالباً اس نے میرے ہاتھ میں پکڑے پستول پر نظر رکھی تھی۔ وہ شاید اس ارادے سے آگے آئی تھی کہ اگر میں گولی چلا دوں تو اس کے خاوند کے بجائے اسے لگے۔

"خدا کے لئے تم جو چاہتے ہو لوٹ کر لے جاؤ، لیکن میرے خاوند کو کچھ نہ کہو۔"

مریم کے لہجے میں التجا سے زیادہ دھمکی کا تاثر نمایاں تھا۔

خدا جانے میرے بائیں ہاتھ میں کیسے حرکت پیدا ہوئی اور میں نے منہ سے نقاب ہٹا دیا۔ میری شکل پر نظر پڑتے ہی دونوں چونک پڑے۔

"تم......" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"ہاں جگو! مجھے علم نہیں تھا کہ ملک شریف تم ہی ہو -- وہ جو مال تم نے پکڑوایا میرا تھا میں......" اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا اور واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

"چوہدری!" مجھے مریم کی آواز سنائی دی۔ "کم از کم آج کی رات تو ہمارے مہمان رہو۔"

میں مریم کی آواز پر رکا ضرور تھا لیکن مڑ کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ مجھ میں اب اس کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ میرے قدم تو ہرگز نہیں تھے۔ جن پر چل کر میں باہر آیا تھا۔

لمبی کہانی ہے --! اس کے بعد کیا ہوا۔ میں نے گرفتاری دے دی۔ عدالت نے مجھے دو سال قید بامشقت کا حکم دیا۔ اس قید کے دوران مریم اور جگو کئی مرتبہ میری ملاقات کو آئے میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میری اطلاع کسی کو نہ دیں۔ انہوں نے میری بات بادل نخواستہ مان لی۔

اس دوران مریم مجھے یہی سمجھاتی رہی کہ میں اس زندگی کو چھوڑ دوں اور اپنا گھر بسا لوں۔

میں نے مریم سے کہا کہ میں اس کی دو باتیں نہیں مان سکتا۔ جیل سے رہائی پر میں نے وہ زندگی تو چھوڑ دی لیکن گھر نہیں بسایا۔ میں وہ صوبہ ہی چھوڑ گیا جہاں والدین اور مریم وغیرہ رہتے تھے۔

وقت گزرتے پتہ نہیں چلتا۔ میں اپنے گھر صرف والدین کی وفات پر گیا۔ بہن بھائیوں کو میں نے کیا سکھ دیا تھا کہ مجھے یاد رکھتے۔ انہوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ میں بھی پھر ان سے نہیں ملا۔

اس طرح کوئی کسی کی یاد میں زندگی نہیں تج دیا کرتا۔ لیکن مجھے مریم سے جو بے نام سی عقیدت ہو گئی تھی اس نے پھر میرا گھر نہ بسنے دیا۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دیا۔ آج

بھی دولت مند لوگوں میں شمار ہوتا ہوں۔ یہ کہانی آپ کو کبھی نہ سناتا لیکن پچھلے مہینے مریم کا انتقال ہو گیا۔ جگو تین چار سال پہلے ہی ایک بیماری سے مر گیا تھا۔

میں اس کا افسوس کرنے بھی گیا تھا۔ تب میں نے عظمت و وفا کی اس دیوی کو شاید آٹھ دس سال بعد دیکھا تھا۔ اس کے دل میں یقیناً یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ آج جب وہ اکیلی رہ گئی ہے کوئی اسے سہارا دے۔ یہ ٹھیک ہے جگو کے تین جوان بیٹے تھے۔ مگر اس کا کوئی رشتہ دار فساد میں زندہ نہیں بچا تھا اور مریم کا تو کوئی تھا ہی نہیں۔

لیکن --- میں مریم سے مرتے دم تک دوبارہ نہ ملا۔ مبادا کہیں عقیدت کے اس رشتے پر جو میرے اور اس کے درمیان استوار تھا بال برابر میل بھی نہ آ جائے۔

مریم کی موت کے بعد میں اس کے بچوں سے ملتا ہوں۔ وہ مجھے چچا کہتے ہیں اور میری بہت عزت کرتے ہیں۔